زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
ڈوبتے ڈوبتے کشتی کو سہارا دے دوں
میں نہیں کوئی تو ساحل پہ اتر جائے گا
ایسے اڑوں کہ جال نہ آئے خدا کرے
رستے میں اسپتال نہ آئے خدا کرے
شب وعدہ کہہ گئی ہے شب غم دراز رکھنا
اسے میں بھی راز رکھوں اسے تم بھی راز رکھنا
مفلسی میں بھی سلامت رہا پندار مرا
کسی سلطان کے بگڑے ہوئے تیور کی طرح

## ......روضۃ الاقطاب ......

محترم محمد بولاق نے اول اول اس بحرِ غواص سے موتی چننے کی سعی میں سلسلہ چشتیہ کے بزرگوں کے احوال پر مشتمل گہر ریزے اس طور سمیٹے، اس میں تصوف کے نگینوں کی لڑیاں اس طرح پروئیں کہ اس شجرہ عالیہ کا آغاز اگرچہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے کیا ہے۔لیکن اس کے بعد اپنا شجرہ جو رسولؐ خدا سے شروع ہو کر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ پر منتج ہے، بھی رقم کیا ہے۔انہوں نے یہ تصوف پارہ فارسی زبان میں تالیف کیا، ا۔اس کی اشاعت اول اور دوم فارسی میں تھی، اشاعت اول کے ناشر، لالہ چرنجی لال ہندوستان تھے جبکہ اشاعت دوئم کے ناشر جگن ناتھ مطبع ''محبِّ ہند'' فیض بازار دہلی ہندوستان تھے۔اشاعت سوم اردو میں آخری بار 1309 ہجری دہلی میں طبع ہوئی اور آج ہندوستان و پاکستان میں یہ نا پید ہے۔اس کی اشاعت کی بابت جگن ناتھ یوں رقم طراز ہیں۔

''قبل ازیں یہ کتاب دو مرتبہ فارسی زبان میں طباعت ہوئی۔لالہ چرنجی لال مرحوم (مالک چھاپہ خانہ) نے بڑی تحقیق اور تفتیش سے اس کتاب کو حاصلکر کے خصوصی اہتمام سے چھپوایا۔لالہ چرنجی لال (مرحوم) بزرگان دین اور اولیائے کرام سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور انہیں ہمیشہ اولیائے کرام کی کتب دیکھنے، چھاپنے چھپوانے کا شوق رہا ہے۔لالہ چرنجی لال (مرحوم) کے بعد دوسری بار اس کمترین (جگن ناتھ) نے اس کتاب کو دوسری مرتبہ طباعت کروایا،لیکن اس اشاعت کے بعد جلد ہی اندازہ ہوا کہ فارسی زبان کے قارئین مسلسل کم ہو رہے ہیں اور شائقین زبانِ اردو کی تعداد بڑھ رہی ہے۔چنانچہ راقم مجبور ہوا کہ اس کتاب کو اردو میں ترجمہ کروا کے چھپوائے۔اس طرح اس دُرِ نایاب کا بامحارہ اردو ترجمہ کروا کر اس پر نظر ثانی کی گئی اور پھر تیسری بار یہ کتاب اردو زبان میں شائع ہوئی تاکہ ہر خاص و عام اور اردو دان طبقہ بھی اس سے مستفید ہو سکے۔''

......ایم۔زیڈ۔کنول

اشاعت:۲۰۱۵ء، قیمت:۵۰۰ روپے، دستیابی: تہذیب انٹرنیشنل پبلی کیشنز، لاہور۔

## ...... وقت کی تلاش ......

مسعود مفتی پاکستان کی افسر شاہی کی نیک نامی کو چندِ آفتاب اور چندِ ماہتاب کرنے والی ایسی شخصیت کا نام ہے جن کا ذکر آتے ہی محسوسات میں تازگی آ جاتی ہے۔آپ نے اردو ادب میں بے جا زباں دانی کے جوہر دکھلانے کے بجائے اپنے گرد و پیش کو کچھ اس انداز میں پیش کیا ہے کہ وہ ادبِ عالیہ ہو کر بھی ہمیں اپنی تاریخ کے سنہرے اوراق نظر آتے ہیں۔''وقت کی تلاش''مفتی صاحب کی چودہ منتخب کہانیوں کا افسانوی مجموعہ ہے جو اردو ادب کے ہر سنجیدہ قاری اور ناقد کو اس لیے اپنی جانب متوجہ کر رہا ہے کہ اُس کا مرکز پاکستان کا عام آدمی اور اُس کے مسائل ہیں جو یقیناً پڑھنے والے کو وہ سب کچھ بتاتے ہیں جو ہم پر گزر گئی یا گزر رہی ہے یا خدانا خواستہ گزرنے والی ہے۔کام مشکل مگر مسعود مفتی صاحب کے نباض قلم نے نہایت سادگی اور پُرکاری سے اسے انجام دیا ہے۔ ...... عطیہ سکندر علی

اشاعت:۲۰۱۵ء، قیمت:۲۸۰ روپے، دستیابی: دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد۔

## ...... عالمی اردو ادب ......

اردو ادب میں کچھ لوگ ماہ و سال سے بے پروا علم و ادب کی خدمت میں کچھ اس طرح مصروف ہیں کہ لفظ دیوانگی بھی اُن کی خدمات کو درست طور پر آشکار نہیں کرتی۔عالمی اردو ادب کے مدیر جناب نند کشور وکرم اپنی دُھن میں مگن اردو ادب کے دامن کو اس قدر وسعت اور ہمہ رنگی سے سجا رہے ہیں کہ دیکھ کر حیرت بھی ہوتی ہے اور رشک بھی آتا ہے۔عالمی اردو ادب کا تازہ شمارہ مقبولِ عام ادب نمبر ہے جس میں وکرم صاحب نے اُن تمام نامور اور گمنام لوگوں کی کھوج لگا کر جو اپنے وقت میں شہرت و ناموری کے ساتھ فروخت کے حوالے سے بھی بلند مقام رکھتے تھے۔خواہش کے باوجود ہم یہاں اُن بلند قامت اہلِ قلم کے اسمائے گرامی درج نہیں کر رہے کہ آپ کا اشتیاق باقی رہے اور عالمی اردو ادب کی جستجو کے لیے زیادہ لگن اور تڑپ آپ کے دل میں موجزن ہو جائے۔ ......انوار شریف

اشاعت:۲۰۱۵ء، قیمت مجلد:۴۰۰ روپے، دستیابی: F-14/21-D کرشن نگر، دہلی۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

# چہارسُو

جلد۲۵،شمارہ:مارچ،اپریل۲۰۱۶ء



رابطہ:537/D-1 'گلی نمبر18،ویسٹریج-III' راولپنڈی،46000،پاکستان۔

فون:5462495,5490181-51-(92+)

فیکس:5550886-(92+)

موبائل:0558618-336-(92+)

ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر:فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

# متاعِ چہارسو



## قرطاسِ اعزاز



## افسانے



## انشائیہ



## اُفق کے اُس پار



## زہریلا انساں



## خاکہ



## آئینہ فن



## نشانِ راہ



## ایک صدی کا قصہ



## یومِ پاکستان



## رس رابطے



-☆-

# قرطاسِ اعزاز
# منوّر راناؔ
# کے نام

شرم آتی ہے مزدوری بتاتے ہوئے ہم کو
اتنے میں تو بچوں کا غبارہ نہیں ملتا

میں اک فقیر کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ہوں
کسی سے بھی مری قیمت ادا نہیں ہوتی

ہمارے ساتھ چل کر دیکھ لیں یہ بھی چمن والے
یہاں اب کوئلہ چنتے ہیں پھولوں سے بدن والے

مرے گھر کے درودیوار کی حالت نہیں دیکھی
برستے بادلو! تم نے بھی میری چھت نہیں دیکھی

ہمیں بھی پیٹ کی خاطر خزانہ ڈھونڈ لینا ہے
اسی پھینکے ہوئے کھانے سے دانہ ڈھونڈ لینا ہے

اس خرابے کو بھی گلزار بنانا تھا اسے
ورنہ آدم کو زمیں پر نہیں پھینکا جاتا

مری تحریر بھی میری طرح منہ پھٹ ہے اے راناؔ
خدا کا شکر ہے شمشیر کو خامہ نہیں لکھا

بڑے بڑوں کو بگاڑا ہے ہم نے اے راناؔ
ہمارے لہجے میں استاد شعر کہنے لگے

اب بھی چلتی ہے جب آندھی کبھی غم کی راناؔ
ماں کی ممتا مجھے آنچل میں چھپا لیتی ہے

طوائف کی طرح اپنی غلط کاری کے چہرے پر
حکومت مندر و مسجد کا پردہ ڈال دیتی ہے

سیاسی وار بھی تلوار سے کچھ کم نہیں ہوتا
کبھی کشمیر جلتا ہے ، کبھی بنگال کٹتا ہے

گلے ملنے کو آپس میں دعائیں روز آتی ہیں
ابھی مسجد کے دروازے پہ مائیں روز آتی ہیں

تمہارا کام ہے شہروں کو صحرا میں بدل دینا
ہمیں بنجر زمینوں کو حسیں کرنے کی عادت ہے

ان گھروں میں جہاں مٹی کے گھڑے رہتے ہیں
قد میں چھوٹے ہوں مگر لوگ بڑے رہتے ہیں

شہرت ملی تو اس نے بھی لہجہ بدل دیا
دولت نے کتنے لوگوں کا شجرہ بدل دیا

امیرِ شہر کی ہمدردیوں سے بچ کے رہو
یہ سر سے بوجھ نہیں سر اتار لیتا ہے

یہ سنسد ہے یہاں آداب تھوڑے مختلف ہوں گے
یہاں جمہوریت جھوٹے کو سچا مان لیتی ہے

ایک ہی آگ میں تا عمر جلے ہم دونوں
تم کو یوسف نہ ملا ہم کو زلیخا نہ ملی

امیرِ شہر کو تلوار کرنے والا ہوں
میں جی حضوری سے انکار کرنے والا ہوں

مفلسی نے سارے آنگن میں اندھیرا کر دیا
بھائی خالی ہاتھ لوٹے اور بہنیں بجھ گئیں

جو دھوپ دھوپ میں گرم سفر نہیں رہتا
تو میرے بچوں کی قسمت میں گھر نہیں رہتا

اے خدا پھول سے بچوں کی حفاظت کرنا
مفلسی چاہ رہی ہے میرے گھر میں رہنا

لپٹ جاتا ہوں ماں سے اور موسی مسکراتی ہے
میں اردو میں غزل کہتا ہوں ہندی مسکراتی ہے

دولت سے محبت تو نہیں تھی مجھے لیکن
بچوں نے کھلونوں کی طرف دیکھ لیا تھا

معلوم نہیں کیسی ضرورت نکل آئی
سر کھولے ہوئے گھر سے شرافت نکل آئی

خداکے واسطے اۓ بے ضمیری گاؤں مت آنا
یہاں بھی لوگ مرتے ہیں مگر کردار زندہ ہے

# ''شجرۂ منور''

محمد انعام الحق

(اسلام آباد)

نام: سید منور علی

قلمی نام: منوررانا

والد: سید انور علی رانا

والدہ: عائشہ خاتون

زوجہ: رائنا خاتون

اولاد: ایک بیٹا پانچ بیٹیاں

پیدائش: ۲۶؍نومبر۱۹۵۲ء (رائے بریلی)

پیشہ: ادیب اور شاعر

تعلیم: گریجویٹ

قومیت: بھارتی

اصناف: اردو/ ہندی، غزل، نثر۔

مضامین: (سماجی) تعلقات خصوصاً ماں کے حوالے سے رومان، مزاحمت۔

نمایاں کام: ماں اور مہاجر نامہ

رابطہ:

O1,FI-DHINGRA APT. LAL KUAN MAIN ROAD
LUCKNOW 226001(UP)

موبائل: 0091-9839050450

تصانیف:

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ غزل گاؤں | ہندی شاعری | ۱۹۸۱ء |
| ۲۔ پیپل چھاؤں | ہندی شاعری | ۱۹۸۴ء |
| ۳۔ مورپاؤں | ہندی شاعری | ۱۹۸۷ء |
| ۴۔ سب اُس کے لیے | ہندی شاعری | ۱۹۸۹ء |
| ۵۔ نیم کے پھول | ہندی شاعری | ۱۹۹۱ء |
| ۶۔ بدن سرائی | ہندی شاعری | ۱۹۹۶ء |
| ۷۔ کہوظلِ الٰہی سے | اردوشاعری | ۲۰۰۰ء |
| ۸۔ بغیر نقشے کا مکان | اردونثر | ۲۰۰۰ء |
| ۹۔ گھر اکیلا ہوگیا | اردو/ ہندی شاعری | ۲۰۰۰ء |
| ۱۰۔ ماں | اردو/ ہندی شاعری | ۲۰۰۵ء |
| ۱۱۔ سفید جنگلی کبوتر | اردونثر | ۲۰۰۵ء |
| ۱۲۔ پھر کبیر | ہندی شاعری | ۲۰۰۷ء |
| ۱۳۔ چہرے یاد رہتے ہیں | اردونثر | ۲۰۰۸ء |
| ۱۴۔ جنگلی پھول | اردوشاعری | ۲۰۰۸ء |
| ۱۵۔ منوررانا کی سوغزلیں | اردوشاعری | ۲۰۰۸ء |
| ۱۶۔ نئے موسم کے پھول | اردو/ ہندی شاعری | ۲۰۰۹ء |
| ۱۷۔ مہاجرنامہ | اردو/ ہندی شاعری | ۲۰۱۰ء |
| ۱۸۔ کترن میرے خوابوں کی | اردو/ ہندی شاعری | ۲۰۱۰ء |
| ۱۹۔ تین شہروں کا چوتھا آدمی | اردونثر | ۲۰۱۰ |
| ۲۰۔ شادابہ | ہندی شاعری | ۲۰۱۲ء |
| ۲۱۔ سخن سرائی | ہندی شاعری | ۲۰۱۲ء |

انعامات:

| | |
|---|---|
| ۱۔ رئیس امروہوی ایوارڈ (رائے بریلی) | ۱۹۹۳ء |
| ۲۔ بھارتی پریشد پریاگ ایوارڈ (الٰہ آباد) | ۱۹۹۴ء |
| ۳۔ دل کشا ایوارڈ | ۱۹۹۵ء |
| ۴۔ ہمایوں کبیر ایوارڈ (کولکتہ) | ۱۹۹۸ء |
| ۵۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ایوارڈ (اردو اکیڈمی) | ۲۰۰۱ء |
| ۶۔ سرسوتی سماج ایوارڈ | ۲۰۰۴ء |
| ۷۔ میرتقی میر ایوارڈ | ۲۰۰۵ء |
| ۸۔ شہود عالم آفاقی ایوارڈ (کولکتہ) | ۲۰۰۵ء |
| ۹۔ غالب ایوارڈ (اودے پور) | ۲۰۰۵ء |
| ۱۰۔ بزمِ سخن ایوارڈ (بھوسوال) | ۲۰۰۵ء |
| ۱۱۔ الٰہ آباد پریس کلب ایوارڈ (پریاگ) | ۲۰۰۵ء |
| ۱۲۔ کویتا کا کبیر سماں واُپادھی (اندور) | ۲۰۰۶ء |
| ۱۳۔ امیر خسرو ایوارڈ (ایٹہ) | ۲۰۰۶ء |
| ۱۴۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ایوارڈ (نئی دہلی) | ۲۰۰۵ء |
| ۱۵۔ سلیم جعفری ایوارڈ | ۱۹۹۷ء |
| ۱۶۔ حضرت الماس شاہ ایوارڈ | ۱۹۹۹ء |
| ۱۷۔ ایکتا ایوارڈ (کانپور وکاس منچ) | ۲۰۰۵ء |
| ۱۸۔ ادب ایوارڈ (کانپور پستک میلہ) | ۲۰۰۴ء |
| ۱۹۔ میر ایوارڈ | ۲۰۰۷ء |
| ۲۰۔ مولانا ابوالحسن ندوی ایوارڈ (رائے بریلی) | ۲۰۰۸ء |
| ۲۱۔ اُستاد بسم اللہ خان ایوارڈ (وارانسی) | ۲۰۰۸ء |
| ۲۲۔ کبیر ایوارڈ (لکھنؤ) | ۲۰۰۹ء |

اعزازات:

۱۔ ستکار سماروہ، گندیا سے اعزاز یافتہ
۲۔ الہ آباد یونیورسٹی سے اعزاز یافتہ
۳۔ پرتاپ گڑھ سے اعزاز یافتہ
۴۔ اُجین سے اعزاز یافتہ
۵۔ بھیونڈی سے اعزاز یافتہ
۶۔ لدّاخ سندھو درشن سے اعزاز یافتہ
۷۔ نئی دہلی سے اعزاز یافتہ
۸۔ کنکنارہ، رشرا اور بلگاسیہ، کوکلتہ سے اعزاز یافتہ
۹۔ ماہا کمبھ میلہ سے اعزاز یافتہ
۱۰۔ برندابن سے اعزاز یافتہ
۱۱۔ گوالیار سے اعزاز یافتہ
۱۲۔ اپنی بنگالی کتاب میں اعزازی کلمات برائے سہارا شری سبراتو رائے
۱۳۔ اعزازی رکن برائے براہمن سنسد، لکھنو

تحقیقی کام:

۱۔ تین شہروں کا چوتھا آدمی
مژگان پبلی کیشنز کی طرف سے مرتبہ کام
۲۔ منور رانا فن اور شخصیت
(ڈاکٹر سروشہ قاضی)
۳۔ قامت (پروفیسر عبدالمنان طرزی)
منور رانا کے فن اور زندگی پر منظوم تحریر
۴۔ کولکتہ، ممبئی، رانچی اور مظفر پور کے نامزد طلباء آپ کے فن اور زندگی پر بطور سکالر تحقیق کر رہے ہیں۔

مآخذات:

rana_munawwar@rediffmail.com
rana_munawwar@yahoo.com
www.urdupoetry.com
www.orkut.com
www.facebook.com
www.utube.com
www.urdumarkaz.com

غیر معمولی دستاویز (ETV)
منور رانا کویتا کوش پر (ہندی شاعری)
منور رانا کی شاعری (سمعی اور بصری)
منور رانا کے اشعار اور مشاعروں کا انتخاب

☆

## ''انقلاب کی چاپ''

**منور** رانا کو ہندو پاک اور عالمی مشاعروں کا کامیاب شاعر قرار دیا جاتا ہے اور مشاعرے میں وہ غزل کامیاب ہوتی ہے جس کے دوسرے مصرعے کو مشاعرے کے سامعین اٹھائیں۔ اس سے یہ تاثر پیدا کیا گیا کہ مشاعرے کا شاعر سامعین کی سطح پر اتر کر شعر کہتا ہے جو رسالے یا کتاب میں چھپی ہوئی سامنے آئے تو اپنا تاثر قائم نہیں رکھ سکتی۔ منور رانا کی خوبی یہ نظر آتی ہے کہ وہ مشاعرے کے لئے شعر نہیں کہتے، بلکہ ان کے پیش نظر اپنے داخل کا اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ غزل کے ہر شعر کا پہلا مصرعہ بھی اپنے اظہار کے لئے کہتے ہیں اور اس کی مناسبت سے دوسرا مصرعہ بھی اس طرح تخلیق کرتے ہیں کہ سامع یا قاری ان کے نقوش پا پر ارتجالاً قدم نہیں رکھ سکتا۔ مجھے کچھ یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ قافیہ اور ردیف کی غلامی کرنے والے مشاعرہ باز شاعروں کی طرح وہ مصرع ثانی سے مصرع اولا کی طرف سفر نہیں کرتے بلکہ شاید ان پر پورا شعر اترتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلا مصرع پڑھنے کے بعد وہ دوسرے مصرعے کو اس طرح کروٹ دیتے ہیں کہ پورے شعر کی تازگی اور توانائی اور تجدد کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ ان کی غزل چونکہ جدید زمانے کی غزل ہے اس لئے اس میں پرانے رموز وعلائم نہیں آتے لیکن عصر حاضر کے مظاہر و مسائل از خود غزل کی بنت میں شامل ہوتے چلے گئے ہیں۔ وہ روایتی معنوں میں مزاحمتی شاعر نہیں۔ ان کی شاعری میں انقلاب کی چاپ بھی سنائی نہیں دیتی لیکن وہ ذہنی اضطراب نمایاں ہے جس سے برصغیر کا پورا معاشرہ دوچار ہے اور سیاست کے چرکے برداشت کر رہا ہے۔ جگ بیتی کی یہ حکایت درد افشاں منور رانا نے خامہ خوں چکاں سے لکھی ہے اور اس طرح بقول نوشاد مومن ''بیداری کا چراغ روشن کیا ہے۔''

**ڈاکٹر انور سدید** (لاہور)

# بریلی سے کلکتے تک

منور رانا

رائے بریلی میں جب ہم رہتے تھے تو ایک ہی مذہب سے واقفیت تھی، اور وہ مذہب تھا انسانیت اور رواداری، اس سے آگے سوچنے کی نہ تو عمر ہی تھی، نہ مزاج تھا اور نہ ہی زمانہ تھا، محلے کے بڑے بوڑھے سب کے لئے بزرگ تھے، محترم تھے، اور اپنے تھے، چہار سمت رشتوں کا جال بچھا رہتا تھا اور کوئی بھی اس جال کو اپنی کسی بھی حرکت سے کُترنا نہیں چاہتا تھا، تقریباً تمام میرے ہم عمر لڑکے بزرگوں کی دہشت گردی کے شکار رہتے تھے، سنیما کے پوسٹر پر بنی ہوئی ہیروئن کو دیکھنے سے پہلے ہی کسی طرف سے کوئی تھپڑ پڑ چکا ہوتا تھا۔ گھر سے نکل کر بے سبب کہیں جانے کے لئے نکلتے اور بزرگوں کا چھاپہ پڑ جاتا تھا۔ گرمی کے دنوں میں خاص طور سے لُو دھوپ میں برابر گھر سے فرار ہوتے اور باہر پکڑے جاتے دوطرفہ کارروائی ہوتی خوب پٹائی ہوتی، لیکن محبتوں کا یہ عالم تھا کہ کسی برقع پوش یا کوئی بھی پردے دار خاتون خواہ وہ کسی مذہب کی ہو کبھی پانی بھرنے کے لئے کنوئیں پر نہیں آتی تھی، ہم لوگ بالٹیاں لے کر کنوئیں پر یا جب سرکاری نل لگ گئے تو نل کے پاس جاتے تھے وہاں موجود لوگ ہم لوگوں کی بالٹی ہمارے دروازے پہ رکھ جاتے تھے، سائیکل میں کیریئر صرف اس لئے ہوتا تھا کہ ایک آدھ آدمی کو پیچھے بٹھا لینے میں آسانی ہوگی، ان دنوں غریبی تھی لیکن آپسی بھائی چارے کی وجہ سے کبھی اس کا احساس نہیں ہوتا تھا کہ محلے کے تمام لوگ ایک دوسرے کی ضرورتوں اور پریشانیوں پر نگاہ رکھتے تھے، دامے درمے سخنے، قدمے کا محاورہ اسی زمانے تک کے لئے تھا، چھپر اٹھانے کے لئے جس طرح پورا محلّہ دوڑ پڑتا تھا، اس طرح تو لوگ اب میت کو کاندھا دینے کے لئے نہیں لپکتے۔ مسجدوں میں افطاری گھر کے لوگ ہی پہنچا کر آتے تھے، نوکروں یا دوسرے لوگوں ے مسجد میں افطاری بھجوانے کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا، بیسن کی روٹی اور چٹنی بھی اگر کسی گھر میں بنتی تھی تو وہ بھی مسجد کی افطاری کا حصہ بنتی تھی، پاس پڑوس میں افطاری بھجوانے کا اتنا چلن تھا کہ کبھی کسی دسترخوان کا دامن چھوٹا نہیں پڑتا تھا۔ شاید یہ سب اسلئے تھا کہ ہمارے گھروں میں ریفریجریٹر نہیں تھے، ہم ایک دوسرے کی ضرورتوں کا خیال کرتے تھے۔ خدا کا ڈر دلوں میں اتنا تھا کہ رمضان کے دنوں میں علاقے کے گدی دودھ میں پانی نہیں ملاتے تھے، دودھ سے زیادہ ان گدیوں اور گھوسیوں کے دل صاف شفاف ہوتے تھے، دودھ بچا کر نہیں رکھتے تھے۔ آس پاس کے گھروں میں بھجوا دیتے تھے، میں تقریباً دس برس کا ہو چکا تھا لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ وشوناتھ چاچا مٹھائی والے ہندو ہیں، رام چرن چاچا اور سلونی چاچا لوگ بھی مسلمان نہیں ہیں۔ میرے گھر کے سامنے جو بڑے ابّا ہیں ان سے ہم لوگوں کی کوئی رشتے داری نہیں ہے، وہ قصاب خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ہمارے برابر والے گھر میں رحمت بڑے ابّا سبزی فروش تھے، لیکن وہ ہم لوگوں کے لئے صرف بڑے ابّا تھے، شبراتی چچا دودھ بیچتے تھے مگر وہ صرف چچا تھے، منیر چچا کا ہیئر کٹنگ سیلون تھا لیکن وہ بھی میرے اور تمام بچوں کے لئے چچا تھے۔ رزاق چچا بظاہر بڑھئی تھے، لیکن وہ بھی چچا کا درجہ رکھتے تھے، لالہ پان والے رہے ہوں یا چنّے لالہ وکیل سب کے سب ہم لوگوں کو اچھا اور لائق بنانے میں سرگرداں رہتے تھے۔ یہ جس منور رانا کو آپ دیکھ رہے ہیں، اس کی تربیت کسی دن اسکول میں نہیں ہوئی ہے، اس کی تعلیم و تربیت میں ان لوگوں کا ہاتھ رہا ہے جو معمولی لوگ تھے لیکن شخصیتوں کے چھپر یہی معمولی لوگ اٹھاتے ہیں، جس کے نیچے قیام کرنے والے ہی آئندہ حکومت اور دنیا کی ہر آسائش کے دعوے دار ہوتے ہیں۔

ہم لوگ مسجد میں بھی جاتے تھے، مجلس سننے بھی جاتے تھے، ہندو میں بھی اگر مٹھائی وغیرہ کا سلسلہ ہوتا تھا تو وہاں بھی حصے دار رہتے تھے، عید بھی مناتے تھے، رام لیلا بھی مناتے تھے، دیوالی میں تو باقاعدہ مٹی کے چھوٹے چھوٹے دیئے جو بجھ جاتے تھے اٹھا لاتے تھے اور پھر ان کو مٹی میں دبا کر کھیلتے تھے۔ محلے میں کسی کے یہاں بچے کی پیدائش ہوتی تھی تو مجھے اذان دینے کے لئے بلوایا جاتا تھا، میں پاکٹ سائز مولوی تھا۔ ان لوگوں کی استطاعت ڈیمائی سائز مولوی کے ناز اٹھانے کی نہیں ہوتی تھی، کیونکہ بڑے سائز کا مولوی واپسی میں مرغے پہ بیٹھ کر گھر جانا چاہتا تھا۔ اس کے لئے کبھی تو نومولود کے گھر والے تیار نہیں ہوتے تھے اور کبھی کبھی تو مرغا بذاتِ خود انکار کر دیتا تھا۔ ہم لوگ چھوٹے سائز والے مولوی تھے ایک آدھ انڈے سے بھی کام چلا دیتے تھے۔ مجلسوں میں اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ تو گنوار سے گنوار آدمی بھی سیکھ جاتا ہے۔ رام لیلا میدان میں جہاں راون پھونکا جاتا تھا، وہاں تو بہت مزہ آتا تھا، لیکن اب تو حالات بدل گئے ہیں اب تو اگر ایک بھی مسلمان رام لیلا یا دیوالی کے میلے میں دکھائی پڑ جائے تو پورے ہندوستان کو ریڈ الرٹ کرنا پڑتا ہے، اور ایک معمولی آدمی کی فرضی کہانی کو پھیلا کر کروڑوں روپیہ پولیس اور انتظامیہ کے لوگ کھا جاتے ہیں۔

رائے بریلی بنیادی طور پر متوسط طبقے کا شہر تھا، زیادہ ترقی نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ رائے بریلی کے چہار طرف اور بہت کم فاصلے پر لکھنؤ، کانپور، الہ آباد، سلطانپور، فیض آباد اور فتح پور آباد تھے، لہٰذا ذرا سے بھی کھاتے پیتے لوگ شادی بیاہ، تہوار اور گھومنے پھرنے کے لئے لکھنؤ، کانپور چلے جاتے تھے، چونکہ ان شہروں میں تقریباً سبھی کی رشتے داریاں تھیں۔ لہٰذا ایک پنتھ دوکاج کی مانند رشتے داروں سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی اور خریداری وغیرہ بھی مکمل ہو جاتی تھی، پرانا رائے بریلی ابھی تک نئے رائے بریلی سے تقریباً بالکل ہی الگ ہے۔ ہم لوگ اپنے بچپن میں حضرت مولانا علی میاں کے گھر جاتے تھے، تکیئے کا ماحول شہر کے دوسرے علاقوں سے بہت مختلف تھا، دینداری تہذیب اور نماز روزوں کا وہاں ہمیشہ

بہتر اہتمام رہتا تھا۔ وہاں کی مسجد میں نماز پڑھنے اور سامنے سے گزرتی ہوئی سئی ندی کے کنارے بیٹھ کر وضو کرنے کا مزہ ہی الگ ہے، حضرت مولانا کا احترام رائے بریلی کے دوسرے مذاہب کے لوگ بھی بے پناہ کرتے تھے۔ میری شادی ۱۴/ اپریل ۱۹۷۲ء میں ہوئی تھی، شادی کے تیسرے یا چوتھے دن اہلیہ کو لے کر میں لکھنؤ فلم دیکھنے گیا تھا، فلم بابی انہیں دنوں آئی تھی، آخری شو دیکھ کر رات میں ہم لوگ لوٹ رہے تھے، گھر تک رکشہ نہیں آپاتا تھا کیونکہ شہر میں سیوریج لائن پڑ رہی تھی، تقریباً سارے شہر کی سڑکوں پر ہاتھی برابر کی کھدائی ہوئی تھی، ٹاؤن ہال کے پاس رکشہ چھوڑ کر ہم لوگ پیدل ہی گھر کی طرف چل دیئے، راستے میں کئی قدیم مزارات بھی ہیں اور اس کھدائی میں بھی بہت سی قبروں کے نشانات نکلے تھے صبح ہم سو کر اٹھے تو سارے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا، معلوم ہوا کہ اہلیہ پر کوئی آسیبی اثر ہو گیا ہے۔ ان کے پورے جسم پر پت اچھل آئی تھی، وہ مردانہ آواز میں باتیں کرنے لگتی تھیں، پھر اچانک چیخنے لگتیں کہ ہٹاؤ یہاں سے گوشت کی بدبو آ رہی ہے، پھر تھوڑی دیر کے لئے بے ہوش ہو جاتیں۔ پورے گھر میں کہرام مچ گیا، محلے کے لوگ اور خاندان والے سبھی پریشان تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ابو یا ہم لوگ ان سب چیزوں پر زیادہ یقین نہیں کرتے تھے، میری خالہ جان جو اس طرح کے معاملات کی اکسپرٹ سمجھی جاتی تھیں، وہ میری اہلیہ کی کیفیت بدلتے ہی ان سے سوالات شروع کر دیتی تھیں۔ خالہ جان نے بظاہر میری اہلیہ سے پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے اہلیہ نے مردانہ آواز میں کہا میرا نام محمد ایوب ہے، پھر خالہ جان نے دوسرا سوال کیا کہ تم اس گھر میں کیسے چلے آئے، پھر مردانہ آواز آئی یہ لڑکی اندھیرے میں چل رہی تھی کئی بار گرنے کی حالت میں آ گئی تو میں نے اسے سہارا دیا، میری خالہ جان نے پھر سوال داغا کہ مدد کی تھی تو گھر تک چلے آئے۔ تم کو معلوم ہے یہ گھر کیسے کیسے بزرگوں سے آباد رہا ہے، اور تمہیں معلوم ہے یہ لڑکی سید ابوالقاسمؒ کی پڑپوتی ہے، تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ تم اس گھر کے لوگوں کے لئے مصیبت بنے، تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اہلیہ پر پھر غشی جیسی طاری ہو جاتی، دو ایک جھاڑ پھونک والے بلائے گئے، لیکن شاید یہ بڑا کیس تھا، لوکل مولوی فیل ہوئے جا رہے تھے، ابو مجھے لے کر تکیہ گئے، اتفاق سے حضرت مولانا شہر میں ہی تھے، ابو نے انہیں تفصیل سے پریشانی بتائی میں تو مستقل روئے جا رہا تھا، حالانکہ اہلیہ آج بھی یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہیں کہ میں ان کے لئے پریشانی کے عالم میں رو رہا تھا۔ مولانا نے میری طرف بڑی شفقت سے دیکھا، خفیف سا مسکرائے پھر فرمایا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے منور میاں! میرے یہاں اس کے بھی ڈاکٹر ہیں، انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا، ابو تو وہیں بیٹھے رہے میں بھاگ کر گھر آیا اور ایک رکشے پر امی میری اہلیہ کو پکڑ کو بیٹھیں۔ میں دوسرے رکشے میں پیچھے پیچھے چل رہا تھا، ان دنوں راستے میں پڑنے والے ایک محلے لوہانی پور کے پاس پلیا ٹوٹی ہوئی تھی، لہٰذا سواریوں کو اترنا پڑتا تھا، میری اہلیہ کھڑی ہونے کی حالت میں بھی نہیں تھیں، امی نے حکم دیا کہ اسے گود میں اٹھا کر پلیا کے اس پار چلو، پلیا پار کرنے کے بعد اہلیہ کو پھر امی کی نگہداشت میں دے دیا۔ مولانا کے گھر کے پاس پہنچتے ہی مولانا اور میرے ابو بھی حجرے سے باہر آ گئے، اہلیہ اور امی مولانا کے گھر کے اندر چلی گئیں، عصر کی نماز کے بعد حضرت مولانا نے مولوی نثار میاں کو بلایا جوان کے محرر تھے، اور برابر مولانا کے ساتھ رہتے تھے، نثار میاں بہار میں سیوان ضلع کے رہنے والے تھے، مولانا نے انہیں کچھ باتیں سمجھائیں پھر مجھے ان کے ساتھ ہی اندرونِ خانہ بھیج دیا۔ ہم لوگ ایک کمرے میں بیٹھ گئے، میری اہلیہ کو کئی عورتیں اٹھا کر لائیں، مولانا اور عورتوں کے درمیان ایک بہت دبیز پردہ پڑا ہوا تھا، مولانا نے کچھ پڑھنا شروع کیا اور مجھے ہدایت دی کہ اپنی اہلیہ کا داہنا ہاتھ آپ مضبوطی سے پکڑ لیں اور کسی بھی حالت میں چھوڑیئے گا نہیں، میں نے ایک ہاتھ سے اہلیہ کا داہنا ہاتھ بہت مضبوطی سے پکڑ لیا میرے دوسرے ہاتھ کو مولانا نے اپنے ہاتھ میں لے کر کچھ پڑھنا شروع کیا، اہلیہ غصے اور جوش میں اپنا ہاتھ چھڑانے کے لئے پوری طاقت صرف کر رہی تھیں، لیکن میں بھی ازدواجی زندگی کا جوا ہارنا نہیں چاہتا تھا، ایک آدھ بار تو اہلیہ نے مجھے ایک طرح سے پٹخ ہی دیا لیکن میں نے ہاتھ نہیں چھوڑا، رفتہ رفتہ اہلیہ پرسکون ہوتی چلی جا رہی تھیں، پھر وہ کچھ دیر کے لئے بے ہوش ہو گئیں، نثار میاں نے اندر سے ایک بوتل میں پانی اور تھوڑی سی شکر منگائی اور دونوں چیزیں پھونک کر مجھے دے دیں، ساتھ میں یہ بھی کہا کہ اس شکر کو زیادہ شکر میں ملا لیجئے گا۔ پانی کو بھی زیادہ مقدار پانی میں ملا کر ایک ہفتے تک روز صبح وشام کو پلایئے گا۔ ایک تعویذ بھی دی اور کہا کہ یہ تعویذ ان کے گلے سے اترنے نہیں پائے میں نے نثار میاں سے کہا کہ حضرت جو بھی بلا ہے اسے جلا دیجئے، وہ مسکرانے لگے پھر بولے کہ یہ ایک ہوا تھی جس کی چپیٹ میں دلہن آ گئی تھیں، اب انشاء اللہ کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ پھر انہوں نے اس بات کو مجھے یوں بھی سمجھایا کہ اگر آپ کسی سڑک سے گزر رہے ہیں اور کہیں سے ایک کنکر آ کر آپ کو لگ جائے تو آپ اپنی چوٹ دیکھئے گا اور ضرورت سمجھئے گا تو اس کا معقول علاج کیجئے گا، لیکن یہی حرکت اگر برابر آپ کے ساتھ ہوتی ہے تب آپ تھانہ پولیس اور مقدمے کے چکر میں پڑتے ہیں۔ آپ جایئے انشاء اللہ دلہن بالکل ٹھیک رہیں گی۔ تقریباً ۴۲ برس ہو گئے ماشاء اللہ پھر کبھی ان کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ قابل غور بات یہ ہے کہ واقعے کے بعد مولوی نثار میاں سے ابو کی اور میری بھی اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں، لیکن انہوں نے ہم لوگوں کے گھر میں چائے تک نہیں پی، کہتے تھے علم کا اثر چلا جاتا ہے، ابھی تین برس پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ انشا اللہ ساری زندگی ایک ٹوٹی ہوئی سائیکل پر چلنے والے مولوی نثار میاں نے سیکڑوں پریشان حالوں کی مدد کر کے ان کی پریشانیاں دور کیں، اور خود ساری زندگی فقیری میں گزار دی۔ ان کے صاحبزادوں میں جو چھوٹے والے ہیں اللہ نے ان کی دعاؤں میں بھی بہت تاثیر دی ہے۔

ہم ایسے ایسے فقیروں کے ساتھ بیٹھے ہیں
جو خاک چھو کے اسے کیمیا بناتے ہیں

جب تک دادی دادا اور مشرف چچا پاکستان نہیں گئے تھے تو مجھے گھر پر ہی پڑھایا جاتا تھا، دینی کتابیں مشرف چچا پڑھاتے تھے، باقی اردو اور ہندی دادا

پڑھاتے تھے،لیکن جب وہ لوگ پاکستان چلے گئے تو ہمارے بڑے ابا سید حکیم عبد الجبار نے وہیں گھر کے پاس شعیب ودیالے میں میرا نام تیسرے دوجے میں لکھوا دیا وہاں تختی پر ملتانی مٹی سے لکھا جاتا تھا، ملتانی مٹی جس پیالے میں رکھی جاتی تھی وہ بُدّ کا کہلاتا تھا، چوتھی کلاس اور پانچویں کلاس تک اسی شعیب ودیالے میں داخل رہے، پھر جب چھٹویں کلاس کا نمبر آیا تو ابو نے میرا نام گورنمنٹ انٹر کالج کے چھٹے درجے میں لکھوا دیا۔ ابو تو بے چارے ٹرک لے کر زندگی کی دوڑ میں شامل رہتے تھے لہذا وہاں پڑھائی تو کم ہوتی تھی، لڑکیوں کا ایک گروہ شیطانی اچھل پھاند اور کھیل کود میں لگا رہتا تھا، مجھے پیڑ پر چڑھنے میں بڑی مہارت تھی لہذا بڑی کلاس کے لڑکے ہم لوگوں سے کیتھا، بیل اور دوسرے پھل تڑواتے تھے، اس کے عوض میں وہ لوگ ہمارے گروپ کی دیکھ بھال کرتے تھے، قوی بھائی، تقی بھائی، شکیل بھائی، برج موہن بھائی، ارجن بھائی وغیرہ یہ سب نویں کلاس میں پڑھتے تھے اور ان لوگوں کا شہر میں بڑا دبدبہ تھا۔ ان دنوں ہاکی لے کر چلنا AK-47 لے کر چلنے سے زیادہ شاندار سمجھا جاتا تھا۔ پرنسپل صاحب کا نام تو اب یاد نہیں رہ گیا لیکن بہت لمبے چوڑے خوبصورت سے تھے، لیکن ان کا ایک ہاتھ نہیں تھا۔ اس کے باوجود انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی، کیونکہ وہ اسی ہاتھ سے کان پکڑتے تھے اور پھرتی سے وہی ہاتھ گال پر انگلیوں کے نشانات بھی بنا دیتا تھا، ایک ہی بار ان کے ہاتھوں سے میں پٹا تھا۔ پھر مسٹر جے پی سنگھ جو انگریزی پڑھاتے تھے۔ انہوں نے پرنسپل صاحب کو بتایا کہ منور شعر و شاعری سناتا ہے۔ لہذا اس کے بعد جب بھی میں ان کے سامنے پڑھنے جاتا تو مجھ سے شعر سنتے تھے، مجھے بھی الٹے سیدھے جو شعر آتے تھے میں انہیں سنا دیتا تھا، بلکہ ایک بار کوئی ایجوکیشن انسپکٹر کالج میں آئے تھے، غالباً وہ شاعر بھی تھے۔ پرنسپل صاحب نے ان سے بھی میری تعریف کر دی، اور مجھے پرنسپل آفس میں بلا کر انہوں نے مجھ سے شعر کم سنے اپنے بہت سے شعر سنائے اور ایک کاغذ پر اپنی دو غزلیں اردو میں لکھ کر مجھے عنایت کیں، حالانکہ وہ کوئی غیر مسلم تھے۔ لیکن وہ اردو کا سنہرا دور رہا ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب مجھے نہ تو گھر کا ڈر تھا اور نہ کالج میں ماسٹروں کا، لہذا میں دن دن بھر گھومتا پھرتا، کہیں سے پیسے آ جاتے تو کیپٹل سنیما میں پکچر بھی دیکھتا، یوں تو ملن سنیما بھی تھا جو کیپٹل سے اچھا مانا جاتا تھا، لیکن ادھر کچھ رشتے داروں کے گھر تھے اور ابو کے ملنے والے بھی ادھر بہت سے مل جاتے تھے، چونکہ کیپٹل سنیما گورنمنٹ کالج سے آنے جانے میں راستے میں پڑتا تھا اسلئے میرے لئے یہی سنیما ہال ٹھیک تھا۔

اس بے راہ روی کا جو نتیجہ ہونا تھا وہی ہوا، میں چھٹے درجے میں بری طرح فیل ہو گیا۔ والد صاحب کے سامنے رزلٹ رکھا گیا تو ان کا پارہ جہاں پہنچنا چاہئے تھا وہیں پہنچا۔ میری زبردست پٹائی ہوئی، اور مجھے ننگا کر کے گھر سے باہر نکال دیا، میں ننگ دھڑنگ باہر نکلا اور گھر کے سامنے ایک کھنڈر میں محلے کی عورتوں نے مجھے چھپا دیا، کہیں سے کوئی انگوچھا وغیرہ لا کر باندھا گیا، اور پڑوس میں ہی احمد خاں بڑے ابا کی اہلیہ جن کو ہم بڑی امی کہتے تھے انہوں نے اپنے یہاں چھپا لیا۔

بڑے ہونے کے ناطے وہ ابو پہ بگڑیں بھی۔ دوسرا حکم نامہ رات ہوتے ہوتے جاری ہو گیا کہ یہ پڑھے لکھے گا نہیں اسے کل سویرے سے شفیع مستری کے ساتھ راج مستری کا کام سیکھنے جانا ہے، دوسرے دن مجھے شفیع مستری جن کو بھی ہم بڑے ابا کہتے تھے ان کے ساتھ سول لائنس کالونی جوان دنوں بن رہی تھی وہاں گیا، دو چار بار تو مجھ سے اینٹیں اٹھوائی گئیں، لیکن میں دبلا پتلا اور بہت کمزور بھی تھا لہذا یہ خدشہ بھی تھا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ اینٹیں لے کر گر جائے اور چوٹ کھا جائے، مجھے ایک پیڑ کی چھاؤں میں بٹھا دیا گیا۔ دوپہر میں جب کھانے کا وقت ہوا تو بڑے ابا اور ان کے ایک آدھ دوست جو سب ساتھ میں کھانا کھاتے تھے مجھے بھی اسی کھانے میں شریک کیا، معمولی سا کھانا رہا ہوگا، یاد نہیں کہ کیا تھا، لیکن ہاں یہ آج تک یاد ہے کہ اس کے بعد میں تقریباً آدھی دنیا میں اور بڑی بڑی دعوتوں میں کھانا کھایا ہے لیکن محنت اور غربت کی آنچ پہ پکا ہوا کھانا دنیا کے ہر کھانے سے بہتر تھا۔ میری زبان آج تک وہ ذائقہ نہیں بھولی۔ شام تک ابو پر مختلف لوگوں نے دباؤ ڈالا ہوگا، خاص طور سے میرے بڑے ابا سید حکیم عبدالجبار نے، جن سے ابو ڈرتے بھی تھے اور بے انتہا لحاظ بھی کرتے تھے، لہذا میرا نام کٹوا کر ابو اپنے ساتھ مجھے کلکتے لے گئے، یہ ۱۹۶۵ء کی بات ہے، کلکتے کا سفر بھی عجیب و غریب تھا، وہاں پہنچتے ہی ٹائی فائڈ نے دھر دبوچا، تقریباً پندرہ بیس دن بستر پر پڑے رہے، اور اسی درمیان ہندوستان پاکستان جنگ کا بگل بج گیا، ہر طرف خوف ہی خوف تھا، شام ہوتے ہی بلیک آؤٹ ہو جاتا، ہوڑہ پل کے اوپر بھی توپیں لگی ہوتیں تھیں۔ جنگ ایک طرح سے شروع ہو چکی تھی۔ چونکہ حالات غیر یقینی تھے، لہذا ابو نے ایسے حالات میں مجھے وہاں روکنا مناسب نہیں سمجھا، ابو نے ہم سے کہا کہ تم رائے بریلی جاؤ یہاں حالات خراب ہوتے جا رہے ہیں، میں ابو کو چھوڑ کر آنا نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے ابو سے کہا کہ آپ بھی چلئے نہیں تو ہمیں اپنے پاس ہی رہنے دیجئے، انہوں نے سمجھایا کہ ابھی تم بہت چھوٹے ہو، حالات سدھرتے تو پھر ہم تمہیں لے آئیں گے، غرض یہ کہ اسی دن انھوں نے عزیز چچا جو ابو کے دوست بھی تھی اور کئی ٹرکوں کے مالک بھی تھے، ملٹری کے رٹائرڈ آدمی تھے، بہت غصے والے تھے۔ سلطانپور کے رہنے والے تھے، ان کے ٹرک نمبر UP2 7595 پر ابو نے مجھے واپسی کے لئے بٹھا دیا، میں عزیز چچا کے ساتھ شیر شاہ سوری کی بنوائی ہوئی سڑک کے ذریعے واپسی کے لئے چلدیا۔ ان دنوں راستے میں ڈھابے وغیرہ بہت کم تھے، لیکن کھانا بہت اچھا ملتا تھا، بردوان، آسنسول، شیر گھاٹی، اورنگ آباد سسرام، مغل سرائے، بنارس، جونپور ہوتے ہوئے میں تیسرے دن سلطانپور پہنچ گیا، وہاں عزیز چچا کے چھوٹے بھائی احمد صاحب نے بہترین کھانا کھلوایا، مجھے پچاس روپئے بھی دیئے اور روڈویز سے رائے بریلی کی بس پہ بٹھا دیا۔ ڈرائیور جوان کی جان پہچان کا تھا اور غالباً ابو سے بھی واقف تھا اس سے کہہ دیا کہ منور میاں اب آپ کی ذمے داری پر ہیں، ڈرائیور صاحب بھی بڑھیا آدمی تھے، راستے میں جہاں ڈھابے پر بسیں رکتی ہونگی وہاں انہوں نے مجھے چائے پلائی اور تقریباً ۳ گھنٹے کے آس پاس میں رائے بریلی پہنچ گیا۔ لیکن گھر جاتے

ہوئے عجیب سا احساس ہو رہا تھا کہ ہم ابو کو کلکتے میں اکیلے چھوڑ کر چلے آئے ہیں۔ ہفتوں یہ سوچ سوچ کر میں اندر اندر کُڑھتا رہا۔ خیر ہفتے دس روز کے بعد ہی ابو بھی کلکتے سے رائے بریلی آ گئے۔ میں رائے بریلی آتے ہی پھر اپنی پرانی تفریحات میں مشغول ہو گیا، گلے میں غلیل ٹانگے چڑیوں کے شکار کے لئے مارے مارے پھرتا، کبوتر بازی کے شوق میں دن دن بھر مارے مارے پھرتا، پتنگ بازی کے نشے میں اس چھت سے اس چھت کے چکر لگاتے رہنا، غرض یہ کہ ہر قصباتی تفریح میں پھر سے میں پوری طرح ملوث ہو گیا، اس بار تو ابو دو تین دنوں میں ہی کلکتے واپس چلے گئے تھے، لیکن جب دوبارہ لوٹ کر آئے تو انہوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا کہ منور اسماعیل اور یحییٰ یہ تینوں لکھنؤ میں دادی کے گھر پہ رہیں گے، یونس صاحب جو ابو کے خالہ زاد بھائی بھی تھے ان لوگوں کی دیکھ ریکھ کریں گے۔ آرڈیننس جاری ہونے کے فوراً بعد ہی اس پر عمل درآمد ہونا شروع ہو گیا۔ ایک ہفتے کے اندر ہی ہم تینوں بھائی کو ابو اور امی لکھنؤ لے گئے اور دادی کی تحویل میں ہم لوگ دے دیئے گئے۔

فوری طور پر ہم تینوں بھائیوں کو زبردست گھریلو نگرانی میں لکھنؤ منتقل کر دیا گیا، ابتدا میں تو تینوں بھائی گھر کو یاد کرتے تھے اور تقریباً روز رات میں روتے تھے، لیکن پھر رفتہ رفتہ لکھنؤ میں دل لگنے لگا، پرانے لکھنؤ میں چوک سبزی منڈی ہے، اسی کے پاس ہماری دادی رہتی تھیں، گھر بہت کشادہ تھا، ایک حصے میں چچا جان یونس صوفی صاحب رہتے تھے، سامنے والے حصے میں چھوٹے چچا جان ادریس چچا اپنے بچوں کے ساتھ رہتے تھے، ایک کمرے میں دادی جن کو سب لوگ ددا امی کہتے تھے، رہتی تھیں، بڑی پھوپھی جان نفیس خاتون کی شادی ہو چکی تھی، چھوٹی پھوپھی جان ددا امی کے ساتھ رہتی تھیں، یوں تو پھوپھی جان عمر میں مجھ سے کافی بڑی تھیں، لیکن ان کے مزاج میں بچکانہ پن بہت تھا، ہم لوگوں کو ہر طرح کے گھریلو عذاب سے وہی بچاتی تھیں سامنے والے کمرے میں ددا امی کے سب سے چھوٹے بھائی طاہر دادا اپنے بچوں کے ساتھ رہتے تھے، ان کی بڑی بیٹی یعنی ہماری پھوپھی کا نام عرفانہ تھا، طاہر دادا کے دو بیٹے بھی تھے، ایک کا نام آصف تھا جو مجھ سے کچھ چھوٹا تھا، لیکن بہت تیز بڑا پھرتیلا تھا، ایک چھوٹا بھائی اور تھا، بعد میں شاید اس کی عادتیں کافی بگڑ گئیں، وہ پولیس انکاؤنٹر میں مار دیا گیا تھا، گھر میں پڑھائی لکھائی کا زبردست ماحول تھا، یونس چچا لکھنؤ آرٹس کالج میں پڑھاتے تھے، ادریس چچا LDA میں اوورسیئر تھے، پورے گھر کیا پورے خاندان پر ددا امی (منی بیگم صاحبہ) کا زبردست دبدبہ تھا، لیکن وہ اپنی بے تحاشا بیماریوں اور بڑھتی ہوئی عمر کے باوجود سارے خاندان کو جوڑے رکھتی تھیں، صرف لکھنؤ ہی نہیں جہاں جہاں بھی رشتے دار تھے وہ برابر آتی جاتی رہتی تھیں۔ رائے بریلی تو خیر ددا امی کا مائکہ ہی تھا، لیکن رشتے داری کو برقرار رکھنے کے لئے وہ دانا پور اور کلکتہ تک جایا کرتی تھیں، حالانکہ دادی کا خرچ دونوں چچا مل کر بڑے سلیقے سے اٹھاتے تھے، ہر چند کہ ان لوگوں کا کنبہ بھی بڑا تھا، دادی ہمیشہ پیسے بچا کر رکھتی تھیں، اور پورے خاندان کے لئے کپڑے لتے خریدتی تھیں اور حسب استطاعت کمزور حصوں پر شفقت کا ہاتھ دھرے رہتی تھیں، کچھ روز تو اداس رہنے اور رونے دھونے میں گزرے پھر زندگی اپنے معمول پر آنے لگی، گھر کے لوگ ہم لوگوں کی قصباتی زبان سے بڑا لطف لیتے، دادی کی ڈانٹ پھٹکار اور پٹائی کے بیچ میں بڑی چچی جان اور رئیسہ پھوپھی ابر باراں کی طرح تھیں، کچھ ہی دنوں بعد ہمارا نام سنٹ جانس اسکول کے درجہ چھ میں لکھوا دیا گیا، وہاں کی یونی فارم سلوائی گئی، وہاں کا ماحول بہت اچھا تھا، اس اسکول کی ہیڈ مسٹریس مس انور صاحبہ تھیں، صاف ستھرا اسکول تھا، سبھی برادری کے بچے، بچیاں ایک ساتھ پڑھتے تھے، ان دنوں کا لکھنؤ بھی بہت اچھا تھا، جہاں ایک طرف لکھنؤ نوابوں، راجاؤں، جاگیرداروں اور زمینداروں کا شہر تھا، وہیں دوسری طرف قناعت کی زندگی گزارنے والوں سے بھی یہ شہر اٹا پڑا تھا، گفتگو، طور طریقہ اور رہن سہن کے اعتبار سے لکھنؤ دنیا کا کفایت شعار شہروں میں شمار کیا جاتا ہے، اپنی پریشانیوں پر مسکراہٹ، صبر، اور شکر کا اتنا دبیز پردہ پڑا رہتا تھا کہ کبھی کبھی تو ایک ہی مکان میں رہنے والے بھی ایک دوسرے کے دکھوں سے نا آشنا ہوتے تھے، ایک طرف تو سیب کے جسم سے چھلکے اتار کر کھائے جاتے تھے، دوسری طرف سبزیوں کی کئی ایسی قسمیں تھیں، جن کے چھلکوں سے بہت ہی لاجواب کباب بنا کر چنے کو مٹھے کے طور پر استعمال کرنے کی عادت برقرار رکھی جاتی تھی۔

جب تک رائے بریلی میں رہے صرف انسان جیسے لگتے تھے، ایک تو کم عمری کا زمانہ تھا، دوسری وجہ یہ تھی کہ علم کے ذریعے جو منافقوں کی تعلیم دی جاتی تھی، اس سے رائے بریلی غالباً کورا تھا، لیکن لکھنؤ میں آتے ہی تمام تہذیبی علامتوں کے ساتھ یہ بھی آشکار ہوا کہ مسلمانوں میں دو مسلک ہوتے ہیں، ایک شیعہ کہلاتا ہے اور دوسرا سنی ہوتا ہے۔ عام دنوں میں تو شیعہ سنی والا فرق محسوس ہوتا تھا لیکن محرم آتے ہی ایک بیزاری کی لکیر ہر محلے میں کھنچ جاتی تھی، میرے جیسے قصباتی نوجوان کے لئے یہ منظر بڑا عجیب سا لگتا تھا، کیونکہ رائے بریلی میں بھی یہ سب ہوتا تھا لیکن اس میں نفرت، لڑائی یا قتل و غارت گیری کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا تھا، لیکن لکھنؤ میں تو محرم آتے ہی گلیاں، راستے اور آنے جانے کا وقت تک بدل جاتا، دلچسپ بات تو یہ ہے کہ اتنی عمر میں بھی ایسی تمام فضولیات سے ہمیں کبھی کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہو سکی، لیکن لکھنؤ میں اگر آپ رہتے ہیں تو اس کام میں آپ کو کسی نہ کسی طور پر شامل رہنا پڑے گا۔

مجھے معذرت کے ساتھ یہ عرض کرنے دیجئے کہ لکھنؤ مجھے پہلی نظر میں اچھا نہیں لگا، کیونکہ لڑائی یہاں کی تفریح کا حصہ ہے، کہیں تیتر لڑ رہے ہیں، کہیں بٹیروں کی پالی جمع ہے، کہیں مرغے لہولہان دکھائی دے رہے ہیں، کہیں کوّے لڑ رہے ہیں، کہیں لنگڑ پیچ ہو رہا ہے، کہیں گائے کے لئے سانڈ لڑ رہے ہیں، کہیں سانڈ کے لئے بھانڈ لڑ رہے ہیں، بالکل ایسا لگتا تھا کہ جیسے علم و ادب کی اس بستی میں صرف لڑائی سکھانے والے اسکول ہیں، موقع ملتے ہی شاعر لڑ لیتے تھے، موقع بے موقع مولوی بھی بھڑ جاتے تھے کوچۂ ارباب نشاط کی طرف چلے جائیے تو آنکھیں لڑ رہی ہیں، ایک دوسرے سے کندھے لڑ رہے ہیں، کمشن کے لئے

طوائفوں کے مصاحبین لڑ رہے ہیں۔ غرض یہ کہ ہر طرح کی لڑائیوں نے دل پر ایک طرح کی ہیبت طاری کردی، محرم میں ادھر سے مت نکلنا، بارہ وفات میں ادھر سے مت نکلنا، جس گھر میں چلے جایئے، جس بیٹھک کے پاس کھڑے ہو جایئے، جس شخص سے تھوڑی دیر گفتگو کر لیجئے، کسی نہ کسی طرح کی لڑائی کا ذکر نکل آتا اس شہر کی عجیب وغریب خوبی یہ بھی ہے کہ ہر حکومت، مندر، مسجد، امام باڑے، گرودوارے، گرجا گھر، پارک، یہاں تک کہ موجودہ مایاوتی کی حکومت ہر چیز کو پتھر کا بنائے دے رہی ہیں، لیکن کوئی فیکٹری، کوئی کارخانہ، کوئی انڈسٹری، بنانے کی کبھی گفتگو نہیں ہوتی، نوابوں کے زمانے میں مصاحبین کروڑ پتی ہوتے تھے، انگریزوں کے زمانے میں مخبروں کے دن پھرتے چلے گئے، جمہوریت کے آتے ہی چورا چکوں، لیڈروں اور ٹھیکیداروں کی قسمتیں بدلتی چلی گئیں، لکھنؤ دراصل امیری اور غریبی کی چکی میں پستا ہوا وہ نصیب ہے جو محلوں میں برسوں سے جوتے گانٹھتے ہوئے موچی کا ہوتا ہے، یہاں زردوزی اور چکن کا کام عزت دار گھرانوں کی آبرو پر پردہ پڑا رہنے کے لئے ہوتا ہے۔

پردے کیطرح مجھ کو پڑا رہنے دیجئے
اٹھ جاؤں گا تو صاف نظر آئے گا آپ

لکھنؤ ایک کمزور ماں کی بددعا ہے، ایک اوباش نواب کی عیاشی کے لئے شکارگاہ کے طور پر بسایا گیا تھا، لکھنؤ میں سب کچھ موجود ہوتے ہوئے بھی ''بہو بیگم'' کے مقبرے جیسا تقدس تک نہیں ہے، امیرن (امراؤ جان) کے پل پل مرتے خاندان کی سسکیوں کو غزل کی گائکی میں شمار کرنے والوں نے زبردست دھوکہ کھایا، نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ کی ہر رنگینی کے پیچھے سے کسی سسکی کی مدھم مدھم سی آواز آتی رہتی ہے، انشا کی ہنسی کو آج تک وہ لوگ ڈھونڈتے مل جاتے ہیں۔ جن کے آنسوؤں کا رنگ بدلنے لگتا ہے، یگانہ کے چہرے پر ملی ئی کالک آج تک کوئی نہ کوئی نیا چہرہ تلاش کرتی رہتی ہے، اس کالک کو برابر نئے نئے چہرے ملتے رہتے ہیں، لیکن ہم اپنے چہرے کی چمک اور آب وتاب میں سیاہی مائل چہروں کو دیکھ ہی نہیں پاتے ہیں، لکھنؤ میرؔ کی خستہ حالی کی وہ نمائش گاہ ہے جہاں آج بھی ہنرمند لوگ گھر سے نکلتے ہوئے شرماتے ہیں۔ لکھنؤ سیاست کے بازی گروں کا وہ جوا خانہ ہے جہاں مذہب اور مسلک کے ٹھیکیدار دن بھر ہار جیت کا جوڑ گھٹاؤ کرتے رہتے ہیں۔ لکھنؤ وہ بالا خانہ ہے جس کی پیشانی پر تعلیم گاہ کا بورڈ لگا رہتا ہے، کوچۂ ارباب نشاط میں ادب سکھایا جاتا ہے، اور مسلکی چوپالوں پر ایک دوسرے سے نفرت کرنے کا سلیقہ، لکھنؤ ادب کے ساتھ کھلواڑ نہیں کرتا، بلکہ کھلواڑ کرنے والوں کو ادیب اور شاعر کا درجہ دے دیتا ہے، پتہ نہیں لکھنؤ کی تعریف کر رہا ہوں، یا لکھنؤ کے خلاف میرا قلم چل رہا ہے، لیکن اپنے احساس کو تحریر کی شکل دینا بھی ضروری تھا، ورنہ آنے والا مورخ مجھ سے قلم کی روشنائی کا حساب مانگ سکتا تھا۔

☆

## ''شاعرانہ نثر''

**میں** منوّؔر رانا کی شاعری کا تو پہلے سے ہی فین تھا لیکن آج ان کی یہ نثری کتاب ''سفید جنگلی کبوتر'' پڑھ کر ان کی خوبصورت نثر کا بھی معترف ہو گیا۔ یوں تو ان کے یہ انشائیہ نما مضامین مختلف ادبی رسائل میں پہلے ہی پڑھ چکا تھا لیکن ایک ساتھ کتابی شکل میں پڑھ کر تو میرا ذہن ودل روشن ہو گیا حالانکہ انشائیے پر ڈاکٹر خالد محمود کی کتاب جس پر کہ ان کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی ہے اس میں دنیا بھر کے انشائیہ نگاروں کا تعارف اور اقتباسات پیش کئے گئے ہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ زبان بدلتی ہے لہجہ بدلتا ہے تو کہنے کے انداز میں بھی نمایاں تبدیلی ہوتی ہے۔ آج جو خوبصورت نثر لکھی جا رہی ہے اس کی زندہ مثال منوّؔر رانا کی نثر ہے۔

منوّؔر رانا نے مجھے جو عزت بخشی وہ میں کبھی نہیں بھلا سکتا اور جب ''سفید جنگلی کبوتر'' میں ان کے مضامین پڑھے کہ وہ اپنے والد اور ان کے دوستوں بزرگوں کا کتنا احترام کرتے ہیں میں نے منوّؔر رانا کو دیکھا بھی ہے، سنا بھی ہے پڑھا بھی ہے اور ایک بزرگ کی حیثیت سے جن القاب وآداب سے مجھے نوازتے ہیں کہ میں اندر ہی اندر شرمندہ ہوتا ہوں اسی طرح اس کتاب میں انھوں نے اپنے بزرگ دوستوں کے جو خاکے لکھے ہیں وہ لاجواب ہیں قیصر شمیم ہوں یا سالک لکھنوی، یا شہود عالم آفاقی ہوں یا رئیس احمد جعفری ہوں یا کہ احمد سعید ملیح آبادی۔ منوّؔر رانا نے ان سب کا ہی نہیں کلکتہ کا حق ادا کر دیا۔ اپنے شہر کے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ اپنے شہر کی عظمت کا بھی جھنڈا بلند کر دیا۔

**محمد توفیق خاں** (سرونج، بھارت)

# براہِ راست

اردو شاعری کے ناقدین کا اِس صنفِ لطیف پر سب سے بڑا الزام حُسن وعشق کی فراوانی ہے۔کوئی مضائقہ نہیں، بسروچشم قبول مگر اردو کے مہربان دوستوں نے کبھی یہ غور فرمایا ہے کہ اُن کا ارشاد سبھی اردو شعراء پر عائد ہوتا ہے؟نہیں جناب ہر گز نہیں!تفصیل میں نہ جایئے صرف میرؔ، انیسؔ، غالبؔ، سوداؔ، نظیرؔ، اکبرؔ، حالیؔ، اقبالؔ ہی کو لے لیجیے کیا ان کی شاعری کو آپ چُما چاٹی کی شاعری سے تعبیر کریں گے؟

اور جناب! آج کے میرِ مجلس محترم منور راناؔ کا ذکر اس لیے لازم ہے کہ رانا صاحب محترم نے نہ صرف مسلم امّہ بلکہ برصغیر کے پسے ہوئے طبقات اور اُن کے مسائل کو جس طور مصوّر و منظوم کیا ہے وہ اردو شاعری کے لیے ایسی تابندہ مثال بن ہے جو نہ صرف رانا صاحب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اردو شاعری میں بلند مقام عطا کرتی ہے بلکہ ناقدین کی زباں بندی بھی کچھ اس طور کرتی ہے کہ اُن کے لبِ شیریں شیریں تر ہونے کے امکانات سوا ہیں۔

**گلزار جاوید**

☆ سب سے پہلے کینسر جیسے موذی مرض کو پچھاڑنے پر مبارک باد قبول کیجیے۔ازاں بعد اپنے محسوسات سے آگاہ فرمایئے؟

☆☆ یہ بیماری بہت دنوں سے میرے ساتھ تھی تقریباً25 برس سے لیکن شاید اس میں پہلے اتنی شدت نہ رہی ہو۔ 1994ء سے میں کلکتے میں کینسر کے بہت بڑے ڈاکٹر اے پی مجمدار کا مریض تھا۔مریض کے لیے سب سے خطرناک مرحلہ وہ ہوتا ہے جب ڈاکٹر کو مریض سے محبت ہونے لگے۔لہٰذا عام حالات کی طرح ڈاکٹر صاحب کو بھی مجھ سے بہت لگاؤ پیدا ہو گیا۔انھوں نے مجھ سے فیس کے پیسے بھی لینے بند کر دیے۔ایک آدھ بار میں نے انھیں اپنے کھیت کے باسمتی چاول کی بوریاں تحفتاً پیش کر دیں تو انھوں نے میرے حسنِ سلوک کو اپنی محبت سے سرشار کرتے ہوئے آپریشن تھیٹر کے خرچ کے علاوہ اپنا آپریشن چارج لینا بند کر دیا۔ پرہیز لفظ سے مجھے بس اتنی دلچسپی تھی کہ میں نے ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق کبھی پرہیز نہیں کیا۔ ہاں دوائیں وقت اور پابندی سے کھاتا رہا۔میں اکثر ان کی ناراضگی کا زور کم کرنے کے لیے ان سے کہتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب میں تو آپ کی درازئ عمر کی دعائیں مانگتا ہوں۔کیونکہ میرا عقیدہ ہے کہ آپ انشاءاللہ جب تک زندہ رہیں گے، میں کینسر سے نہیں مروں گا۔ظاہر ہے کہ ڈاکٹر اپنے مریضوں میں اعتماد کا جوش ہی بھرنا چاہتا ہے اور وہ مجھ میں خدا کے فضل سے ضرورت سے کچھ زیادہ تھا۔

ادھر ڈاکٹر مجمدار کا انتقال ہوا اور ادھر مرض نے اپنے پھیلاؤ میں اضافہ کرنا شروع کیا۔لکھنؤ میڈیکل کالج کے ڈاکٹر شاداب سے لے کر لائف لائن ہاسپٹل کلکتہ کے ڈاکٹر سعید السلام تک اور ڈاکٹر سعید السلام سے لے کر ممبئی کے بریچ کینڈی ہاسپٹل اور ہندوجا اسپتال تک نے مجھے بچانے کے نام پر خوب لوٹا، اِس بار بیمار ہونے کے بعد میرے تھکے ہارے جسم کو لے کر میرے گھر والوں نے لکھنؤ سے کلکتہ اور پھر ممبئی کے مختلف ہسپتالوں میں جتنے چکر لگائے، اس پر مجھے اپنی بیماری سے زیادہ ان لوگوں پر بہت ترس آیا۔ وہ تو کہیے کہ میری شاعری کے قدردان اور ممبئی کے اعلیٰ ظرف مسلمانوں میں سے ایک یوسف بھائی لکڑاوالا میرے ہمیشہ قدارادان رہے ہیں۔ وہ میرے ایئرپورٹ سے اترتے ہی تمام پروٹوکول اور بندوشوں کو توڑ کر مجھے ڈاکٹر سلطان پردھان کے کمرے میں سیدھے لے کر پہنچ گئے۔ جہاں تک پہنچنے میں کبھی کبھی مریضوں کو 3 سے 6 مہینے تک لگ جاتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے میرے مرض کی کنڈیشن سے واقف ہوتے ہی مجھے بریچ کینڈی ہاسپٹل میں داخلے کا مشورہ دیا، لیکن عین آپریشن سے پہلے ہی اینستھیسیا والے ڈاکٹر نے ہاتھ کھڑے کر لیے۔ان کا جواز تھا کہ پھیپھڑے بے ہوشی کا بوجھ اٹھانے کے لائق نہیں ہیں اور کڈنیوں کے بھی بلاسٹ ہو جانے کا خطرہ ہے۔لہٰذا اسی وقت اس بڑے اسپتال سے نکال کر اس سے بڑے اسپتال ہندوجا میں مجھے داخل کر دیا گیا، ہندوجا اسپتال اپنے نام کی نسبت سے مجھے اور میری رواداری کو بہت اچھا لگا۔احمد فراز کا ایک بہت مشہور شعر ہے (حالانکہ نقاد ان کے مرحوم ہونے کے باوجود ان سے دشمنی کرنے میں کمی نہیں کر پا رہے ہیں):

ڈوبتے ڈوبتے کشتی کو سہارا دے دوں
میں نہیں کوئی تو ساحل پہ اتر جائے گا

لہٰذا مجھے بھی اسی نسبت سے اسپتال کا ہندوجا نام اچھا لگا، یعنی ’ہندوجا‘، ’مسلمان آ‘۔خیر یہ تو گفتار درازی ہے۔لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس بار گھر والوں کی پریشانیاں، احباب کی فکر مندی، جاننے والوں کا خاموش رہنا مجھے بہت تکلیف پہنچا رہا تھا۔ میں اللہ پاک سے صرف یہی دعا کر رہا تھا کہ مولیٰ پاک اگر آئندہ میں بیمار پڑوں تو گھر اور قبرستان کے درمیان میں اسپتال نہ آئے:

ایسے اڑوں کہ جال نہ آئے خدا کرے
رستے میں اسپتال نہ آئے خدا کرے

☆ ابتدائے ہنر سے آغاز کیا جائے تو سرا کہاں جا کر ملتا ہے؟

☆☆ خاندان مولویوں کا تھالہٰذا شاعری کو پسند تو کیا جاتا تھا لیکن شعر کہنے کی کسی کو اجازت نہیں تھی۔ شاید میں اپنے خاندان کا پہلا آدمی ہوں جو تمام ناراضگیوں کے بعد بھی شاعری سے محبت کرتا رہا۔ میں نے ابتدا میں کلکتہ میں پرفیسر اعزاز افضل کو اپنی غزلیں دکھائیں جو پرویزؔ شاہدی کے شاگرد تھے۔ پرویز صاحب وحشتؔ کلکتوی سے قربت خاص رکھتے تھے۔ اعزاز افضل صاحب میرے والد کے دوست بھی تھے اور بہت سنجیدہ مزاج تھے۔ ہمیشہ اپنے کو لیے دیے رکھتے تھے، لہٰذا احترام کی وجہ سے مجھے ان سے بے تکلف ہونے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ آپ یوں سمجھ لیجیے کہ دنیا میں میرے والد کے بعد وہ دوسرے آدمی تھے جن کے سامنے میں نے کبھی سگرٹ نہیں پی۔ اس بیچ لکھنؤ میں کتابوں کی ایک دکان مکتبۂ دین وادب پر حضرت والی آسی سے ملاقات ہوئی جو اس کے مالک بھی تھے۔ ان کی بے تکلفی مجھے راس آئی اور میں نے ان سے گزارش کی کہ مجھے اپنی شاگردی میں لے لیں۔ اللہ انھیں غریق رحمت کرے، اتنے سادہ مزاج لوگ تھے کہ میں گیا تھا ان کی دکان پر مشاعرے کے پاس حاصل کرنے کے لیے لیکن مجھے انھوں نے اس مشاعرہ میں بحیثیت شاعر شرکت کرنے پر آمادہ کرلیا۔ حضرت والی آسی کے تعلق سے مولانا عبدالباری آسیؔ اور علامہ ناصرؔ گلاوٹھوی کے توسل سے یہ رشتۂ اقبال مندی حضرت داغؔ دہلوی سے جا کے ملتا ہے۔ زبان وبیان کا احترام اور سلیس زبان کا استعمال کرنا اس خانوادے کا طریقۂ خاص تھا۔ مجھے اس بات پر خوشی ہے کہ ترکیب اضافی کے جنون سے اس اسکول نے مجھے آزاد کر دیا تھا۔

☆ منور علی آتشؔ، منور علی شاداںؔ، منور راناؔ وغیرہ کی تبدیلی میں علم نجوم یا ستارہ شناسی کو بھی کوئی دخل ہے؟

☆☆ بالکل نہیں۔ میرے والد کے بے تکلف دوست حضرت رازؔ اللہ آبادی نے مجھ سے منور علی شاداںؔ نام رکھنے کے لیے کہا وہ میں نے رکھ لیا۔ لیکن اس تخلص کے باوجود میرے اندر کی وہ آگ ٹھنڈی نہیں ہورہی تھی جس کے سبب مجھے نکسلی پارٹی سے جوڑتے ہوئے کلکتہ پولیس نے انکاؤنٹر کرنے کی ٹھان لی تھی۔ لہٰذا میں نے اپنا تخلص آتشؔ کرلیا اور منور علی آتشؔ ہوگیا۔ لکھنؤ میں جس دن والیؔ آسی سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے مشاعرہ میں شرکت کرنے کے لیے آمادہ کرلیا تھا، انھوں نے میرے تخلص پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ ایسا لگتا ہے کہ کوئی بوڑھا لاٹھی ٹیکتے ہوئے چلا آرہا ہے لہٰذا انھوں نے میرا تخلص میرے والد اور میرے ٹرانسپورٹ 'رانا ٹرانسپورٹ' کی نسبت سے منور رانا کر دیا۔ میں نے جب ان سے اپنا شاگرد بنانے کی گزارش کی تو انھوں نے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ استاد شاگرد کا رشتہ نباہنا بہت مشکل ہے نہ آپ شاگردی کا حق ادا کر پائیں گے نہ میں استادی کا، آپ میرے چھوٹے بھائی کی طرح ہیں جو مجھے آتا ہوگا میں بتادوں گا۔ جب میں نے ان سے یہ عرض کیا کہ کوئی استادی کا گر بھی بتادیجیے تو انھوں نے ہنستے ہوئے ایک ایسی بات کہی جو میں 'چہارسُو' کے ذریعہ نئے لکھنے والوں سے شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا تھا کہ کسی سے بُرا کام کرالینا لیکن کبھی مصرعہ مت لینا۔ حالانکہ اس مشورہ کی وجہ سے اکثر استاد مجھے بڑی گالیاں دیتے تھے۔ جب وہ میرے کسی شعر کی اصلاح کرنا چاہتے تھے اور میں ان کا مقولہ انھیں یاد دلا دیتا تھا۔ نتیجہ کے طور پر کبھی کبھی وہ مجھ سے ایک ایک مصرعہ پندرہ بیس بار بدلواتے اور یہ بھی کہتے تھے کہ بیٹا مصرعہ نہ لگے تو چھوڑ دینا چاہیے۔ بھرتی کا مصرعہ لگا کر اپنی عادت نہیں خراب کرنی چاہیے۔

☆ ان بزرگوں کے اسمائے گرامی بتایئے جن کے فیض سے آپ آج فن کی معراج پر ہیں؟

☆☆ احترام کو گنتیوں میں شمار نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ میں ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ اتنے بزرگوں کی جوتیاں میں نے سیدھی کی ہیں کہ میرے ہاتھوں میں ان کی دعاؤں کی خوشبو بھری ہوئی ہے لہٰذا میں نثر لکھوں یا نظم اس میں اللہ نور ڈال دیتا ہے۔ میں نے اپنے عہد کے اردو اور ہندی کے تقریباً تمام شاعروں اور ادیبوں کی خدمت کی ہے۔

☆ آپ کو عاشق تو گردانا گیا مگر واردات قلبی کی نشان دہی نہیں کی گئی۔ آپ ہمیں 'تجھ سے ملتی جلتی ہوگی ایسی غزل کہہ سکتا ہوں' سے غائبانہ طور پر متعارف کرایئے۔

☆☆ اس سوال کے جواب میں ہندوستان کے اہم غزل گو شاعر حضرت شاذؔ تمکنت کا شعر آپ کی خدمت میں عرض ہے:

شب وعدہ کہہ گئی ہے شب غم دراز رکھنا
اسے میں بھی راز رکھوں اسے تم بھی راز رکھنا

☆ فلمی دنیا سے آپ کے لگاؤ بالخصوص شتروگھن سنہا کی نسبت کچھ ارشاد کیجیے۔

☆☆ بنگال کی آب وہوا ڈرامہ نگاری کے لیے بہت موافق ہے۔ میں وہاں ابتدائی دنوں میں ڈراموں میں حصہ لیتا تھا اور ڈرامے لکھتا بھی تھا۔ میرے چہرے کے نقوش اور میری آواز شتروگھن سنہا سے بہت ملتی جلتی تھی۔ اکثر پروگراموں میں، میں ان کے ڈائیلاگ اور ان کے اسٹائل کی نقل کرتا تھا۔ حالانکہ میری مڑک اور میرے لہجے کی سفّا کی اس وقت بھی مشہور تھی جب ہزار ہا پروگرام سننے والوں کے درمیان میں شان سے یہ کہتا تھا کہ وہ مجھ سے پہلے بمبئی پہنچ گئے اس لیے مجھے ان کی نقل کرنی پڑ رہی ہے ورنہ میں آج بمبئی میں ہوتا تو وہ اسی طرح کسی پروگرام میں میری نقل کررہے ہوتے۔ ایک بنگلہ رسالے نے مجھ سے انٹرویو لیتے ہوئے میرے اس جواب کو نمایاں کرکے شائع کیا تھا۔ ہندوستان میں ایک شہر ہے شاہجہاں پور اس کی ایک تحصیل ہے تلہر، وہاں کے ایک مشہور شاعر اور اپنے استاد کے دوست جناب طاہرؔ تلہری کا ایک شعر آپ کے توسط سے 'چہارسُو' کے قارئین کی نذر ہے:

مفلسی میں بھی سلامت رہا پندار مرا
کسی سلطان کے بگڑے ہوئے تیور کی طرح

☆ فلمی دنیا کی ناکامی نے اردوشاعری کوجس طرح سرفراز کیا ہےاس کےحوالے سے آج آپ کےاحساسات کیا ہیں؟

☆☆ ترقی پسندشاعری کے اہم ترین شاعر غلام ربانی تاباں کا ایک شعراس جواب سے پہلے آپ کوسنانا چاہتا ہوں:

قریب آ گیا دامن تو ہاتھ کھینچ لیے
بدل بدل دیے آداب آرزو میں نے

جن دنوں میں ڈراموں میں اوراسٹیج پر میں کام کرتا تھا انھیں دنوں فلمی دنیاکےاس وقت کے اہم ڈائریکٹر بی آر اشارہ سے میری ملاقات ہوئی۔فلم 'چیتنا' 'دوراہہ' اور'ضرورت' جیسی فلمیں انھوں نے ڈائریکٹ کی تھیں جن فلموں نے ہندوستان کےمزاج کوبدل دیا تھا۔ چیتنافلم کاایک ڈائیلاگ آج تک فلم سے جڑےلوگوں کویاد ہے۔وہ ڈائیلاگ ہے:

'جیسے جیسےلڑکی کی عمر بڑھتی ہےاس کےدام گھٹتے ہیں'

بی ارشاہ صاحب مجھےاپنے ساتھ بمبئی لے جانے پرآمادہ تھےلیکن میرے والداوران کےدوست پرکاش بھٹاچاریہ نے،جوان دنوں پولیس محکمہ میں ڈپٹی کلکٹر تھےاوران کے احسانات سے ہمارا خاندان آج تک سرشار ہے، پہلے تو مجھے میرے پچھلے خاندانی حالات اورموجودہ گھریلو الجھنوں سے ہرطرح آگاہ کیا پھراشارہ صاحب سے بھی گزارش کی کہ یہ منورہماراسب سے بڑابیٹا ہے۔ ہمارا پوراخاندان پاکستان چلا گیاہے، ہم بیماررہتے ہیں۔خدا نہ کرے مجھے کچھ ہوگیاتو پوراخاندان بکھرجائے گا لہٰذا فلمی دنیا کی طرف بڑھتے قدموں کو مجھے واپس لیناپڑا۔آج سے 20 برس پہلے ساجد نڈیاڈ والا نے مجھے بمبئی بلانا چاہالیکن اب میں ذمے داریوں کی اس چڑھائی پر تھا جہاں نیچے میری چار بیٹیاں اپنے مستقبل کے لیے مجھے یاد کررہی تھیں۔ پچھلے پندرہ برس پہلے انوملک نے کئی ملاقاتوں میں مجھے بمبئی میں رہنے کی دعوت دی اور یہ کہا کہ میں فلمی دنیا کو دوسراساحرلدھیانوی دے دوں گا لیکن میں نے ہنستے ہوئے ان سے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ میرے ٹرانسپورٹ میں تقریباً 80 لوگ کام کرتے ہیں،میری اپنی گھریلو ذمہ داریاں بھی ہیں اورمیری چھوٹی سی کمپنی کاٹرن اوور 5 کروڑ سے زیادہ ہےلہٰذا میں نئے سرے سے کسی مستقبل کوتلاش کرنے کے لیےدربدرنہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ میں نےعرض کیاہے کہ میرےاندرکی آگ کوکہیں قیام تو کرنا تھالہٰذا میں نے اپنے آپ کواردونثرونظم سے جوڑلیا۔ جوعزتیں اوراحترام مجھے حاصل ہے یہ سب میرےنصیب کاحصہ ہے۔خدا کاشکر ہے کہ مجھےاس عزت واحترام کے لیےکوئی'جگاڑبازی' نہیں کرنی پڑی۔

☆ آپ کے ہاں گاؤں کاذکر بڑی شدت سےنظرآتا ہے۔کچھ گفتگو بچپن کےایام کی نسبت ہوناضروری ہے۔

☆☆ بہت پیارےگلزار جاویدصاحب! آپ نے مجھ سےزیادہ ترایسے سوالات کیے ہیں جس کے پیچھے داستانیں چھپی ہوئی ہیں۔ میں شرمندہ ہوں کہ آپ کا سبک سارسالہ 'چہارسُو' ان کابوجھ نہیں اٹھاپائے گا۔ میرا نانیہال اوردادیہال عام ہندوستانیوں کی طرح کسی نہ کسی گاؤں سے جڑا ہوا تھا۔وہ تو ہماری بدنصیبی تھی کہ پاکستان کی تعمیر کےسبب ہندوستان کے بہت سے خاندانوں کی طرح ہماراخاندان بھی اجڑااوربکھرگیا تھا۔ نتیجے کےطورپر ہماری زمینیں بھی گئیں اوردیہاتوں سے ہماراتسلط بھی گیا۔بقول احمدرئیس کلکتوی:

میں بادشاہ ہوں گزرے ہوئے زمانے کا
سمٹ کےرہ گئی اک گھر میں سلطنت میری

آج حالات یہ ہیں کہ جس طرح مہاجرین ہندوستان کویادکرکے خوش ہوجاتے ہیں اسی طرح ہم لوگ بھی ہندوستان میں خوش ہونے کے لیےاپنے دیہاتوں کویادکرتے رہتے ہیں۔ایک میراشعرآپ کی خدمت میں عرض ہے:

ہم گاؤں میں جب تک رہتے تھے یہ سب منظرمل جاتے تھے
دوچار کنوئیں مل جاتے تھے دس بیس شجرمل جاتے تھے

☆ جس گاؤں کی نسبت آپ تحفظات کااظہارکرتے ہیں کیااس گاؤں کوانسانوں کے دوسرے بڑے جنگل سےتشبیہ دی جاسکتی ہے؟

☆☆ ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لحاظ سےآپ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں لیکن میراایک شعرہے:

تمہارے شہر میں میت کوسب کاندھانہیں دیتے
ہمارے گاؤں میں چھپّربھی سب مل کراٹھاتے ہیں

ہندوستانی دیہات ابھی تک اپنے آپ کواس گیلی مٹّی سے جوڑے ہوئے ہیں جس سے وہ کھلونےاوربرتن بناسکتے ہیں۔ابھی تک یہاں کے دیہاتوں سے جب کوئی لڑکی وداع ہوتی ہےتوبہتے ہوئے آنسوؤں اورروتی ہوئی آنکھوں سے سیکڑوں خواتین میں یہ پہچاننادشوارہوتاہے کہ اس لڑکی کی ماں کون ہے:

خدا کے واسطےاے بےضمیری گاؤں مت آنا
یہاں بھی لوگ مرتے ہیں مگرکردار زندہ ہے

☆ اپنےاندرکے بچےکوزندہ رکھنے کے لیے کیاجتن کرناپڑتے ہیں؟

☆☆ ایسا ہی ایک سادہ سےلیکن گہرے سمندروں جیسا سوال ہندوستان کے کسی صحافی نے مجھ سے کیا تھا کہ آپ ٹرانسپورٹ جیسے کاروباراورشاعری جیسی ریشم سازی کویکجا کیسے رکھ پاتے ہیں۔جواب عرض ہے، میں نے ان سے یہ کہا تھا کہ میری زندگی ایک ریل کی پٹری ہے۔ میراکاروباراس پر سے گزرتا ہواایک بھاری بھرکم انجن ہےاورمیری شاعری ان پٹریوں کو پارکرتا ہواایک معصوم بچہ ہے۔میں نے ہمیشہ ٹائمنگ کا خیال رکھالہٰذا کبھی کوئی حادثہ نہیں ہونے پایا۔

☆ شاعری کاالہام آپ پرکب اورکس طور ہوا؟

☆☆ الہام توبڑے شاعروں پر ہوتا ہے۔مجھےتو 1968ء میں اللہ نے میری دعاؤں کے طفیل یہ توفیق دی کہ میں شاعری کروں اور نثرلکھوں۔ ٹرانسپورٹ کےمشکل ترین کام میں اس نازک ترین فن کوسنبھالنا بہت مشکل کام

تھا۔لیکن شایداس دربدری اور دن رات جاگنے کا صلہ ہے کہ مضبوط مطالعے کی دولت کے موجود ہوتے ہوئے میں مشاہدہ کی آگ میں جلتا رہا لہٰذا میرا ازمنی علم ہمارے عہد کے آسانی علم والے شعرا سے کہیں زیادہ بہتر مان لیا گیا ہے۔

☆ قاری کے ذہن کو مقفل کرنے کا ہنر کس طور آپ کی دسترس میں آیا اور اس سے اردو شاعری پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟

☆☆ یہ اچھا ہوا کہ میں علی گڑھ کا نہیں ہوں جہاں کے تالے مشہور ہیں۔ یہ سارے کام اللہ کرتا ہے اور شاید مری سادگی اور ان دیکھی شرافت کو اللہ اپنے کرم سے نوازتا رہا۔

☆ آپ کی شاعری کا وہ کون سا وصف ہے جو آپ کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتا ہے؟

☆☆ میرے صبر اور شرافت نے مجھے یہ محبوبیت بخشی ہے۔جنگل کے سب جانور خطرناک ہوتے ہیں لیکن اللہ نے شیر کو جنگل کا بادشاہ بنایا ہے۔ مجھے یہ فخر ہے کہ میں نے اردو شاعری کو نئے موضوعات سے اتنا بھر دیا ہے کہ میں جانتا ہوں ہمارے بعد کا عہد میرے اس شعر کو گنگناتا پھرے گا:

نہ ہوں گے ہم تو ہمارے ہی تذکرے ہوں گے
کہیں گے لوگ کہ پھر میرؔ آکے لوٹ گیا

☆ آپ کے اندر کا تخلیق کار اتنا برہم کیوں ہے؟

☆☆ شاید میں وہ اصلی ترقی پسند ہوں جو جدت کا احترام کرتے ہوئے بھی اپنی روایتوں سے جڑا ہوا ہے۔اسی لیے میں دنیا میں کہیں بھی زیادتی ہو یا کسی چڑیا کا گھونسلا بھی نوچا جائے تو میرا خون یکساں کھولنے لگتا ہے۔ اس احتجاج کی آگ کا تذکرہ میں اوپر بھی کر چکا ہوں۔

☆ جو لوگ آپ کے ہاں حزن وملال کی زیادتی کا ذکر کرتے ہیں ان کو کیا جواب دینا پسند کریں گے؟

☆☆ میرا کام شاعری کرنا ہے، ناپ تول کے لیے ہمارا تنقیدی ادب ہمیشہ آمادہ رہتا ہے۔ ہر شاعر کے یہاں اس کا اپنا ایک کہنے کا طور طریقہ ہوتا ہے، لہٰذا اس کی صفائی دینے کی میرے خیال سے کوئی ضرورت نہیں ہے۔

☆ آپ کی شاعری کو تخلیق اور تناؤ سے تشبیہ کیوں دی جاتی ہیں؟

☆☆ یہ سب تنقیدی جانچ پڑتال ہے اس سلسلے میں مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔

☆ آپ کی شاعری کو پولٹیکل آئرنی سے موسوم کب اور کیوں کیا گیا؟

☆☆ میں ہندوستانی جمہوریت کو سلام کرتا ہوں کہ وہاں زباں بندی کی رسم ابھی تک رائج نہیں ہونے پائی اس لیے مجھے کسی پر اعتراض کرنے اور احتجاج کرنے کی پوری آزادی ہے۔

☆ 'تھکے ہوئے لوگوں' کی اصطلاح خوب ہے۔ اشارہ کس جانب ہے؟

☆☆ جی ہاں! ایوارڈ واپسی کے ہنگامے کے دوران میں نے اس اصطلاح کا استعمال کیا تھا،لیکن ہم جب 'تھکے ہوئے' کا استعمال کرتے ہیں تو اس میں شاعرانہ مٹھاس بھی شامل ہوتی ہے۔ تھکے ہوے سے میری مراد یہ تھی کہ 80اور 90سال کے ہمارے بزرگ شعرا اور ادیب جو ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں چڑھتے ہیں وہ انقلاب کے دار ورسن تک پہنچنے سے پہلے ہی ہانپ جائیں گے۔

☆ 'تیسری آواز' کی نشان دہی بھی ضروری ہے؟

☆☆ ہر تھکا ہوا آدمی، جس میں آپ مجھے بھی شامل کر سکتے ہیں، اپنے ماضی کو یاد کرنے کے بجائے اپنے مستقبل کے ان کاندھوں کو بہت چاہنے لگتا ہے جو مضبوط ہوتے ہیں جن کاندھوں پر سوار ہو کر وہ اپنا آخری سفر طے کرنا چاہتا ہے۔ یہیں سے اس 'تیسری آواز' کا سفر شروع ہوتا ہے۔

☆ آپ کے ہاں بھوک، بیماری، لاچاری کے ساتھ ماں، بہن کو جس طرح شاملِ سخن رکھا جاتا ہے، اس احساس میں ہمارے قاری کو شریک کیجیے۔

☆☆ شاعری میں گنجائشیں تو ہمیشہ موجود رہی ہیں لیکن ادبی نقادوں کے فتوے اور نک چڑھے پن کی وجہ سے شاعر یا ادیب بارڈر لائن پر رک جاتا ہے۔ جن لوگوں نے اس لکیر کو پار کرنے کی کوشش کی ان کو کبھی خچر پر بیٹھا ہوا ایک فقیر یا عرف عام میں نظیر اکبرآبادی سمجھا گیا۔ دنیا میں خود کو سب سے زیادہ تہذیبی شہر ثابت کرنے والے لکھنؤ میں یگانہ کو گدھے پر بٹھا کر ان کے چہرے پر کالک پوت کر تماشائیوں کو مفت میں گلوریاں پیش کر کے ان پر تھوکنے کے لیے کہا جاتا تھا۔ ہندوستان کے بڑے نوابوں میں شمار کیے جانے والے نواب رام پور کی ریاست میں شادؔ عارفی ایک اسٹوڈیو کے باہر بیٹھ کر 40روپے مہینہ پانے کے لیے گاہکوں کو بلایا کرتے ہیں۔ یہ سب وہی لوگ ہیں جنھیں آج اردو شاعری کا ٹرننگ پوائنٹ کہا جاتا ہے۔سلوک تو زمانے نے میرے ساتھ بھی اچھا نہیں کیا لیکن اسی یقین پر زندہ ہیں کہ ہمارے بعد کی دنیا ہم سے محبت کرنے والوں کی ہوگی۔

☆ آڑے ترچھے اور کھردرے الفاظ غزل میں استعمال کر کے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟

☆☆ ہم اپنے قارئین کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ:

سلیقے سے بٹھا کر دیکھ ہڈی بیٹھ جاتی ہے

☆ انسانی وجود میں نئی میلوڈی کب اور کیوں تلاش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس جستجو کے نتائج کیا رہے؟

☆☆ ابتدا سے انسانی وجود میں میلوڈی تلاش کرنے کی جستجو موجود تھی۔ ہر عہد اپنے ساتھ میلوڈی کے نئے امکانات لے کر آیا اور یہ انسانی جبلت کی انتہا ہے کہ ہر نئے عہد نے اپنی میلوڈی کو پرانا کہہ کر نئی میلوڈی تلاش کرنے میں اپنا وقت برباد کیا۔

☆ خون کے رشتوں کو تقدیس بخشنے والی بات بھی وضاحت طلب ہے؟

☆☆ شاعری اپنی نرم روی کے باوجود ہر عہد میں ایک ایسا اسلحہ رہی ہے جس سے بڑے سے بڑے کام لیے جاسکتے تھے لیکن خاص طور سے ہمارا اردو شاعر اپنی تحریر کو حرفِ آخر سمجھتا آیا ہے۔اسی لیے وہ امکانات کے جنگلوں میں بھٹکنے کی جرأت نہیں کرپاتا ہے۔مجھے فخر ہے کہ کوٹھوں پر بھٹکنے والی اردو غزل کو تقدیس بخشنے کے لیے میں نے اسے ماں کے قدموں میں لاکر کھڑا کردیا:

معمولی اک غزل کو کہاں تک گھسیٹ لائے
ہم اس غزل کو کوٹھے سے ماں تک گھسیٹ لائے

☆ دشمن کی سرزمین کا استعارہ زیادہ سخت نہیں ہوگیا؟

☆☆ میں اس سوال کے جواب میں اپنا ایک شعر قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں:

دشمنی ہو تو پھر ایسی کہ کوئی ایک رہے
یا تعلق ہو تو ایسا کہ پکاریں، آجائیں

☆ شہر کو فوجوں کے حوالے کرنے والی بات بھی ہراساں کررہی ہے؟

☆☆ آپ پریشان مت ہوں۔میرا انتخاطب ان ممالک کی فوجوں سے ہے جہاں ناانصافی، فرقہ پرستی، غریبی اور لاچاری اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔جب فوج کا کام ہی دشمن سے ملک کو بچانا ہے تو اندر بیٹھے ہوئے بھیڑیوں سے ملک اور قوم کو بچائے بغیر دشمن سے نہیں نمٹا جاسکتا۔

☆ پتنگ ہاتھ نہ آنے پر پھاڑ دینے والا اشارہ نفسیاتی الجھن کی طرف توجہ کیوں دلا رہا ہے؟

☆☆ بڑھاپے میں وہی لوگ الیکشن کے بیلٹ پیپر پر بھروسہ کرنے لگتے ہیں جو لوگ اپنی جوانی کے دنوں میں بلٹ پر بھروسہ کرتے ہیں۔یہ نفسیاتی الجھن شاید دنیا کے ہر اس انسان کی ہے جس کے سینے میں دل دھڑک رہا ہے۔

☆ مشاعرے کا ممتاز ترین اور مقبول ترین شاعر شعرا کا مضحکہ اڑانے پر مجبور کیوں ہوا؟

☆☆ اگر مجھ سے یہ سوال کیا گیا ہے تو میں نے تو ہمیشہ ان شعرا کے لیے اپنا دامن احترام بچھائے رکھا لیکن اگر اصلاحی غرض سے کہے گئے جملے یا مضمون کو مضحکہ اڑانے سے تعبیر کیا گیا تو یہ اردو ادب کی بدنصیبی ہے۔

☆ مشاعروں سے وابستہ بدعنوانیوں کا پردہ تو چاک ہونا ہی چاہیے؟

☆☆ دیکھیے اگر اصلاح کی غرض سے کہیں کچھ کہا جارہا ہے تو اسے تنقید یا مضحکہ نہیں سمجھنا چاہیے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ رقص جب تک مندر کے آنگن میں ہوتا رہا تو وہ 'نرتیہ کلا' سمجھا جاتا رہا لیکن جیسے ہی یہ نرتیہ کلا کوٹھوں تک پہنچائی گئی تو اسے مجرے کا نام دے دیا گیا۔اگر ہم اپنی ذمہ داری نہیں نبھائیں گے، تنقید نہیں کریں گے تو یہ ادارہ برباد ہوکر رہ جائے گا جو خاص طور سے ہندوستان میں قومی یکجہتی کے پل کی حیثیت رکھتا ہے۔مسئلہ یہ ہے کہ اردو میں اصلاح اور تنقید کو تیز نمک کا شوربہ سمجھا جاتا ہے۔ایسے میں یہ خرابیاں جو ہمارے مشاعرے میں در آئی ہیں یہ کیسے ٹھیک ہوں گی؟

☆ بے پناہ شہرت اور ناموری کے باوجود دلّی میں میرؔ ہونے کی خواہش کے پیچھے کیا معمہ ہے؟

☆☆ میرا وہ شعر جس میں آپ نے بھی تنقیدی پہلو ڈھونڈ لیا وہ کچھ اس طرح سے ہے:

مرا مقام مرے شہر نے نہیں سمجھا
اگر میں دلّی میں ہوتا تو میرؔ ہو جاتا

جب میرؔ دنیا کے سب سے تہذیبی شہر کہے جانے والے لکھنؤ میں بیٹھ کر یہ شعر کہہ سکتے ہیں:

کوفے سے مل رہے عدد ایک شہر کے
ڈرتا ہوں اے انیسؔ کہیں لکھنؤ نہ ہو

جب مرزا غالبؔ اپنے شاگرد کو لکھے جانے والے خط میں یہ تحریر کرسکتے ہیں کہ کلکتے میں ادبی قحط جیسا پڑا رہتا ہے۔انھیں تو گالی تک بکنے کا شعور نہیں ہے۔یہ مجھ سے 66 سالہ بڈھے ٹھڈوں کو ماں کی گالی دیتے ہیں اگر انھیں گالیاں دینی ہی ہیں تو میری پوتیوں کو دیں، میری نواسیوں کو دیں۔یہ بڑا بے شعور اور بے ہنگم شہر ہے—— تو کیا مجھے اپنے شہر سے شکایت کرنے کا حق نہیں۔آپ کا سوال اور میرا یہ شعر الجھی ہوئی پتنگ کی طرح ہیں۔

☆ ویسے کچھ لوگ آپ کو میرؔ اور نظیرؔ سے تشبیہ بھی دیا کرتے ہیں۔ایسے احباب کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

☆☆ میں ان کے حسنِ نظر کو آداب کرتا ہوں۔صرف آداب!

☆ قاری، سامع، نیازمند، احباب کی حد تک تو بات سمجھ میں آتی ہے، نقاد بھی آپ کے سحر میں گرفتار دکھائی دیں گے تو اردو شاعری کا کیا بنے گا؟

☆☆ دیکھا آپ نے۔آپ اچھے خاصے آدمی نے بھی بے وقوفی کا سوال داغ دیا۔اگر شاعری جادوگری ہوتی تو ہر شاعر کلکتے کے جادوگروں کی پناہ میں ہوتا۔میرا سب سے بڑا کمال تو یہی ہے کہ میں کسی نقاد کے دروازے پر کاسۂ گدائی لے کر نہیں گیا۔میں نے بہت سے ایسے لوگوں کا انجام دیکھا ہے جو اس طرح کی احمقانہ حرکتیں کرنے کے سبب اپنی زندگی میں ہی مرگئے اور میں خدا پر یقین رکھتے ہوئے پوری ذمہ داری سے یہ جانتا ہوں کہ میری زندگی میں میرے اسٹیچو کسی شہر میں نہیں لگائے گئے لیکن میرے مرنے کے بعد پورے ہندوستان میں یہ سوال گشت کرے گا کہ اس شخص کے اسٹیچو تمام شہر میں لگائے کیوں نہیں گئے۔میرا تقریباً 30 سال پرانا شعر ہے:

یہ سوچ کر مجھے لے جاؤ دار کی جانب
تمھیں بناؤ گے اک دن مجسمہ میرا

☆ اردو شاعری کے بلند مینار کو سات شعری مجموعوں میں سے پانچ ہندی زبان میں کیوں شائع کرانا پڑے؟

☆☆ پورے برصغیر اور خاص طور سے ہندوستان میں اردو کتابوں کی سیل نہیں ہے۔ یہ کتابیں عام طور پر دوستوں کو تقسیم کرنے میں یا ادھر ادھر سرکاری اداروں میں کھپانے کے کام آتی ہیں۔ ایسے میں اگر میں ہندی میں کتابیں چھاپ کر اردو کا نقصان برابر کرتا ہوں تو کیا بُرا کرتا ہوں۔ ابھی 20-15 روز پہلے وانی پرکاشن نے میری آٹوبایوگرافی جس کا ٹائٹل ہے 'میر آ کے لوٹ گیا' کو پانچ لاکھ روپے میں مجھ سے حاصل کی ہے۔ کیا پورے ہندوستان اور پاکستان میں اتنا پیسہ کوئی اردو والا دینے کو تیار ہوگا؟ آپ اس کو پانچ لاکھ مت سمجھئے آپ کے ملک میں یہ رقم بڑھ کر ساڑھے آٹھ لاکھ روپے ہوجائے گی۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں اردو کا نگاڑہ بجاتے رہنے کا مطلب ہے کہ آپ برابر نقصان کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ جس شخص کی 4 بیٹیاں ہوں وہ ان کے جہیز کے انتظام میں لگا رہتا ہے، اردو میں کتابیں چھاپ کر اپنے بچوں کے مستقبل سے کھیلنا پسند نہیں کرتا۔

شاید کہ اتر جائے ترے دل میں میری بات

☆ اُتر پردیش اردو اکادمی کی چیئر مین شپ کے لیے دوڑ دھوپ پھر رد کرنے کی روداد کیا ہے؟

☆☆ آپ کے اس سوال میں دوڑ دھوپ لفظ حشو وزائد کی طرح کھٹک رہا ہے۔ ایک بہت بڑا طبقہ خاص طور سے مغربی بنگال اور کلکتہ جس نے مجھے بچپن سے بڑھاپے تک سفر کرتے ہوئے دیکھا ہے، اسے معلوم ہے کہ اپنی ساری زندگی میں نے ہندو ودھوا عورت کی طرح گزاری ہے یعنی اس طرح کے اعزازات، اقبال، انعامات اور سرکاری اختیارات سے بہت پرے رہا ہوں۔ میرا ایک بہت پرانا شعر ہے:

اگر آداب کر لیتے تو مسند مل گئی ہوتی
اگر لہجہ بدل لیتے گورنر ہوگئے ہوتے

یہ شعر ماضی میں سوچے ہوئے کسی بڑبولے پن کی طرح نہیں ہے بلکہ حال کے زمانے میں بھی میری زندگی اس فقیری سے وابستہ ہے۔ ابھی پچھلے دنوں اے بی پی نیوز پر ایک مباحثے کے دوران میں نے بھارتیہ جنتا پارٹی کے ترجمان سنبت پاترا کو ڈانٹتے ہوئے یہ کہا تھا کہ اقتدار تو ہمارے شہر رائے بریلی کی نالیوں سے بہہ کر دلّی پہنچتا ہے۔ میرے اس جواب پر رائے بریلی شہر میں ہندو اور مسلمانوں نے عید اور دیوالی جیسی خوشیاں منائیں اور بے تحاشہ پٹاخے چھوڑے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ملک محمد جائسی سے لے کر منوّر رانا تک نے اقتدار کو سلام کرنا کسر شان سمجھا۔ ملک محمد جائسی وہی شخصیت ہیں جو ہندی ادب میں منگل سوتر کی حیثیت رکھتے ہیں اور جنھوں نے شیر شاہ سوری سے سمّان لینے سے اس لیے انکار کر دیا تھا کہ وہ ان کو دیکھ کر بے تحاشہ ہنس پڑا تھا۔ جس پر ملک محمد جائسی نے شیر شاہ سوری کو یہ کہتے ہوئے ڈانٹ دیا تھا کہ تو مجھے دیکھ کر ہنس رہا ہے یا کمہار کو دیکھ کر ہنس رہا ہے، اور یہ وہی منوّر رانا ہے جس نے اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی میں صرف مٹی کے برتن جہیز میں لے کر اپنے ڈرائنگ روم میں سجا دیے اور شان سے یہ کہتا ہوں کہ کم از کم میری ایک نسل کو میری غیرت مندی کا احساس رہے گا۔ اتر پردیش اردو اکادمی کی صدارت کا سب سے دلچسپ لطیفہ یہی ہے کہ اتر پردیش کے ایک سر پھرے وزیر نے میرے گھر تین بار تشریف لا کر مجھے اس کارِ بے مصرف کے لیے آمادہ کیا۔ میری خوش فہمی میں اضافہ کرتے ہوئے انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ 'تقریباً 100 اردو والوں نے میرے پاس اپنے سفارشی گھوڑے دوڑائے۔ مجھے آپ پر فخر ہے آپ کی دوستی پر فخر ہے کہ مجھے آپ کی باقاعدہ خوشامد کرنی پڑ رہی ہے، دو مہینے بعد ہی استعفیٰ دے کر چلے آنے کی اصل وجہ یہ تھی۔ ایک وجہ اور تھی جب میڈیا نے مجھ سے سوال کیا وہ وجہ میں نے بتا دی تھی کہ بہت دنوں سے ہماری قوم نے استعفیٰ نہیں دیکھا صرف خوشامد دیکھ رہی تھی۔ یہ ہے مختصر سے اس حادثے کی اصل وجہ۔ آپ کے پاس جن ذرائع سے یہ خبر پہنچی ہے ممکن ہے ان سو لوگوں میں وہ صاحب بھی موجود ہوں جو کرسی کے لیے سفارش کے گھوڑے دوڑا رہے تھے۔

☆ ایوارڈ واپس کرنے کی اصل وجوہات کیا ہیں اور وہ مقاصد کس حد تک حاصل ہوئے۔ کیا یہ آپ کا انفرادی فیصلہ گردانا جاسکتا ہے؟

☆☆ ایوارڈ واپس کرنے کی وجہ تو دنیا کو معلوم ہے۔ شاید آپ بھی اس سے باخبر ہوں گے۔ میری خواہش تھی کہ ایوارڈ واپس کرنے والوں کی کمزور ہوتی ہوئی ان آوازوں کو ایک کھنک دار آواز مل جائے۔ میں اللہ کا شکر گزار ہوں کہ پچھلے ساٹھ، ستر برس میں برصغیر کے لوگوں نے دیکھا کہ ایک معمولی سے اردو شاعر جو کمزور اور اقلیت سے تعلق رکھتا ہے، اس کی آواز سن کر اپنے طور پر زندگی گزارنے والے وزیر اعظم نے 24 گھنٹے میں اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور میں نے اپنے اجداد کی روش پر چلتے ہوئے ان سے ملاقات کرنے سے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا:

ہیں اہلِ وفا جتنے سب دار کے قابل ہیں
اعزاز نہ دے ہم کو توہین نہ کر سب کی

میں نے ملاقات کے لیے یہ گزارش کی کہ مجھ سے پہلے جن لوگوں نے ایوارڈ واپس کیے ہیں ان کی عمر بھی ہم سے زیادہ ہے اور علمی لیاقت بھی کہیں زیادہ ہے، لہٰذا ان میں سے کچھ نمائندہ قلم کاروں کو پی ایم او میں بلایا جائے اور اگر آپ چاہیں تو اس فہرست کے آخر میں میرا نام لکھ دیں۔

☆ ایوارڈ واپس کرنے کے بعد پی ایم آفس سے صرف آپ کو ہی فون کیوں آیا جب کہ بہت سے نامور لوگوں نے بھی ایوارڈ واپس کیے ہیں؟

☆☆ آپ لوگوں کے چھوڑ کر چلے جانے کے بعد بھی ایک ہندوستانی مسلمان کی آواز میں اتنا دم ہے، آپ کو اس بات پر فخر ہونا چاہیے۔

☆ مودی صاحب کے جوتے اٹھانے کی بات بہت سادہ اور واضح تھی، اسے متنازع بنانے والوں کا منشائے مقصود کیا ہے؟

☆☆ یہ وہی لوگ ہیں جو تقسیم کے بعد سے آج تک اقلیت کی آواز کو یکجا

نہیں ہونے دیتے۔ اقلیت سے میری مراد یہاں مسلمان بالکل نہیں ہے۔ ہندوستان میں اقلیت کے معنی کمزور، غریب، اچھوت، بے سروسامان لوگ ہیں۔ میں بھی ایسی ہی ایک بھیڑ کا نمائندہ ہوں۔ میں نے اے بی پی کے مشہور پروگرام 'پریس کانفرنس' میں دبانگ کی طرف سے کیے گئے ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں تکلیف دہ لیکن شاعرانہ طریقے سے یہ کہا تھا کہ کچھ ایسے لوگ جو مجھے احتجاج کرنے کا موقع بھی نہیں دیتے، وہ میری جانماز کے آگے سے گزر گئے۔ نتیجہ کے طور پر میری نماز بھی گئی اور ان کا ایمان بھی۔

☆ محروم اور مظلوم طبقات کی جنگ لڑنے والا بہادر قلم کار بہار کے انتخابات کے بعد سنبت پاترا سے کیوں برہم ہو گیا؟

☆☆ آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے ورنہ اس فقیر نے اے بی پی نیوز کے مباحثے کے بعد سنبت پاترا کو اس لائق نہیں چھوڑا کہ وہ مجھ سے بحث کر سکیں۔ دوسرے ہی دن سے وہ اپنے مباحثوں میں مجھے پتا تُلیہ (باپ جیسا) کہنے لگے۔

☆ آپ کے اسلوب، جینے کا چلن اور لڑنے کے عزم کے پیچھے کون سی قوت کارفرما ہے؟

☆☆ میں جب دشمنوں کے متواتر حملوں سے ٹوٹنے لگتا ہوں، پریشانیاں مجھے تھکانے لگتی ہیں تو میں ہمیشہ کی طرح آج بھی سویرے اٹھ کر فجر کی نماز پڑھتا ہوں، قرآن کریم کھولتا ہوں، سورہ فتح اور سورۂ نوح پڑھتا ہوں۔ دیوار سے سر ٹیکتا ہوں اور جی بھر کے روتا ہوں۔ اس کے بعد میں پروردگار سے صرف اتنا کہتا ہوں تجھ سے کچھ چھپا نہیں ہے۔ تجھے معلوم ہے کہ میں تیرے علاوہ کسی سے ڈرتا نہیں ہوں تیرے علاوہ کسی سے مانگتا نہیں ہوں۔ یہ بھی تیرے علم میں ہے کہ اپنے جانتے بھر تیرے کسی بندے کو نقصان نہیں پہنچایا۔ اب میں مصیبت میں گھرا ہوں، پریشان ہوں تو یہ تیری ذمہ داری ہے کہ مجھے مصیبتوں سے نکال۔ اسی وقت سے میری پریشانیوں کی دھوپ اپنی تمازت کو کھونا شروع کر دیتی ہے اور میری زندگی پھر خوشگوار ہو جاتی ہے۔ یہ نسخہ تم نے یاد دلا ہی دیا تو بول ہی دوں کہ یہ بظاہر تو بہت سادہ ہے لیکن عمل کرنے کے لیے خود سے جہاد کرنے کے برابر ہے۔

☆ کرۂ ارض کو گلوبل ویلیج بنانے والے جس خاص ایجنڈے پر عمل پیرا ہیں، اس کی روشنی میں آپ نہیں سمجھتے کہ آپ غلط پچ پر کھیل رہے ہیں؟

☆☆ بالکل نہیں۔ اس طرح تو میرا کام آسان ہوا جا رہا ہے۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، لکھ رہا ہوں، پڑھ رہا ہوں وہ بات ساری دنیا تک آسانی سے پہنچ جائے گی اور اگر میں ساری دنیا کو اپنی کہانی میں شامل نہ کر سکا تو شاید میرا مشن ادھورا رہ جائے گا:

بادشاہوں کو سکھایا ہے قلندر ہونا
آپ آسان سمجھتے ہیں منوّر ہونا

☆

## ''واجب القتل''

گذشتہ کچھ دنوں سے اردو شاعری میں ایک توانا آواز بہت شدت سے نمایاں ہوئی ہے۔ لفظ توانا رواروی میں برت گیا ہوں وگرنہ باغیانہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ یہ نام حضرت منوّر رانا کا ہے۔ منوّر رانا کون ہے؟ کہاں کا رہنے والا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ یہ سب باتیں جاننا میرے لیے قطعی غیر ضروری ہیں۔ میرا منشا و مقصود تو آپ کو اس امر سے آگاہ کرنا ہے کہ یہ نوجوان میرا مطلب منوّر رانا جس طور کے اشعار کہہ کر نہ صرف آزادانہ گھوم پھر رہا ہے بلکہ زندہ و سلامت بھی ہے۔ بھلا اس شعر کے بعد:

جرأت اظہار کرنے والا ہوں
امیرِ شہر کو تلوار کرنے والا ہوں

اس شعر کا کہنے والا ہمارے ملک میں تو کم از کم جائے امان پا نہیں سکتا اُس پہ متضاد یہ کہ اس گستاخ شخص نے مہاجر نامہ (منظوم) تحریر کر کے اتنا زوردار طمانچہ رسید کیا ہے کہ انگلیاں دانتوں میں دبانے بلکہ چبانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ طمانچہ کھانے والے کا نام آپ ہم سے دریافت کرنے کے بجائے اگر گال سہلانے والے سے کریں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ ہم کچھ کہیں گے تو ناحق میں گنہگار، سزاوار ہو سکتا ہے واجب القتل ٹھہرائے جائیں۔

جمیل الدین عالی

# ''صدیوں کا رشتہ''

محترم منور رانا کے قلم کا شاہکار، دنیا کی سب سے طویل اجتماعی منظوم ہجرت کی داستان ''مہاجر نامہ'' سے انتخاب

عطیہ سکندر علی (سکھر)

مہاجر ہیں مگر ہم ایک دنیا چھوڑ آئے ہیں
تمہارے پاس جتنا ہے ہم اتنا چھوڑ آئے ہیں

کئی آنکھیں ابھی تک یہ شکایت کرتی رہتی ہیں
کہ ہم بہتے ہوئے کاجل کا دریا چھوڑ آئے ہیں

شکر اس جسم سے کھلواڑ کرنا کیسے چھوڑے گی
کہ ہم جامن کے پیڑوں کو اکیلا چھوڑ آئے ہیں

کہانی کا یہ حصہ آج تک سب سے چھپایا ہے
کہ ہم مٹی کی خاطر اپنا سونا چھوڑ آئے ہیں

یہ ہجرت تو نہیں تھی بزدلی شاید ہماری تھی
کہ ہم بستر پہ اک ہڈی کا ڈھانچہ چھوڑ آئے ہیں

کئی درجن کبوتر تو ہمارے پاس ایسے تھے
جنہیں پہنا کے ہم چاندی کا چھلاّ چھوڑ آئے ہیں

ہنسی آتی ہے اپنی ہی اداکاری پہ خود ہم کو
بنے پھرتے ہیں یوسف اور زلیخا چھوڑ آئے ہیں

کبھی پتھر کو ہم نے کاٹ کر نہریں نکالی تھیں
یہی وہ ہاتھ ہیں جو اپنا تیشہ چھوڑ آئے ہیں

زمیں کٹتی ہوئی برسات میں دیکھی تو یاد آیا
بزرگوں کی کئی قبروں کو دھنستا چھوڑ آئے ہیں

نئی دنیا بسا لینے کی اک کمزور چاہت میں
پرانے گھر کی دہلیزوں کو سُونا چھوڑ آئے ہیں

کسی موسم میں ہم کو چین سے سونے نہیں دیتیں
وہ رشتے داریاں جن کو اکیلا چھوڑ آئے ہیں

یہ کیسی نفرتیں ہیں جو ہمیں اب تک ستاتی ہیں
محبت ہم تجھے شاید ادھورا چھوڑ آئے ہیں

وہ آنکھیں اتنی مدت پر بھی ہم کو یاد آتی ہیں
وہ آنکھیں جن میں ہم خوابوں کا ملبہ چھوڑ آئے ہیں

عجب دیوانگی تھی سوچئے تو رنج ہوتا ہے
عجب صحرا پسندی تھی کہ دریا چھوڑ آئے ہیں

ہماری اہلیہ تو آ گئیں ماں چھٹ گئی آخر
کہ ہم پیتل اٹھا لائے ہیں سونا چھوڑ آئے ہیں

خدا جانے یہ ہجرت تھی کہ ہجرت کا تماشا تھا
اُجالے کی تمنّا میں اُجالا چھوڑ آئے ہیں

تمنائیں زیادہ تھیں وہاں آسائشیں کم تھیں
یہاں پر تیل نومن ہے تو رادھا چھوڑ آئے ہیں

بڑی امّی نہیں تھکتی تھیں دورانِ سفر کہتے
پراٹھوں کے لیے گوندھا تھا آٹا چھوڑ آئے ہیں

مہاجر اس لیے ہم ہیں کہ اک مصرعے کی صورت میں
یہاں آتے ہوئے ہم ایک مصرع چھوڑ آئے ہیں

ہمیں اس زندگی پر اس لیے بھی شرم آتی ہے
کہ ہم مرتے ہوئے لوگوں کو تنہا چھوڑ آئے ہیں

ہمیشہ جاگتے رہنا ہی اب اپنا مقدّر ہے
ہم اپنے گھر میں سب لوگوں کو سوتا چھوڑ آئے ہیں

مہاجر کہہ کے دنیا اس لیے ہم کو ستاتی ہے
کہ ہم آتے ہوئے قبروں میں شجرہ چھوڑ آئے ہیں

یہ خود غرضی کا جذبہ آج تک ہم کو رلاتا ہے
کہ ہم بیٹے تو لے آئے بھتیجا چھوڑ آئے ہیں

ہم اپنی قیمتی چیزیں تو لے آئے سبھی لیکن
مدینے سے جو لائے تھے وہ طغریٰ چھوڑ آئے ہیں

تو کیا صدیوں کا رشتہ توڑنے کا نام ہجرت ہے
در و دیوار تک کو ہکّا بکّا چھوڑ آئے ہیں

اداسی ساتھ جائے گی ہمیں تنہا نہ چھوڑے گی
بہت لوگوں کو ہم روتا بلکتا چھوڑ آئے ہیں

نہ جانے کتنے چہروں کو دھواں کر کے چلے آئے
نہ جانے کتنی آنکھوں کو چھلکتا چھوڑ آئے ہیں

مروّت، دوستی، اخلاق، اپنا پن، ملنساری
یہاں آتے ہوئے کیا کیا اثاثہ چھوڑ آئے ہیں

تجھے اے تشنگی ہم کیا بتائیں اپنی نادانی
گھڑونچی پر گھڑا مٹّی کا رکھا چھوڑ آئے ہیں

یہاں آتے ہوئے ہر قیمتی سامان لے آئے
مگر اقبالؔ کا لکھا ترانہ چھوڑ آئے ہیں

جنابِ میرؔ کا دیوان تو ہم ساتھ لے آئے
مگر ہم میرؔ کے ماتھے کا قشقہ چھوڑ آئے ہیں

مہاجر اس لیے کہلائیں گے ہم رہتی دنیا تک
کسی کا ساتھ چھوٹا ہے کسی کا چھوڑ آئے ہیں

یہاں تک تو ہماری بے حجابی ہم کو لے آئی
ہمارے سر پہ اک چادر ہے بُرقعہ چھوڑ آئے ہیں

یہاں تو دینداری کا چلن حد سے زیادہ ہے
وہاں سچ مچ کا اک اللہ والا چھوڑ آئے ہیں

وہ ٹیپو جس کی قربانی نے ہم کو سُرخرو رکھا
اُسی ٹیپو کے بچوں کو اکیلا چھوڑ آئے ہیں

اگر ہجرت ہی کرنی تھی تو واپس ہم عرب جاتے
ذرا سا عطر لے کر مشکِ نافہ چھوڑ آئے ہیں

اذاں دیتے تھے ہم تو صبح کا آغاز ہوتا تھا
ہم اس بستی کے سب لوگوں کو سوتا چھوڑ آئے ہیں

ہمیں جو بھی سزا دی جائے گی وہ کم سے کم ہوگی
گُٹی چاندی میں لپٹا خط کسی کا چھوڑ آئے ہیں

بہت روئی تھی ہم کو یاد کر کے بابری مسجد
جسے فرقہ پرستوں میں اکیلا چھوڑ آئے ہیں

پرانی یاد کے موسم بہت تکلیف دیتے ہیں
سو ہم یادوں کے دروازے پہ تالا چھوڑ آئے ہیں

نمک لاہور کا کھاتے تھے شاید اس لیے ہم سب
نمک کا حق ادا کرنے کو تکیہ چھوڑ آئے ہیں

نہ جانے کیوں ہمیں رہ رہ کے یہ محسوس ہوتا ہے
کفن ہم لے کے آئے ہیں جنازہ چھوڑ آئے ہیں

گذرتے وقت بازاروں سے اب بھی دھیان آتا ہے
کسی کو اس کے کمرے میں سنورتا چھوڑ آئے ہیں

ہمارا خون بھی شامل تھا آزادی کی جنگوں میں
ہم اپنے خون سے لکھا نوشتہ چھوڑ آئے ہیں

بھگت سنگھ کو بھی ہم دادِ شجاعت دے نہیں پائے
یہ موقع مِل گیا تھا ہم یہ موقع چھوڑ آئے ہیں

کہاں لاہور کو ہم شہرِ کلکتہ سمجھتے تھے
مگر ہم کہہ کے دشمن کا علاقہ چھوڑ آئے ہیں

جنابِ داغؔ کے لہجے کی تُرشی ہے نہ شیرینی
زبانِ دہلوی کا حسن سارا چھوڑ آئے ہیں

غزل میں ہم نے ہجرت کے بہت سے دُکھ سمیٹے ہیں
سمندر قید تھا جس میں وہ کوزہ چھوڑ آئے ہیں

اگر ہم دھیان سے سنتے تو ممکن ہے پلٹ جاتے
مگر آزاد کا خطبہ ادھورا چھوڑ آئے ہیں

## ''چہارسُو''

ابھی تک راہ تکتی ہوگی بیلوں کی نئی جوڑی
ابھی تک منتظر ہوگا جو تانگہ چھوڑ آئے ہیں

ہمارا پالتو کتّا ہمیں پہنچانے آیا تھا
وہ بیٹھا رو رہا تھا اس کو روتا چھوڑ آئے ہیں

تو اتنی بے رخی سے چاند ہم سے بات کرتا ہے
ہم اپنی جھیل میں اک چاند اترا چھوڑ آئے ہیں

کئی زخموں کی پپڑی میں نمی موجود ہے اب تک
کئی یادوں کی تُرپائی کو اُدھڑا چھوڑ آئے ہیں

پڑے تھے ضبط کے چہرے پہ کافی خوشنما پردے
مگر جب روئے تو گھر بھر کو روتا چھوڑ آئے ہیں

مہینوں تک ہنسی ہونٹوں کی ننگے سر نکلتی تھی
مہینوں تک ہم آنکھوں کو برستا چھوڑ آئے ہیں

کسی کے سر پہ پگڑی تھی کوئی دستار باندھے تھا
کئی پھولوں کو اک گملے میں کھِلتا چھوڑ آئے ہیں

یہ ہم نے کس کے کہنے پر بہائیں خون کی ندیاں
یہ ہم اک دوسرے کو کیوں اکیلا چھوڑ آئے ہیں

شہادت ہم نے مِل جُل کر وطن کے واسطے دی تھی
پھر آخر کس لیے جلیان والا چھوڑ آئے ہیں

وہ جوہر ہوں، شہید اشفاق ہوں، چاہے بھگت سنگھ ہوں
ہم اپنے سب شہیدوں کو اکیلا چھوڑ آئے ہیں

خود اپنی دینداری پر ندامت ہونے لگتی ہے
خیال آتا ہے جب ہم بھی مصلّٰے چھوڑ آئے ہیں

جو اک پتلی سڑک اناؤ سے موہان جاتی تھی
وہیں حسرت کے خوابوں کو بھٹکتا چھوڑ آئے ہیں

زمیں آنکھوں سے اوجھل ہوگئی تب جاکے دھیان آیا
سمندر کی محبت میں جزیرہ چھوڑ آئے ہیں

کروڑوں کا یہ بنگلہ اس لیے چبھتا ہے آنکھوں میں
ہم اپنے گاؤں کی مسجد کو کچّا چھوڑ آئے ہیں

نہ چاہت اس طرف باقی نہ چاہت اُس طرف باقی
محبت کا ورق لگتا ہے سادا چھوڑ آئے ہیں

ہمیں شطرنج کے اس کھیل میں کتنی مہارت تھی
تو پھر پٹنے کی خاطر کیوں پیادہ چھوڑ آئے ہیں

غزل میں نادرہ کاری بڑی مشکل سے آتی ہے
جہاں آسان تھا یہ فن وہ قصبہ چھوڑ آئے ہیں

وطن کا اس طرح تقسیم ہو جانا قیامت ہے
کسی سے کیا گلہ جب خود ٹھکانا چھوڑ آئے ہیں

ہمیں رمضاں کی آمد پر ہمیشہ یاد آتا ہے
سفیدی کے لیے مسجد میں چُونا چھوڑ آئے ہیں

ہم اپنی جاں بچا کر اس طرف تو آگئے لیکن
کئی شہروں کو ہم جلتا سُلگتا چھوڑ آئے ہیں

لُبھا پائی نہ فانؔی کی ہمیں وہ سادہ لوحی بھی
ہم اُن کی چشمِ نم کو بھی برستا چھوڑ آئے ہیں

پلٹ کر مسجدِ جامع کی سیڑھی کو نہیں دیکھا
وہیں آزادؔ کو آواز دیتا چھوڑ آئے ہیں

جہاں کے عالموں سے ساری دنیا درس لیتی ہے
وہ تکیہ چھُٹ گیا ہم سے وہ ندوہ چھوڑ آئے ہیں

ابھی تک علم و حکمت کا جہاں سے فیض جاری ہے
بریلی میں ہم ایسا ایک روضہ چھوڑ آئے ہیں

طبیعت جب بھی گھبراتی تھی جا کر بیٹھ جاتے تھے
ہمیں افسوس ہے ہم شاہ مینا چھوڑ آئے ہیں

ہر اک تحریر جس کی مستند ہے ساری دنیا میں
حسین احمد کا وہ روشن صحیفہ چھوڑ آئے ہیں

## ''چہارسُو''

کسی نقّاش کے دستِ ہنر نے پھول ٹانکے تھے
وہ کیا چھوٹا مراد آباد سارا چھوڑ آئے ہیں

سیاست ہے، رعونت ہے، عداوت ہے، بغاوت ہے
وبائیں ساتھ لائے ہیں مسیحا چھوڑ آئے ہیں

بڑی شرمندگی ہوتی ہے جب بھی سوچ لیتے ہیں
کہ ہم اجمیر، کلیر اور دیویٰ چھوڑ آئے ہیں

ہمیں غالبؔ سے نادم ہیں ہمیں تلسیؔ سے شرمندہ
ہمیں نے میرؔ کو چھوڑا ہے میرا چھوڑ آئے ہیں

ہمیں ہجرت کی اس اندھی گپھا میں یاد آتا ہے
اجنتا چھوڑ آئے ہیں ایلورا چھوڑ آئے ہیں

جو مندر اور مسجد گفتگو کرتے تھے آپس میں
ہم ان کو بے سبب ہی کر کے گونگا چھوڑ آئے ہیں

بہت ممکن ہے دوزخ بھی حقارت سے ہمیں دیکھے
کہ ہم ویران کر کے گھر خدا کا چھوڑ آئے ہیں

ہم اپنی بے بسی پر اب کفِ افسوس ملتے ہیں
کہ خواجہ آپ کا بھی آستانہ چھوڑ آئے ہیں

امام الہند کی نگری بھی آخر چھٹ گئی ہم سے
اسی کے پاس ہم اپنا کچھوچھہ چھوڑ آئے ہیں

جہاں اکبر نے رشتہ کر کے بنیادِ وفا رکھی
وفاداروں کا وہ سچا علاقہ چھوڑ آئے ہیں

زمینِ نانکؔ و چشتیؒ، زبانِ غالبؔ و تلسیؔ
یہ سب کچھ پاس تھا اپنے یہ سارا چھوڑ آئے ہیں

رواداری کی چلمن کو سیاست نے کُتر ڈالا
ہم اپنے دین کا اوّل فریضہ چھوڑ آئے ہیں

وہ اعظم گڑھ وہ شبلی کا وطن بھی چھپٹ گیا آخر
وہ علم و دیں کا ہم روشن ادارہ چھوڑ آئے ہیں

اگر تاریخ پوچھے گی تو اس کو کیا بتائیں گے
کہ ہم بالے میاں کو کیوں کنوارا چھوڑ آئے ہیں

وہ شہر لکھنؤ جس پر زمانہ ناز کرتا ہے
ہم اس کی گفتگو اس کا سلیقہ چھوڑ آئے ہیں

سلام و منقبت کی محفلیں اور مرثیہ خوانی
عزاداری کا ہم کیسا مہینہ چھوڑ آئے ہیں

محرم کی سبیلیں، مجلسیں اور آگ پر ماتم
نہ پوچھو لکھنؤ میں اور کیا کیا چھوڑ آئے ہیں

کئی صدیوں کے قصے منھ زبانی یاد ہیں جس کو
وہ دہلی اور اس کا لال قلعہ چھوڑ آئے ہیں

عظیم آباد کی آنکھیں ابھی تک لال رہتی ہیں
ہم ان آنکھوں کو چلتے وقت روتا چھوڑ آئے ہیں

بنارس یاد آتا ہے ابھی تک جانے والوں کو
بنارس اے بنارس تجھ کو ہم کیا چھوڑ آئے ہیں

ہمیں بھوپال کے چھٹنے کا اتنا غم نہیں ہوتا
مگر سب تال چھوٹے ہر تلیّا چھوڑ آئے ہیں

علی گڑھ کی وہ دانش گاہ اور وہ چائے کا ہوٹل
وہ مکتب چھوڑ آئے ہیں ٹھکانہ چھوڑ آئے ہیں

جسے لکھا گیا تھا آنسوؤں کی روشنائی سے
مجازِ بے نوا کا وہ ترانہ چھوڑ آئے ہیں

اودھ کو خواب میں دیکھیں تو آخر کس طرح دیکھیں
ملیح آباد، کاکوری، سندیلہ چھوڑ آئے ہیں

کراچی تیری خاطر ممبئی بھی چھپٹ گئی ہم سے
تری چاہت میں پونا اور کھنڈالہ چھوڑ آئے ہیں

ریاست ٹونک سے مثلِ مہاجر ہم چلے آئے
گلابی شہر کو چھوڑا ہے کوٹہ چھوڑ آئے ہیں

یہاں کس کو بتائیں کون ہے جو اس کو سمجھے گا
کہ ہم سنبھل کا تہذیبی علاقہ چھوڑ آئے ہیں

ہمیشہ کی طرح پنجاب ہی زد میں چلا آیا
جسے دونوں طرف سے کر کے چھوٹا چھوڑ آئے ہیں

الہ آباد چھٹنے کا ابھی تک رنج ہوتا ہے
وہاں کی بے غرض چاہت کو بے جا چھوڑ آئے ہیں

کسی کے واسطے جے پور سے جو لے کے آئے تھے
وہ چُنری چھوڑ آئے ہیں وہ لہنگا چھوڑ آئے ہیں

سمندر، اب وہی لہریں، ہمیں آنکھیں دکھاتی ہیں
وہ جن لہروں کی خاطر ہم سفینہ چھوڑ آئے ہیں

اب اٹھتے بیٹھتے ہم پر ہوس یہ طنز کرتی ہے
قناعت کے سبق کو ہم ادھورا چھوڑ آئے ہیں

ابھی تک یاد ہے حاجی علیؒ درگاہ کا منظر
سمندر کو جہاں ٹھہرا ہوا سا چھوڑ آئے ہیں

فرشتے دو مقرر ہیں فقط اعمال لکھنے کو
ہمیں لگتا ہے جیسے ایک فرشتہ چھوڑ آئے ہیں

نہیں معلوم تھا جنت کی بھی تقسیم ہوتی ہے
مگر کشمیر تجھ کو ہم ادھورا چھوڑ آئے ہیں

یہاں ارضِ دکن کی سادگی ڈھونڈے نہیں ملتی
یہاں آتے ہوئے وہ بھی خزانہ چھوڑ آئے ہیں

تو کیا تقسیم ہی بنیادِ پاکستان ٹھہری تھی
ہم اک ٹکڑے کی خاطر ملک سارا چھوڑ آئے ہیں

کبھی لاہور سے ہم دیکھتے تھے گولڈن ٹمپل
بڑی مجبوریوں میں یہ نظارہ چھوڑ آئے ہیں

کہاں ڈھاکے کی ململ اور کہاں یہ کھال سے کپڑے
تو کیا ہم شوقِ پیراہن بھی اپنا چھوڑ آئے ہیں

صلیبوں پر جہاں سچائیاں اب بھی نمایاں ہیں
کئی صدیوں پُرانا وہ کلیسا چھوڑ آئے ہیں

وہ اک شاعر جو منصف بھی تھا اردو کا مجاہد بھی
برہمن ہو کے کہلاتا تھا ملّا چھوڑ آئے ہیں

سیاست نے سنا ہے نام تک اُس کا بدل ڈالا
وہی ہم جس کو کہتے ہیں بڑودہ چھوڑ آئے ہیں

ولی کی قبر پر اب دوڑتی ہیں قیمتی کاریں
مگر اب ہم سے کیا مطلب کہ صوبہ چھوڑ آئے ہیں

کلاسیکی غزل نے جس جگہ توقیر پائی تھی
جگر کا شہر یعنی شہرِ گونڈہ چھوڑ آئے ہیں

ہمارے چاہنے والوں میں اکثر ذکر ہوتا ہے
منور نام کا دیوانہ اک تھا چھوڑ آئے ہیں

کسی بھی حال میں اپنے وطن کو چھوڑ مت دینا
ہمارا حال دیکھو، گھر ہم اپنا چھوڑ آئے ہیں

نہ خوشبو نعت کی باقی، نہ لڈّو کی مہک باقی
چُھٹا محسن کا کاکوری، سندیلہ چھوڑ آئے ہیں

وہ امروہہ جہاں پر علم کے چشمے اُبلتے تھے
اسے بھی ہم بنا کر ایک نالہ چھوڑ آئے ہیں

سمندر تک ہمارے حوصلے کی داد دیتے تھے
تو پھر کیوں ہیر کو پانی میں ڈوبا چھوڑ آئے ہیں

محل سے دور برگد کے تلے، نروان کی خاطر
تھکے ماندے ہوئے گوتم کو بیٹھا چھوڑ آئے ہیں

وہاں بابا فریدے آج تک خوشبو لُٹاتے ہیں
تو کیوں دربار صاحب کو اکیلا چھوڑ آئے ہیں

ابھی تک گونجتے ہوں گے وہ بلھے شاہ کے نغمے
کہ اک درویش کو چوکھٹ پہ بیٹھا چھوڑ آئے ہیں

# شعری مزاج کا ترجمان

مظفر حنفی
(دہلی، بھارت)

**مغربی** بنگال میں آزادی کے بعد کے ادبی سرمائے کا جائزہ لیجیے تو سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ نظر آتی ہے کہ اس علاقے میں، جہاں فورٹ ولیم کالج کے وسیلے سے عام فہم ادبی نثر کی بنیاد پڑی تھی، آج قابلِ ذکر نثر نگاروں کی تعداد افسوس ناک حد تک کم ہے۔ میری اس بات پر ممکن ہے جاوید نہال، شانتی رنجن بھٹا چاریہ، عبدالرؤف، سالک لکھنوی، ظفر اوگانوی وغیرہ کبیدہ خاطر ہوں لیکن میرا مقصد ان کی نثری کاوشوں کی قدر و قیمت کو کم کرنا ہرگز نہیں ہے۔ غرض اتنی ہے کہ پچھلے تیس پینتیس برسوں میں شعر کہنے والوں کی جتنی بڑی تعداد منظرِ عام پر آئی ہے ان کے مقابلے میں نثر لکھنے والے انگلیوں پر شمار کیے جا سکتے ہیں۔ میری یہ بات بے موقعہ اور بے محل بھی نہیں ہے کہ علامہ وحشتؔ اور پرویز شاہدی سے لے کر اعزاز افضل اور منور رانا تک تخلیق کاروں کا ایک بڑا قافلہ ہے جس سے ہماری تنقید بے اعتنائی برتتی چلی آ رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اگر اس خطے نے دو چار نقاد بھی پیدا کیے ہوتے تو صورتِ حال یقیناً مختلف ہوتی۔

ماہنامہ شاعر (بمبئی) نے حال ہی میں میرے دوست بشیر بدرؔ کا ایک دلچسپ مضمون ''غزل کی زبان'' شائع کیا ہے، جس میں موصوف نے منور راناؔ اور ان کے ہم عصر چند اور شعراء کے (جن کا تعلق مغربی بنگال سے ہے) اشعار درج کر کے سوال کیا ہے کہ ان اشعار کا کسی خاص علاقے سے تعلق ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ بشیر بدرؔ نے اپنے مضمون میں اور بھی کئی تہلکہ خیز انکشافات کیے ہیں مثلاً میرؔ اور غالبؔ کی شاعری کا بڑا حصہ جسے غزل سمجھا جاتا ہے، دراصل غزل سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتا، غزل کی کوئی زبان نہیں ہوتی اردو سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، اردو مر جائے گی اور غزل زندہ رہے گی وغیرہ وغیرہ۔ سب سے زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ پورے مضمون میں پیش کردہ اشعار میں سے نوے فیصد خود بشیر بدرؔ کے ہیں جنہیں فاضل مقالہ نگار نے مثالی غزلیہ شعروں کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ یہاں میں بشیر بدرؔ کی دوسری باتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف منور راناؔ کے حوالے سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے منور راناؔ کے شعر پڑھیے جو بشیر بدرؔ نے اپنے مضمون میں درج کیے ہیں۔

بچپن میں کسی بات پہ ہم روٹھ گئے تھے
اس دن سے اسی شہر میں ہیں گھر نہیں جاتے

اس وقت بھی اکثر تجھے ہم ڈھونڈنے نکلے
جس دھوپ میں مزدور بھی چھت پر نہیں جاتے

اور اب منور راناؔ کے کچھ اور اشعار بھی ملاحظہ فرمائیے جو مندرجہ بالا اشعار ہی کے ہم مزاج ہیں:

شرم آتی ہے مزدوری بتاتے ہوئے ہم کو
اتنے میں تو بچوں کا غبارہ نہیں ملتا

میں اک فقیر کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ہوں
کسی سے بھی مری قیمت ادا نہیں ہوتی

جہاں پرگن کے روٹی بھائیوں کو بھائی دیتے ہوں
سبھی چیزیں وہاں دیکھیں مگر برکت نہیں دیکھی

ہمارے ساتھ چل کر دیکھ لیں یہ بھی چمن والے
یہاں اب کوئلہ چنتے ہیں پھولوں سے بدن والے

میں کہ فرہاد نہیں باپ ہوں اک بیٹے کا
صرف روزی کے لیے کوہکنی آ جائے

مرے گھر کے در و دیوار کی حالت نہیں دیکھی
برستے بادلو! تم نے بھی میری چھت نہیں دیکھی

ہمیں بھی پیٹ کی خاطر خزانہ ڈھونڈ لینا ہے
اسی پھینکے ہوئے کھانے سے دانہ ڈھونڈ لینا ہے

جب یہ سنا کہ جنگ سے لوٹا ہوں ہار کے
راکھی زمیں پہ پھینک کر بہنیں چلی گئیں

ہمیشہ اپنی ہی شرطوں پہ ہجرتیں کی ہیں
مسافروں نے قلی کی طرف نہیں دیکھا

اس خرابے کو بھی گلزار بنانا تھا اسے
ورنہ آدم کو زمیں پر نہیں پھینکا جاتا

جو دھوپ میں جلنے کا سلیقہ نہیں رکھتے
ان پیڑوں کو پتوں کی قبا بھی نہیں ملتی

منور راناؔ کوئی پُر گو شاعر نہیں ہیں لیکن ان کے پہلے مجموعہ کلام ''نیم

کے پھول'' میں اسی زمرے کے اشعار کی جو کثرت ہے کیا وہ کسی خاص مزاج شعر کی غمازی نہیں کرتی؟ کوئی تو سبب ہوگا کہ راناؔ بار بار مزدوروں اور غریبوں کا ذکر کرتے ہیں اور انتہائی ہمدردی کے ساتھ کرتے ہیں۔ کہیں دھوپ میں ان کا پسینہ بہتا دکھائی دیتا ہے تو کہیں ان کی اجرت کم ہونے کا گلہ ہے۔ کہیں قلی سے مسافروں کی بے اعتنائی شاعر کو خون کے آنسو رلاتی ہے۔ کہیں فقیر کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور اس کی بے وقعتی پر شاعر کا خون کھولتا ہے۔ کسی شعر میں پھینکے ہوئے کھانے سے رزق تلاش کرنے والے نظر آتے ہیں کہیں پھول سے بدن والے کوئلہ چنتے ہوئے پائے جاتے ہیں اور کہیں بھائی بھائیوں کو گن کر روٹیاں فراہم کرتا ہوا ملتا ہے۔ کہیں روزی کے لیے کوکھی کی جا رہی ہے تو کہیں گھر کی حالت نہ دیکھنے پر بادلوں کی بے حسی کا شکوہ کیا جا رہا ہے۔ پھر روٹی، روزی، مکان، مزدور، غریبی اور مجبوروں کے استحصال بے جا پر شعر کہنے والا یہ نوجوان جدید نسل کے دوسرے شاعروں کی طرح گردن ڈال کر چلنے سے انکار بھی کرتا ہے اس کے اشعار میں بہن شکست خوردہ بھائی کو راکھی باندھنے سے انکار کر دیتی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ آدم کو زمین پر اس لیے اتارا گیا ہے کہ وہ اس خرابے کو گلزار بنائے وہ پیڑوں کو پیغام دیتا ہے کہ دھوپ میں جلنے کا سلیقہ نہ ہو تو پتوں کی قبا ہاتھ نہیں آتی اتنے بہت سے شواہد موجود ہوں اور ہم علاقے کا تعین نہ کر سکیں تو ہمیں اپنی سخن شناسی پر اتنا اعتبار نہیں کرنا چاہیے جتنا بشیر بدر کو ہے۔

کسی دسویں جماعت کے طالب علم سے سوال کر دیکھیے کہ برہمی اور احتجاج کی لے ہندوستان کے کس علاقے میں سب سے بلند ہوتی ہے؟ جواب ملے گا بنگال میں۔ از ابتدا تا حال، یہ خطہ اشتراکیت کا پرجوش علمبردار رہا ہے اور وہاں آج بھی کمیونسٹ پارٹی برسرِ اقتدار ہے۔ بالآخر منور رانا، سبھاش چندر بوس اور قاضی نذر الاسلام کے بنگال میں قیام پذیر ہیں جس کے ضمیر میں ذوق جمال اور لطافتِ طبع کے ساتھ احتجاج برہمی، جوش، ولولہ اور سرکشی داخل ہے۔ ممکن ہی نہیں کہ کوئی اچھا اور سچا فن کار اپنی زمین سے کٹ کر اور اپنے ماحول سے بے نیاز ہو کر شعر کہہ سکے۔ البتہ راناؔ کو اپنے پیش روؤں سے جن میں بیشتر خالی ترقی پسند تھے، ورثے میں جو مزاج شعر حاصل ہوا اس میں عصری رجحانات اور تقاضوں کو آمیز کر کے انہوں نے ایک ایسا رنگ برآمد کیا جس میں جدیدیت، مقصدیت اور ترقی پسندی ایک دوسرے کے شانہ بشانہ چلتے ہیں ان کا شعر ترقی پسندی کی باڑھ میں آ کر نعرہ بازی نہیں کرتا بلکہ اس نظریے کو جذبے میں تحلیل کر کے نئی لفظیات سے آراستگی کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ چنانچہ اپنی تمام تر مقصدیت اور نظریاتی وابستگی کے باوصف وہ شعر رہتا ہے جمالیاتی حس کو آسودگی اور دل و دماغ کو بیک وقت متاثر کرنے والا شعر۔

لیکن مغربی بنگال میں تو منور راناؔ کے جونیئر اور سینئر ہم عصر شاعروں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ کسی جانب سے سوال اٹھ سکتا ہے کہ ان کے درمیان منور راناؔ کی شناخت کیا ہے۔ جواب ہے کہ اچھے شاعر کبھی بھیڑ میں گم نہیں ہوا کرتے۔ یہ جواب میرا نہیں۔ منور راناؔ کے مندرجہ ذیل اشعار کچھ یہی کہتے ہیں:

بڑے شہروں میں بھی رہ کر برابر یاد کرتا تھا
وہ اک چھوٹے سے اسٹیشن کا منظر یاد کرتا تھا

وہ میلا سا، بوسیدہ سا آنچل نہیں دیکھا
برسوں ہوئے ہم نے کوئی پیپل نہیں دیکھا

کچی سڑکوں سے لپٹ کر بیل گاڑی روپڑی
غالباً پردیس کو کچھ گاؤں والے جائیں گے

جب ایک واقعہ بچپن کا ہم کو یاد آیا
ہم ان پرندوں کو پھر گھونسلوں میں چھوڑ آئے

ہم گاؤں میں جب تک رہتے تھے یہ سب منظر مل جاتے تھے
دو چار کنوئیں مل جاتے تھے دس بیس شجر مل جاتے تھے

گفتگو فون پر ہو جاتی ہے راناؔ صاحب
اب کسی چھت پہ کبوتر نہیں پھینکا جاتا

تو اب اس گاؤں سے رشتہ ہمارا ختم ہوتا ہے
پھر آنکھیں کھول لی جائیں کہ سپنا ختم ہوتا ہے

ابھی تک میرے قصبے میں کئی ایسے گھرانے ہیں
کبھی رمضان میں مسجد سے افطاری نہیں لاتے

یہ اور اس قبیل کے بہت سے اشعار بتاتے ہیں کہ راناؔ کا بچپن گاؤں میں گزرا ہے جہاں کا اسٹیشن، پیپل کے پیڑ، کنوئیں، کچی سڑکیں، بیل گاڑیاں، تالاب، ماں کا میلا اور بوسیدہ آنچل، گھونسلے سے چرائے ہوئے پرندوں کے بچے، چھتوں پر پھینکے ہوئے کبوتر شاعر کو بار بار یاد آتے ہیں اور یہ یادیں اشعار میں جگہ بنا کر منور راناؔ کی انفرادیت کا تعین کرتی ہیں۔ ایسے تمام اشعار یکجا کر کے دیکھے جائیں تو ان سے ابھرتا ہوا گاؤں بنگال کا نہیں، صاف مشرقی یو۔ پی کا نظر آتا ہے۔ یارانِ نکتہ داں کے لیے صلائے عام ہے خود تجزیہ کر کے دیکھ لیں۔

منور راناؔ کے شعری رویے کا ایک روشن اور گہرا رنگ یہ بھی ہے کہ ان کے اکثر اشعار میں بہن کی محبت، ماں کی ممتا، پدرانہ شفقت اور بچوں کی معصومیت کو شاعری کی زبان مل گئی ہے مثلاً:

ماں باپ کی بوڑھی آنکھوں میں اک فکر سی چھائی رہتی ہے
جس کمبل میں سب سوتے تھے اب وہ بھی چھوٹا پڑتا ہے

کھلونوں کے لیے بچے ابھی تک جاگتے ہوں گے
تجھے اے مفلسی کوئی بہانا ڈھونڈ لینا ہے

اب دیکھیے کون آئے جنازے کو اٹھانے
یوں تار تو میرے سبھی بیٹوں کو ملے گا

گھیر لینے کو مجھے جب بھی بلائیں آ گئیں
ڈھال بن کر سامنے ماں کی دعائیں آ گئیں

کچھ کھلونے کبھی آنگن میں دکھائی دیتے
کاش ہم بھی کسی بچے کو مٹھائی دیتے

جس کو بچوں میں پہنچنے کی بہت عجلت ہو
اس سے کہیے نہ کبھی کار چلانے کے لیے

کسی بچے کا یہ جملہ ابھی تک یاد ہے راناؔ
یتیموں کو پڑھانے کوئی استانی نہیں جاتی

ہر سہولت تھی میسّر لیکن اس کے باوجود
ماں کے ہاتھوں کی پکائی روٹیاں اچھی لگیں

دوستی دشمنی دونوں شامل رہی، دوستوں کی نوازش تھی کچھ اس طرح
کاٹ لے شوخ بچہ کوئی جس طرح ماں کے رخسار پہ پیار کرتے ہوئے

جب یہ سنا کہ جنگ سے لوٹا ہوں ہار کے
راکھی زمیں پہ پھینک کے بہنیں چلی گئیں

یہ بوڑھی آنکھیں، چھوٹا کمبل، بچوں کے کھلونے، باپ کی موت کا تار، ماں کی دعائیں اور اس کے ہاتھ کی پکائی روٹیاں، یتیموں کو نہ پڑھانے والی استانی، بچوں میں مٹھائی بانٹنے کی خواہش، بہن کی راکھی اور ماں کے رخسار کو کاٹنے والے شوخ بچے کس طرح سامنے سامنے کی بات اور پیش پا افتادہ مضامین نہ رہ کر غزل کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔ اہلِ نظر محسوس کر سکیں گے یہ باتیں ایک خاص دھرتی کی بو باس میں رچی بسی ہیں۔ دوسرے علاقوں مثلاً مغربی ممالک کے شاعر انہیں اس طرح نہیں کہہ سکتے۔ دراصل ایک مخصوص خطّہ ارض اور کوئی خاص زبان کسی صنفِ شعر کے لیے والدین کی سی حیثیت رکھتے ہیں خصوصاً منور راناؔ پر یہ بات زیادہ صادق آتی ہے کہ وہ اردو کی غزلیہ شاعری میں مغربی بنگال کے مزاج شعری کے ترجمان ہیں نیز خاندان اور رشتوں کی تقدیس پر ایمان رکھتے ہیں۔ بشیر بدرؔ کو ان کا ایک شعر سنا کر میں اپنی بات ختم کرنا چاہتا ہوں:

آسمانو! کبھی پاتال کی جانب آنا
مجھ سے ملنا ہو تو بنگال کی جانب آنا

## ''کامیابی کی ضمانت''

پہلے پہل منور رانا نے نثر میں جوہر دکھانا شروع کیے ازاں بعد اُن کا میلان شاعری کی طرف کچھ اس طور ہوا کہ وہ آیا اُس نے دیکھا اور فتح کر لیا کہ مصداق سب کچھ فتح کر ڈالا۔ مشاعرہ ہندوستان کے کسی کونے یا اردو دنیا کے کسی بھی حصّے میں ہو منور رانا کا نام کامیابی کی ضمانت بن گیا۔ اب تو کچھ دنوں سے اُن کے اندر کا انقلابی کچھ اس طور نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے کہ اُن کی سلامتی کی بابت کبھی کبھی تشویش بھی ہونے لگتی ہے۔ جو کچھ بھی ہے یہ ایک مثبت روّیے کی جانب بہت ہی مثبت قدم ہے جس نے اردو کے چہرے پر لگے بہت سے داغ، دھبّے نہ صرف دھو دیے ہیں بلکہ اُس کی خوبصورتی میں بھی اضافہ کر دیا ہے۔

شہریار

## ''کمال کے آدمی''

یہ اپنے منور رانا بھی کمال کے آدمی ہیں بس، ٹرک اور ویگنوں کی مرمت کرتے کرتے اردو شاعری کی ایسی اوور ہالنگ کی کہ سارے بوسیدہ برج نہ صرف ڈھے گئے بلکہ نئی امیدوں کے چراغ بھی روشن ہو گئے ہیں۔ اب یہ تو منور رانا ہی بتا سکتے ہیں کہ ان چراغوں کو منور رکھنے کے لیے اُنہوں نے کتنی راتوں کو خون کیا ہے یا اپنے خون سے رتجگا کر کے اُن راتوں کو منور کیا ہے جن میں اردو شاعری کی کامیابی کا ایک نیا باب رقم ہوا ہے۔ میری دعا ہے کہ منور رانا اسی طرح جرأتِ اظہار کا مظاہرہ کرتے ہوئے مزید کامیابیاں حاصل کرتے رہیں۔

ندا فاضلی

# ''لہو میں رنگ کے چھینٹے''

ڈاکٹر محبوب راہی
(مہاراشٹر، بھارت)

**بنگال** ہمیشہ اپنی جغرافیائی، تاریخی، تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی اور سیاسی ہر اعتبار سے ایک منفرد ثقافت رکھتا آیا ہے۔ آئے دن انقلابات کی شورشوں اور احتجاجات کے ہنگاموں سے حالات میں اتھل پتھل مچائے رکھنے والا زندہ دلوں اور بیدار مغزوں کا یہ خطّہ زیبنا بھارت کا اٹوٹ انگ ہونے کے باوجود اپنا ایک الگ تھلگ جغرافیائی ثقافتی اور سیاسی وجود رکھتا ہے۔ اس علاقے میں ماضی قریب میں مختلف شعبہ ہائے حیات سے وابستہ عالمگیر شہرتوں کی حامل کئی شخصیتیں اس صوبے کے شہرت و ناموری میں چار چاند لگانے کا موجب ہوئیں جن میں راجہ رام موہن رائے، سبھاش چندر بوس، ودیا ساگر، رابیندر ناتھ ٹیگور، قاضی نذر الاسلام، دیش بندھو چترنجن داس، مولانا آزاد فورٹ ولیم کالج سے متعلق جان گلکرائسٹ، میر امن دہلوی، شیر علی انسوس، نہال چند لاہوری، کاظم علی جوان، للّو لال جی، منشی بنی نرائن جہان، سید حیدر بخش صیدری، مرزا علی لطف کے علاوہ عبدالغفور نساخ، ابوالقاسم شمس، محمد صادق اختر، رضا علی وحشت، پرویز شاہدی اور جمیل مظہری وغیرہ۔ شعر و ادب، سیاسیات، سماجیات وغیرہ شعبوں میں سرگرم عمل ان تمام سربرآوردہ اور برگزیدہ شخصیتوں میں ہر ایک نے تاریخ ساز کارناموں کے طفیل اپنی منفرد ثقافت کے ساتھ ایک عالم کے لیے مرکز توجہ بنا ہوا تھا.... ان تمام سے قطع نظر جہاںتک اردو زبان و ادب کی حیات نو اور ترقی و ترویج کا معاملہ ہے فورٹ ولیم کالج کو مرکز و محور بنا کر جان گلکرائسٹ کا اردو کے صفِ اول کے تخلیق کاروں کو یکجا کرنا نیز سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد نیم جان اور بے سہارا اردو کو اپنی انتھک کاوشوں سے حیات تازہ سے روشناس کرانا بنگال کا ایک بے مثال، منفرد اور تاریخ ساز کارنامہ ہے۔

دور حاضر میں انفرادیت پسندی کی کمی اس تابناک روایت کو بنگال کے ایک ہونہار سپوت نے محض زندہ ہی نہیں رکھا اسے دور بہت دور بین الاقوامیت کی سرحدوں تک پہنچایا ہے جسے ایک دنیا منوّر رانا کے نام سے جانتی اور اسکی انفرادی صلاحیتوں کا لوہا مانتی ہے۔ یہاں بات محض انفرادیت کی ہو رہی ہے۔ درجہ بندی میرا مطمع نظر نہیں۔ اور پھر خود فریبوں کے اس دور میں جبکہ کوئی تگ بندھی بھی اپنے آپ کو میرؔ و غالبؔ یا اقبالؔ سے کسی طرح کمتر ماننے کو تیار نہیں انفرادیت پسندی کے معاملے میں بھی یہ ہے کہ دوسروں کے چبائے ہوئے نوالوں کی جگالی اور جس تس کی نقالی پر گزر بسر کرنے والے بھی اپنے لب و لہجے کی تازگی اور رنگ و ترنگ کی انفرادیت کے دعویدار ہیں جبکہ سچائی یہ ہے کہ ہزار ہا ہزار کی بھیڑ بھاڑ میں وہ اقصا تازہ کار لہجے اور منفرد آواز کے حامل تخلیق کار دو چار سے زیادہ کبھی نہیں ہوتے۔ ایسے ہی دو چار منفرد فنکاروں میں ایک منوّر رانا بھی ہیں جو اپنی کھنکھناتی ہوئی گرجدار اور پاٹ دار آواز، کھٹے میٹھے ذائقے، بیباک اور دوٹوک لہجے، مجاہدانے تیور، غیر مصلحت پسند انصاف گوئی، زبان و بیان کی تازگی، افکار و نظر کی جدت اور تخّیل کی نادرہ کاری، ان چھوٹی لفظیات، مفہوم و معنیٰ کا ایک جہان نو لیے دلکش تشبیہات، معنی خیز اور تازہ کار استعارات اور نو بہ نو تراکیب سے آراستہ و پیراستہ اشعار کو ایک نہایت انوکھے اچھوتے اور منفرد ڈھنگ سے، بے تکلف اور ٹھیٹ انداز میں پیش کرنے کی بناء پر ملک گیر اور بین الاقوامی پیمانے پر انعقاد پذیر مشاعروں میں محض بنگال ہی کی نمائندگی کا حق ادا نہیں کر رہے ہیں بلکہ وہ دنیا بھر میں مشاعروں کے سامعین کی پہلی پسند اور مشاعروں کی ناگزیر ضرورت بن چکے ہیں۔ یوں تو اس شہرت اور مقبولیت میں کچھ اور شاعر بھی انکے حصّے دار ہیں لیکن ارباب بصیرت بھی عام ہیں۔ یہاں منوّر رانا اس اعتبار سے بھی ہم عمروں اور ہم جیسوں سے منفرد ٹھرتے ہیں کہ مشاعروں سے وابستہ مروّجہ بدعنوانیوں سے نہ صرف یہ کہ اپنا دامن عافیت داغدار ہونے سے محفوظ رکھے ہوئے ہیں بلکہ ان بدعنوانیوں پر خود بھی اپنے اشعار کے فرسے سے کھُلی چوٹیں کرتے ہیں۔ مثلاً

وہ جن کو آبروئے غزل تک کہا گیا
وہ بھی غزل سنا کے پرانی چلے گئے

ارباب خبر و نظر جانتے ہیں کہ محض گلے، ترنم، اداکاری، مستی جزباتیت، مذہبی جزبوں کا استحصال اور سیاسی نعرے بازیوں کے بل بوتے پر دنیا بھر میں مشاعرے لوٹتے پھرنے والوں کی جھولی میں پانچ دس پٹی پٹائی غزلوں، گیتوں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا جن کے سہارے وہ بڑے بڑے مشاعروں کے پنڈالوں کی چھتیں اڑاتے پھرتے ہیں..... شاعروں کی ایک اور مروّجہ بدعت نظامت ہے۔ مسند نظامت پر متمکن ہو کر ناظم مشاعرہ غیر ادبی چٹکلوں اور بازاری لطیفوں کی مدد سے مشاعرے کے ماحول کو مسلسل غیر سنجیدہ بنائے رکھتا ہے اور اپنی مضحکہ خیز حرکتوں سے سامعین مشاعرہ کو اپنی جانب متوجہ رکھنے کی شعوری کوشش کرتا رہتا ہے۔ بقول منوّر راناؔ

لہو میں رنگ کے چھینٹے ملائے جاتے ہیں
مشاعروں میں لطیفے سنائے جاتے ہیں

لطف کی بات یہ کہ منوّر رانا خود ایک کامیاب ناظم مشاعرہ بھی ہیں جو نظامت سے وابستہ مروّجہ بدعتوں کا قلع قمع کرنے کے لئے اپنے طنزیہ اشعار کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ اور زمانہ جانتا ہے کہ وہ گلے بازی، اداکاری نعرے بازی اور لطیفہ گوئی کے بغیر محض اپنے اشعار کے بل بوتے پر نام نہاد مشاعرہ بازوں کے مقابلے میں کئی گنا کامیاب ہیں اور مقبول بھی۔ عوام اور خواص دونوں میں یکساں طور پر۔

مشاعروں میں شاعری کے ساتھ جو کھلواڑ کی جا رہی ہے اس پر منوّر

رانا کا دلکش ناقدانہ تجزیہ انکے درجہ ذیل اشعار میں ملاحظہ کیجیے۔

غزل تو پھول سے بچّوں کی میٹھی مسکراہٹ ہے
غزل کے ساتھ اتنی رستمی اچھی نہیں لگتی
اظہار عشق غیر ضروری تھا آپ نے
تشریح کرکے شعر کو کمزور کر دیا
میں نے لفظوں کو برتنے میں لہو صرف کر دیا
آپ تو صرف یہ دیکھیں گے، غزل کیسی ہے
ستارے، چاند، کلیاں، پھول، پھلواری نہیں لاتے
غزل میں ہم کبھی بھرتی کی گلکاری نہیں لاتے
مری تحریر بھی میری طرح منہ پھٹ ہے اے رانا
خدا کا شکر ہے شمشیر کو خامہ نہیں لکھا
سرقے کا کوئی داغ جبیں پر نہیں رکھتا
میں پاؤں بھی غیروں کی زمیں پر نہیں رکھتا
خود سے چل کر نہیں یہ طرز سخن آیا ہے
پاؤں دابے ہیں بزرگوں کے تو فن آیا ہے

اور بزرگوں کے پاؤں دابتے دابتے نوبت یہ اس جا رسیہ کہ۔

بڑے بڑوں کو بگاڑا ہے ہم نے اے رانا
ہمارے لہجے میں استاد شعر کہنے لگے

طنز دراصل منوّر رانا کی شخصیت کا جزو لاینفک ہے لہٰذا ان پر پھبتا بھی خوب ہے۔ انکی بلند قامتی، فربہی، بلند آہنگی گونجدار کھنکتی ہوئی آواز اور واشگاف لہجہ ان تمام عناصر کی متوازن اور دلکش آمیزش سے تشکیل پانے والی انکی شخصیت کی دلکشی اور جاذبیت مشاعروں میں انکی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا گراف اوپر اٹھنے اور انھیں بین الاقوامی شہرت و ناموری دلانے میں کلیدی اہمیت رکھتی ہے۔ ایک اور اہم چیز جو منور رانا کو ان کے ہم عصروں میں منفرد، ممتاز اور معتبر کرتی ہے انکی شاعری کے موضوعات بوقلمی، رنگارنگی، تنوع، انفرادیت اور کثرت ہے۔ دلچسپ اور یہ ہے کہ منوّر رانا نے موضوعات کی تلاش و جستجو میں اندیکھی خلاؤں میں زقندیں نہیں بھری۔ آسمانوں کی بلندیوں میں تھگلیاں نہیں لگائیں۔ سمندروں کی تہیں نہیں کھنگالیں۔ پاتالوں میں غوطے نہیں لگائے، تخیلات کی بیکرانیوں میں پروازیں نہیں کیں بلکہ انھوں نے اپنی دنیا، اپنی زمین، اپنے ملک، اپنے شہر، اپنے محلے، اپنی گلیوں، اپنے گھر کے اندر اور باہر یہ پیش آئے دن لحہ بہ لحہ، پل بہ پل رونما ہونے والے حالات، واقعات اور معاملات نیز انکی تغیر پزیری اور رنگا رنگی کو اپنے شعر کا موضوع بنایا ہے، نیز برتے برتائے اور مروّجہ موضوعات کو نئے پہلو اور نئے انداز سے برت کر انھیں نیا پن اور انفرادیت عطا کی ہے۔ اردو غزل جو لغوی اعتبار ہی سے نہیں اپنے کم و بیش تمام سرمایا کی شناخت کے اعتبار سے ہے ہی معاملات حسن و عشق کی تغیر، حسن کی رنگینیوں اور عشق کی سرمستیوں کی جلوہ فرمائیوں کو مختلف زوایہ ہائے نگاہ سے دیکھنے دکھانے کے لیے تو غزل میں آفاقی وسعتیں ہیں لیکن ماں، بیٹی، بہن، باپ، بھائی اور بیوی جیسے تقدس مآب رشتوں کی ترجمانی کے لئے غزل میں گنجائش ہی کہاں ہے۔ اس میدان میں منوّر رانا تن تنہا وہ مرد میدان نظر آتا ہے جس نے ان موضوعات کو بھی اس کامیابی کے ساتھ برتا ہے کہ اکثر اشعار پر احساس جھنجھنا اٹھتا ہے۔ رگ وپے میں خون کے بہاؤ کے ساتھ پاکیزہ جذبے ٹھاٹھیں مارنے لگتے ہیں۔ دل بے ساختہ بھر آتا ہے، آنکھیں چھلک پڑتی ہیں۔ انکے غزلیہ اشعار میں بیٹی کی رخصتی کے وقت باپ کا پھوٹ پھوٹ کر رونا، بچوں کا یونیورسٹی فیس کے لیے خدا سے پیسے طلب کرنا، دوست کی بیوفائی پر گریہ، جیسی بہن کا خودکشی کر لینا، بیوی کا شوہر کے غم کو زیور کی طرح محفوظ رکھنا یہ قطعی نجی اور گھریلو موضوعات منوّر رانا کی غزل کی خاص پہچان بن گئے ہیں۔ انھوں نے ماں کو موضوع بنا کر بکثرت شعر کہے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

منوّر ماں کے آگے یوں کبھی کھل کر نہیں رویا
جہاں بنیاد ہو اتنی نمی اچھی نہیں ہوتی
سسکیاں اس کی نہ دیکھی گئیں مجھ سے رانا
رو پڑا میں بھی اسے پہلی کمائی دیتے
اب بھی چلتی ہے جب آندھی کبھی غم کی رانا
ماں کی ممتا مجھے آنچل میں چھپا لیتی ہے
محبت کرتے جاؤ بس یہی سچی عبادت ہے
محبت ماں کو بھی مکّہ مدینہ مان لیتی ہے
روشنی دیتی ہوئی سب لالٹینیں بجھ گئیں
خط نہیں آیا جو بیٹیوں کا تو مائیں بجھ گئیں

علامہ اقبال نے ہند کے شاعروں کے اعصاب پر عورت کے سوار ہونے پر طنز کیا ہے۔ منوّر رانا کے ہاں وہ عورت کوئی اور نہیں، انکی ماں ہے۔ ویسے انھوں نے بیوی بیٹیوں پر بھی شعر کہے ہیں۔ ایک ایک شعر ملاحظہ کیجیے۔

وہ تو بیوی ہے جو دکھ سکھ میں صبر کرتی ہے
ورنہ بازار کی عورت تو محل مانگے ہے
رو رہے تھے سب تو میں بھی پھوٹ کر رونے لگا
ورنہ سمجھو کہ بیٹیوں کی رخصتی اچھی لگی

بے ہنگم ہندوستانی سیاست پر اردو کے سبھی شعراء نے کچھ نہ کچھ کہا ہے۔ منوّر رانا کے درج ذیل اشعار میں طنز کی کاٹ ملاحظہ کیجیے۔

سیاسی وار بھی تلوار سے کچھ کم نہیں ہوتا
کبھی کشمیر جاتا ہے، کبھی بنگال کٹتا ہے
بڑا گہرا تعلق ہے سیاست سے تباہی کا
کوئی بھی شہر جلتا ہے تو دلّی مسکراتی ہے
مناسب ہے کہ پہلے تم بھی آدم خور بن جاؤ
کہیں سنسد میں کھانے کوئی چاول دال جاتا ہے

بہت ممکن ہے اب میرا چمن ویران ہو جائے
سیاست کے شجر پر گھونسلے الّو بناتے ہیں

اور ملک میں روزمرّہ کا معمول ہو جانے والی فرقہ واریت پر منور راناؔ کے یہ چند حقیقت پسندانہ اشعار بھی ملاحظہ کیجیے۔

شہر کو فرقہ پرستی کی وبا کھا جائے گی
یہ بزرگوں کی کمائی داشتہ کھا جائے گی
جسے بھی جرمِ غدّاری میں تم سب قتل کرتے ہو
اسی کی جیب سے کیوں ملک کا نقشہ نکلتا ہے
ہر اک خوشبو کا جھونکا اب ہمیں کافور لگتا ہے
کسی بھی شہر سے گزریں وہ بھاگلپور لگتا ہے

اور تصویر کا یہ دوسرا رخ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

پیدا یہیں ہوا ہوں، یہیں پر مروں گا میں
وہ اور لوگ تھے جو کراچی چلے گئے
میں مرونگا تو یہیں دفن کیا جاؤں گا
میری مٹی بھی کراچی نہیں جانے والی

یہ ہے بنگال کے امر بردمومن کی مجاہدانہ آواز جس نے بنگال کے ساتھ ساتھ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات وجزبات کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا ہے۔ منور راناؔ کی شاعری رنگ و آہنگ کی انفرادیت اور بوقلمونی کی کہاں تک مثالیں دیجیے کہ ان کا ہر شعر اپنے آپ میں ایک شان انفرادیت لیے ہوتا ہے۔

چلتے چلاتے چاہتا ہوں کہ منور راناؔ کی نثری تحریروں سے بھی چند ایسی مثالیں پیش کرتا چلوں جو نثر نگاروں میں بھی انہیں ایک مقام انفرادیت عطا کرتی ہیں ویسے بھی اردو میں نثر لکھنے والے ہر دور میں بہت کم رہے ہیں۔ سہل پسندی اور تن آسانی کے اس دور میں تو نثر نگاروں کا فقدان سا ہوتا چلا ہے۔ بالخصوص ہلکی پھلکی، شگفتہ اور لطیف نثر لکھنے والے تو ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔ لے دیکر ہندوستان میں مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم کے نام نظر آتے ہیں۔ پاکستان میں مشتاق احمد یوسفی ہیں جو افشانیہ نگاری کا بھرم قائم رکھے ہوئے ہیں۔ مقام مسرت ہے کہ منور راناؔ نے پہلے رسائل وجرائد میں شائع ہونے والے اپنے ہلکے پھلکے اور شگفتہ مضامین کے وسیلے سے اور پھر یکمشت ایک مکمل مجموعہ ہائے مضامین ''بغیر نقشے کا مکان'' پیش کر کے اس کمی کو پورا کرنے کی سعی مشکور کی ہے۔ انکی دو تازہ ترین نثری تصانیف ''لکھنو سے گزرتے ہوئے'' اور ''سفید جنگلی کبوتر'' کے بھی منظر عام پر آجانے کی خبریں گرم ہیں۔ منور راناؔ کے مضامین قاری کو ایک نئے خوشگوار اور چٹخارے دار ذائقے سے روشن کراتے ہوئے انکے کامیاب نثر نگار ہونے کے روشن امکانات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ شاعری کی طرح نثر میں بھی منور راناؔ کے مشاہدے کی باریک بینی، مطالعے کی وسعت، تجربات کی کثرت اور اظہار کی ندرت پر مضمون کے ہر جملے سے جھلکتی ہے۔ زندگی کے روزمرّہ معاملات اور محولات پر بھی انھوں نے بڑے دلچسپ ریمارکس کیے ہیں۔ مثال کے لیے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں۔

''ادب کھیل کی طرح نہیں ہوتا کہ جسم اور سانسوں پر کسی رئیس کا قبضہ برقرار رہتا ہے۔ ادب تو اس مقدس ماں کی طرح ہوتا ہے جس کی چھاتی سے ابلتا ہوا دودھ مسلک و مذہب کی قید سے آزاد ہر تہیے بچّے کے پیاسے ہونٹوں تک پہنچنے کے لیے بیتاب رہتا ہے۔''

''فراقؔ کے جنسی ضدی پن، فاروقی کا ادبی بچپنا جس کے تحت وہ فراقؔ کے کام کی ڈرک احمد مشتاقؔ کو بھجوا دیتے ہیں۔''

''سماجی مجبوریاں امراؤ جان اور ڈاکو پتلی بائی بناتی ہیں اور معاشی مجبوریاں نقاد پیدا کرتی ہیں۔''

''اردو کو جوشؔ کے گھر کی لونڈی بھی کہا جاتا رہا ہے۔ یہی لونڈی جب ڈاکٹر مظفر حنفی کے ایوان غزل میں آئی تو ایوان غزل تک آنے والے ہر راستے پر علم اور فکر کے چراغ روشن کر دیئے۔''

''میں ایسے اردو والوں کے بیچ اٹھتا بیٹھتا ہوں جو منہ میں تین روپے کا پان دبائے ڈیڑھ روپے کے پھٹیچر اخبار کو ہوٹلوں میں ایک دوسرے سے چھین لینے میں مصروف رہتے ہیں۔''

''اس ملک میں تو حکومت بھی بابری مسجد کی شہادت کے بعد صدر مملکت کو آگاہ کرتی ہے۔''

''اگر قلم ان ذمہ داریوں کا ترجمان نہیں ہے تو بہتر ہوگا کہ اسے شلواروں اور پاجاموں میں کمربند ڈالنے کے لیے استعمال کیا جائے۔'' اور آخری اقتباس.....

''جناب کلیم الدین شمسؔ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھیں ہر آدمی اپنا آدمی سمجھتا ہے بلکہ کئی عورتیں بھی انھیں اپنا آدمی سمجھ کر زندہ ہیں۔''

ان اقتباسات کی رو میں منور راناؔ کا ایک صاحب طرز طنز ومزاح اور افشانیہ نگار کی حیثیت سے اپنی ایک مستحکم ثقافت کے ساتھ افق ادب پر جلوہ گر ہو رہے ہیں۔ یہ خوشگوار شہ سرزمین بنگال کی ناموری میں مزید اضافوں کا موجب ہوگا اردو ادب تو انکی نگارشات سے مالا مال ہوگا ہی...!!

## ربّ علا

وہ بچپن، لڑکپن، جوانی، بڑھاپا
بہت کم ہے کھویا، بہت کچھ ہے پایا
کبھی دل کسی کا نہیں ہے دُکھایا
میں کیونکر کروں شکر، ربِّ علا کا

**حافظ محمد احمد** (راولپنڈی)

# خلوص کی رسمیں

## عرفان صدیقی

(بھارت)

**اگر** شاعر کے کلام پر تاثر کا اظہار کرتے ہوئے صرف ایک جملہ کہنے سے کام چل سکتا تو میں کہتا کہ منوّر رانا کی شاعری ایک سادہ، بے ریا، اور حساس دل پر زندگی کی واردات کے اوّلین اور فطری ردّعمل کا سچا اظہار ہے۔لیکن معاملہ یہ ہے کہ اس جملے کے معنوی خطوط میرے ذہن میں جس طرح روشن ہیں اسی طرح انھیں دوسروں پر واضح کرنے کے لئے کچھ اور باتیں کہنے کی بھی ضرورت ہے،سوان سطروں کے وسیلے سے میں اس تاثر کو جورانا کے شعروں نے مجھ پر واضح کیا ہے اوروں تک پہنچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔یہ ایک ذاتی تاثر ہے اور اسی لئے اس کو اپنی نوعیت میں ویسا ہی ہونا چاہئے جیسا خود اس شاعر کا تخلیقی ردّعمل ہے فطری اور بے تصنع۔

راؔنا کی غزلیں سن کر اور ان کا مجموعہ پڑھ کر میرا پہلا احساس یہ رہا ہے کہ شاعر نے زندگی کے جن تجربوں کو برتا ہے اور جن حقیقتوں کا مشاہدہ کیا ہے ان پر اپنا ردّعمل اپنے اشعار میں پہلی، اصلی اور فطری شکل میں ظاہر کیا ہے۔اس ردّعمل کو بے وجہ تراشے، بدلے یا بگاڑے بغیر۔بہ ظاہر یہ بات غیر اہم سی لگتی ہے لیکن ذرا سوچئے تو اس کے لئے بڑی شاعرانہ جرأت اور تہمت اور خود اعتمادی کی ضرورت ہوتی ہے۔

رانا کی غزلوں کے بیشتر اشعار تجربات اور واردات پر اس اولین ردّعمل (Initial Response) کی مثال ہیں، جسے بہت دنوں سے غزل کی شاعری نے نظر انداز کر رکھا ہے۔شاید شعوری طور پر، کہ عصری تہذیب کی طرح عصری شاعری میں بھی بہت سے لوگ اپنے اصل ردّعمل کو چھپانا اور اس کی شکل بدل کر اسے سجا سنوار کر پیش کرنا کمال ہنر سمجھتے ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ زندگی کی طرح شاعری سے بھی جذبوں کی تازگی، سادگی اور سچائی کا حسن کم ہوتا جا رہا ہے۔یعنی یہ ایک رنگ بہت ہی اچھا رنگ، ہم نے جان بوجھ کر اپنی تصویر سے کم کر دیا ہے۔لیکن راؔنا اپنے جذبوں کے اظہار میں سچّا نظر آتا ہے اور اپنی واردات کے سامنے سرخرو۔وہ اپنی خوشی اپنے غصےّ، اپنی نفرت، اپنی بیزاری، اپنی محبتوں، اپنی حسرتوں، اپنی خواہشوں پر استعاراتی تہہ داری اور پیچیدگی کے پردے نہیں ڈالتا، انھیں برملا پیش کرتا ہے۔اس کے جذبوں اور رویےّں کو رد بھی کیا جا سکتا ہے، قبول بھی، لیکن اس پر تخلیقی ریاکاری کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔

وہ شئے جو انسانوں کو گھر، کنبے، قبیلے، بستی سماج اور دنیا کی اکائیوں سے وابستہ رکھتے ہیں۔زندگی کے بڑھتے ہوئے تناؤ اور تضادات کے اثر سے کتنے بدلتے جا رہے ہیں۔رانا کو اس کا شدت سے احساس ہے اور جب وہ اپنے دل اور اپنی آنکھوں میں بسے ہوئے گاؤں کا روپ حقیقی دنیا کے پس منظر میں بدلتا ہوا، بگڑتا ہوا اور اپنے خوابوں سے دور ہوتا ہوا دیکھتا ہے تو اس کا ردّعمل کبھی بہت تیکھا اور کبھی بہت حزن آمیز ہو جاتا ہے۔

بڑے شہروں میں رہ کر بھی برابر یاد کرتا تھا
وہ اک چھوٹے سے اسٹیشن کا منظر یاد کرتا تھا

تو اب اس گاؤں سے رشتہ ہمارا ختم ہوتا ہے
پھر آنکھیں کھول لی جائیں کہ سپنا ختم ہوتا ہے

رستے ہوئے زخموں کو دوا بھی نہیں ملتی
اب ہم کو بزرگوں سے سزا بھی نہیں ملتی

پردیس جانے والے کبھی لوٹ آئیں گے
لیکن اس انتظار میں آنکھیں چلی گئیں

کچا سمجھ کے بیچ نہ دینا مکان کو
شاید کبھی یہ سر ہی چھپانے کے کام آئے

جہاں ملا انھیں موقع وہیں اجاڑ دیا
مرے بڑوں نے گھروندا مرا بگاڑ دیا

تمہیں اے بھائیو یوں چھوڑنا اچھا نہیں لیکن
ہمیں اب شام سے پہلے ٹھکانہ ڈھونڈ لینا ہے

ان شعروں میں گذرے منظروں کا گہرا دکھ ہے لیکن کوئی منفی یا مریضانہ تاسف نہیں۔بدلتے ہوئے منظر اس کے لئے اجنبی ہیں۔مگر وہ ان سے خوفزدہ نہیں ہے۔ان میں اپنی ذات کے رشتے اور حوالے تلاش کر رہا ہے :

لکھی ہوئی ہے مقدر میں موت پانی کی
یہی سبب ہے کہ ہم کشتیوں میں رہنے لگے

سفر میں جو بھی ہو رخصت سفر اٹھاتا ہے
پھلوں کا بوجھ تو ہر اک شجر اٹھاتا ہے

جو دھوپ دھوپ میں گرم سفر نہیں رہتا
تو میرے بچوں کی قسمت میں گھر نہیں رہتا

رانا کے اشعار میں ترک سکونت (میں اسے ہجرت نہیں کہوں گا) کا تصور اس سماجی اور معاشی تبدیلی کا عطیہ ہے جس کے نتیجے میں چھوٹے چھوٹے سادہ اور خوبصورت گاؤں اور بستیاں اجڑتی جاتی ہیں اور شہر بڑے سفاک تر اور گنجان ہوتے جا رہے ہیں۔مشینی زندگی کے عفریت نے معصومیت اور سادگی کو نگل لیا ہے۔اور قدروں کے ایسے نظام کا آغاز کیا ہے جس سے مٹی اور رشتوں کی خوشبو کا شیدائی مانوس نہیں لیکن اسے قبول کرنے پر مجبور ہے :

ہوائیں چپکے چپکے کان میں آ کر یہ کہتی ہیں

پرندوں اڑچلو اب آب ودانا ختم ہوتا ہے
روتے ہوئے بچھڑنے کی فصلیں چلی گئیں
شہروں سے اب خلوص کی رسمیں چلی گئیں
مسلسل دھوپ میں چلنے کا یہ انجام ہے رانا
کہ اب پیڑوں کے سائے بھی برے معلوم ہوتے ہیں
برباد کر دیا ہمیں پردیس نے مگر
ماں سب سے کہہ رہی ہے کہ بیٹا مزے میں ہے

رانا کی غزلوں میں ایک ایسے برہم نوجوان کی آواز سنائی دیتی ہے جس کا لہو ابھی زندہ ہے۔ یہ برہمی یوں ہے کہ وہ اپنی عزیز قدروں کو تباہی کی زد پر دیکھ رہا ہے۔ یہ جنگ شاید وہ ہار ہی جائے کہ یلغار شدید ہے اور وہ تنہا۔ لیکن تنہا لڑنے میں جو سرفرازی ہے اسے اس کا پورا احساس ہے اور اس پر ناز بھی۔ اسکے لہجے کا بانکپن اسکے اس معرکے کو ایک نیا حسن دیتا ہے:

جو بھی آتا ہے وہ خالی نہیں جاتا
مایوس مرے در سے سوالی نہیں جاتا
قتل بھی ہوگا ہمارا تو یہیں پر ہوگا
فیصلہ جو بھی ہو دشمن کی زمیں پر ہوگا
تم نہ سمجھو گے میرے سر کا جنوں
ٹوٹ جائے گا، خم نہیں ہوگا
ہے روح بیقرار ابھی تک یزید کی
وہ اسلئے کہ آج تک پیاسا مزے میں ہے
یہ سوچ کر مجھے لے جاؤ دار کی جانب
تمہیں بناؤ گے اک دن مجسّمہ میرا

رانا کے لہجے کا طنز اور تیکھا پن اس کی غزلوں کی ایک خاص پہچان ہے۔ یہ ایک ایسے تنہا لیکن حوصلہ مند شخص کے تیور ہیں جو حالات کے جبر کے باوصف، اپنے رویوں پر نازاں ہے۔ یہ ایسے شخص کا ردعمل ہے، جسے سیاہ کو سیاہ کہنے پر اصرار ہے:

گوتم کی طرح گھر سے نکل کر نہیں جاتے
ہم رات میں چھپ کر کبھی باہر نہیں جاتے
راہِ حق میں منزل دار و رسن آنے تو دو
جو زبان رکھتا ہے وہ بھی بے زباں ہوجائے گا
دنیا اگر مذاق بدل دے تو اور بات
اب تک تو جھوٹ بولنے والا مزے میں ہے

اس طرح کے اشعار میں رانا کا انداز اکثر راست اور بیانیہ ہوجاتا ہے لیکن ایسا لگتا ہے، جیسے اس نے اپنی شدت احساس کو نمایاں کرنے کیلئے جان بوجھ کر تخلیقی تہہ داری سے اجتناب کیا ہے۔

بچھڑتی چاہتوں اور بیتے موسموں سے اس کے جذباتی تعلق نے رانا کے لہجے کو گداز، افسردگی اور کیفیت دی ہے جو اس کے بہت سے شعروں کو حسن اور تاثر عطا کرتی ہے۔ وہ زندگی کے نئے مناظر سے دوچار ہے۔ لیکن اپنے خوابوں سے اس نے اپنا رشتہ قائم رکھا ہے۔ یہ اس کی شاعری کا خوبصورت ترین پہلو ہے :

ذرا سی بات پہ آنکھیں برسنے لگتی تھیں
کہاں چلے گئے موسم وہ چاہتوں والے
ساتھ رہنے سے بھی کھل جاتے ہیں رشتوں کے کنول
بندشیں رونے لگیں مجھ کو رہائی دیتے
کیا چمن کیا فصل گل، سب کچھ نہاں ہوجائے گا
بجھ گئیں آنکھیں تو ہر منظر دھواں ہوجائے گا
بچھڑ کے تجھ سے بہت مضمحل ہے دل، لیکن
کبھی کبھی تو یہ بیمار سر اٹھاتا ہے

☆

## ''پسِے ہوئے طبقات''

منور رانا کی شاعری اور نثر میں خاص طرح کا ردھم پایا جاتا ہے۔ اُن کی سوچ اور عمل بھی قریب سے دیکھنے والے اس اَمر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ منور رانا ایک دردمند دل کے سچے تخلیق کار ہیں جو انسانوں بالخصوص پسِے ہوئے طبقات کی بہتری کے لیے بہت کچھ کرنے کے خواہش مند ہیں۔ بھلے ہی اُن کی کاوش سے کوئی انقلاب رونما ہوتا دکھائی نہیں دیتا مگر کمزور آواز میں توانائی کی جو لہر اُنہوں نے پیدا کردی ہے اُس کے اثرات کو دبانا یا اُن سے صرفِ نظر کرنا آنے والے کارپردازان کے لیے آسان نہ ہوگا۔

بلراج کومل

# تین شہروں کا چوتھا آدمی

پروفیسر سید مجاور حسین رضوی
(بھارت)

''بغیر نقشے کا مکان'' پڑھتے ہوئے نظر انتساب پر ٹھہر گئی۔ یہ انتساب شہر کلکتہ کے نام ہے کلکتہ میں خوبی یا خرابی ہو مگر وہاں ہر چیز میں نقشہ ہے اور بمبئی و کراچی میں تو لوگوں کے پیچھے بھیڑ لگ جاتی ہے لیکن کلکتہ میں ہر سیاسی لیڈر نقشہ کم دیکھتا ہے اور نقشہ بازی زیادہ کرتا ہے، حالانکہ اس کا پہلا مضمون الہ آباد شہر سے شروع ہوتا ہے، الہ آباد کا نثری قصیدہ اور یہاں کے بہت سارے افراد کا تذکرہ پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ سید صاحب نے الہ آباد میں کافی وقت گذارا ان کی تحریر میں ہلکا سا طنز کا نشتر ہوتا ہے، جس کی چبھن محسوس کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا ہے۔ اس طنز میں لطافت بھی ہے لیکن کہیں کہیں یہ طنز بے محل بھی ہے مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب بنیادی طور پر شاعر ہیں جب خراب ہوئے تو نقاد ہو گئے ......جیسے پچھلے زمانہ میں زمینداروں کے ستائے ہوئے کسان اور مزدور ڈاکو بن جاتے تھے (حالانکہ اس مثال سے میں متفق نہیں ہوں کیوں ڈاکوؤں کے دل میں یک نرم گوشہ بھی ہوتا تھا لیکن نقاد کے پاس تو دل ہی نہیں ہوتا)''

کسی مخصوص لمحہ کی یادگار یہ عبارت ہے ورنہ ابھی حال ہی میں رانا صاحب نے ٹھیک اسی انداز میں مشاعروں کے شعراٗ کا مذاق اڑایا ہے جس انداز میں حالؔی غزل تو شعراٗ کا مذاق اڑایا کرتا تھے میں ذاتی طور پر اپنے لئے یہ پہلے عرض کردوں کہ میں ادب کا طالب علم ہوں نقاد بالکل نہیں ہوں ویسے اس کائنات میں ہر ذی روح کے پاس تنقیدی شعور ہوتا ہے اور ادب کا جسے بھی چسکا لگ جائے وہ کبھی نہ کبھی تنقید کرنے ہی لگتا ہے مثلاً اسی صفحہ ۲۳ پر ڈاکٹر مظفر حنفی کے بارے میں لکھتے ہیں اردو کو جوشؔ کے گھر کی لونڈی بھی کہا جاتا رہا ہے یہی لونڈی جب ڈاکٹر مظفر حنفی کے ایوان غزل میں آئی تو ایوانِ غزل تک آنے والے ہر راستہ پر علم اور فکر کے چراغ روشن کر دیئے۔

تنقید کے معنی تنقیص نہیں ہیں توصیف بھی ہیں تنقید محاکمہ بھی ہے اور تخلیق تو بھی منور علی کو کس طرح کے نقادوں سے شکایت ہے کیا وہ حالؔی، آزاد، شبلی، آل احمد سرور احتشام حسین کے لئے لکھ رہے ہیں۔ اگر کسی نقاد نے ان کا دل دکھایا تو انھیں صراحت کرنی چاہئے تھی انھوں نے ایک شرارتی لڑکے کی طرح سے غلیل چلانا شروع کر دیا بغیر یہ سوچتے ہوئے کہ ان کا نشانہ کون ہے اور وہ کسے نشانہ بنا رہے ہیں اور کسے پتھر لگا ہے ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے کچھ ایسے احباب ہیں جو مشاعروں میں بہت مقبول ہیں اور ان کے خیال میں نقاد ان کا تذکرہ نہیں کرتے ہیں۔

وہ کبھی کبھی ایسی زبان بھی لکھ جاتے ہیں جو ان کے شایانِ شان نہیں ہے مثلاً صفحہ ۲۰ پر لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب نے شاد عارفی پر بے مثال work کیا ہے۔'' یہ ''work'' کیا کیا ہے؟ لیکن کہیں کہیں وہ اتنی خوبصورت زبان لکھتے ہیں کہ بے اختیار آل احمد کے نثر پارے یاد آنے لگتے ہیں مثلاً:

''یوں بھی جس کے باپ سے دوستی ہو اس کی بیٹی سے کیا دوستی کرنا!''

انھوں نے بعض بہت اچھے خاکے لکھے ہیں مثلاً ثقلین حیدر پر پڑھتے ہوئے کون اپنے آنسوؤں کو روک سکتا ہے۔ اسی طرح انھوں نے ''عمر بھر دھوپ میں پیر جلتا رہا'' کے عنوان سے اپنے والد کو نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے وہ بہت ہی متاثر کن ہے۔ ان کے زیادہ تر خاکوں میں رنگ و آہنگ ہے لیکن مقامی اثرات غالب ہیں چنانچہ جب تک قاری رشید صاحب یا حکیم صاحب سے واقف نہ ہو، اس وقت تک ان کے بعض مضامین کا لطف ادھورا رہتا ہے۔ بعض مضامین کے عنوانات بہت ہی معنی خیز بھی ہیں اور گدگدانے والے بھی۔ مثلاً ''اُڑا دیئے کبوتر تو شمار کیا کرنا''، ''شہروں میں کوئی چاند کو ماما نہیں کہتا''، ''جلتے توے کی مسکراہٹ''، ''تمام رات نہاری کا انتظار کیا'' وغیرہ۔

ان کا دوسرا مجموعہ سفید جنگلی کبوتر''، ''بغیر نقشے کا مکان'' کے تقریباً چار برس بعد شائع ہوا اس میں ایک تنقیدی مضمون ہے یعنی ''غزل کا گھر کراچی ہے نہ دلی'' اس میں تنقید بھی ہے اور تحقیق بھی ہے۔

ان کے تنقیدی رویئے کے بارے میں انھیں کے کچھ فقرے درج کئے جا رہے ہیں:

''اردو ادب کی صنف غزل کا کوئی حصہ بنگال کی شاعرات کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے بعد بنگال کی کسی شاعرہ سے ملاقات نہیں ہوتی ہے بلکہ جان گلکرسٹ کا ذکر آ جاتا ہے جن میں جو بھی خوبی یا خرابی رہی ہو بہر حال وہ کسی طرح شاعرہ نہیں تھے۔ آگے چل کر انھوں نے مغربی بنگال کو نظر انداز کئے جانے کا شکوہ کیا ہے یہ درست نہیں ہے اس لئے کہ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات کے ساتھ ابوالکلام آزاد کے الہلال البلاغ کے تذکرہ سے اردو ادب کی کوئی تاریخ خالی نہیں ہے۔ مولانا کا مستقر بھی کلکتہ ہی رہا۔ یہ دونوں بھی کلکتہ سے ہی نکلے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اور اب احمد سعید ملیح آبادی کلکتہ سے ہی نسبت رکھتے ہیں۔ امتحانوں میں غالب کے سفر کلکتہ کا ذکر ضرور آتا ہے۔ انشاء اللہ خاں انشاء پر عابد ہشیاری نے پی ایچ-ڈی کی ان کے مرشد آبادی ہونے پر زور بھی دیا لیکن اس کو کیا کہا جائے تو کہ انشاء خود کو دہلی ہی سے نسبت دیتے رہے۔''

صفحہ ۲۴ پر لکھتے ہیں:

''مغربی بنگال کا بیشتر ادب کالی میں چھپی جھیل ہو کر رہ گیا۔''

خاص طور سے مغربی بنگال کے شعری چاند کو جانبدارانہ تنقید اور غیر ذمہ دارانہ تحقیق کا گہن لگ گیا۔ انھوں نے صفحہ ۲۵ پر شعرا اور ادیبوں کی نسبت پر طنزیہ فقرے لکھے ہیں۔ جوش کراچی جا کر بھی ملیح آبادی رہے، حفیظ لاہور میں رہ کر جالندھری رہے۔ کراچی میں رہ کر ادیب سہارن پوری رہے، جلالی کے قمر جلالوی رہے۔ لوگ اپنی پہچان کے لئے خود کو کسی جگہ سے نسبت دیں تمام شاعر اور ادیب اردو کی جمہوریت کے شہری ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ غالباً اپنی کم علمی کے سبب سے مجھے رضا علی وحشت کے بعد نہال ہی کا نام یاد آرہا ہے۔ پرویز شاہدی عظیم آبادی ہی شمار کئے گئے البتہ کتنا اچھا ہوا گر دور حاضر میں مغربی بنگال میں اردو کے فروغ پر نہ صرف یہ کہ روشنی ڈالی جائے بلکہ اسے مشعل راہ بنالیا جائے۔

صفحہ ۱۳۱ر سے موصوف نے مست کلکتوی کا ذکر کیا اور جو اشعار ان سے منسوب کئے ہیں جو ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے کالو قوال اور پیارو قوال کا حوالہ دیا ہے قوالی سے بے انتہا دلچسپی کے سبب بڑے اعتماد سے یہ لکھا جا سکتا ہے کہ یہ حضرات اپنی دھن کے لیے اور رنگ محفل دیکھتے ہوئے ایک ہی بحر کے اشعار میں کسی شاعر کا مصرعہ اول کسی شاعر کے دوسرے مصرع سے وابستہ کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ مستؔ کلکتوی کا شعری سرمایہ کہیں بھی اور کسی شکل میں تحریری صورت میں ہو تو یقیناً اس کی اشاعت بہت گرانقدر ہوگی اسے پلکوں پر جگہ دی جائے گی تحقیق میں:

دعویٰ کوئی درست نہیں بے دلیل کے
اور دلیل کے معنی ہیں دستاویزی ثبوت

بہر حال یہ مضمون اپنے لہجہ کی خطابت برہمی اور للکار کی وجہ سے حافظہ میں محفوظ وہ جانے والے مضامین میں سے ایک ہے، اور مغربی بنگال میں اردو کے فروغ کے سلسلہ کا بہت اچھا تجزیہ ہے۔

'ہم اپنے جسم میں بکھرے ہیں ریت کی صورت' جناب سالک پر لکھا گیا۔ ایک بار کسی نے حیدرآباد میں یہ شعر سنایا تھا:

چاہا تھا ٹھوکروں میں گذر جائے زندگی
لوگوں نے سنگِ راہ سمجھ کر ہٹادیا

میں نے دریافت کیا کہ یہ شعر کس کا ہے تو بتایا گیا کہ سالک کا ہے اس شعر کے خالق کے بارے میں جس خاکہ کی تخلیق ذہن نے کی تھی اس میں اس شعر نے آب و رنگ بھر دیا اور جب یہ مضمون پڑھا تو بے اختیار منھ سے واہ نکل گئی اس لئے کہ چند لمحوں کے لئے مجھے یہ محسوس ہوا کہ جیسے میں سالک صاحب کے ہمراہ بیٹھا ہوا ہوں۔ ان سے باتیں کر رہا ہوں۔ بڑی دیر تک ان کے ''لال سلام'' نیاز حیدر کے لال سلام کی طرح کانوں میں گونجتے رہے۔

ان کا ایک مضمون ''میرے اندر کا مسلمان نہیں مرتا'' اس اعتبار سے دلچسپ ہے کہ قاری اس اختتام کی توقع نہیں کرتا اس کے بعد اگر میرا بھی ایک بھائی لڑکپن میں نہیں مرتا بہت ہی متاثر کن ہے کوئی سنگ دل ہی اپنے آنسو روک سکتا ہے۔

وہ خاکہ نگاری سے واقف ہیں انھوں نے باضابطہ کردار کی تعمیر کی ہے گریش ورما صاحب ہوں یا ڈاکٹر اعجاز افضل یا موجودہ ایڈوکیٹ جنرل یا محمد علی کاظمی ان سب سے مل کے دل خوش ہوتا ہے۔

بعض اغلاط کی نشاندہی بہت ضروری ہے۔ مثلاً صفحہ ۱۴۱ر پر منور خاں غافل کے شعر کا دوسرا مصرع یوں ہے: ''نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد''۔ اسی طرح صفحہ ۱۲۴ر پر درج ہے: ''کبھی مالی جالسی کو حیدرآباد کے دربار میں ٹپکتی ہے۔'' مالی جالسی نہیں بلکہ صدق جالسی حیدرآباد گئے تھے۔''

ایک خاکہ عتیق احمد کا ہے جس طرح قصائد میں تشبیب اگر اچھی نہ ہو تو اس کا لطیف مدح میں بھی نہیں ملتا۔ عتیق احمد کے سلسلہ میں تشبیب الہٰ آباد ہے۔ انھوں نے عتیق کی ایسی خوبیوں کی طرف اشارہ کیا ہے جن سے الہٰ آباد کا ہر آدمی واقف ہے لیکن ان اچھائیوں کا تذکرہ لوگ ذرا کم کرتے ہیں اور ان کی اچھائیوں کو الہ آباد کے لوگوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور اسی لئے وہ کبھی الیکشن نہیں ہارے۔ اسی طرح اور خاکے بھی دلچسپ ہیں ان کے درمیان کے افراد اپنی تمام تر روایات اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ابھرتے ہیں جیسے عصمت ملیح آبادی کہ ان کا تذکرہ پڑھتے ہوئے جوش صاحب اتنا یاد نہیں آتے جتنا ملیح آباد کے آم کی ہلکی سی ترشی یا وہ سونے کی ڈلی کی طرح کے دسہری آم۔

منور رانا صاحب بے حد مقبول شاعر ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ اسطرح تحت اللفظ میں پڑھتے ہیں کہ ہزاروں ترنم اس پہ قربان کئے جا سکتے ہیں۔ ۸۷ء میں وہ حیدرآباد آئے تھے طالبات کی وجہ سے غریب خانہ پر زحمت دی گئی۔ وہ آئے اور تقریباً دو گھنٹے تک اپنا کلام سناتے رہے اگر بریانی کی خوشبو نے بے چین نہ کر دیا ہوتا اور یہ احساس نہ ہوگیا ہوتا کہ اب گیارہ بج گئے اور لڑکیوں کو دور جانا ہے تو نہ معلوم کب تک محفل چلتی رہتی۔ ان کے مزاج میں انکسار بھی ہے خاکساری بھی اور وہ گرمی جذبات بھی جس سے آدمی مرعوب ہونے کے بجائے محبوب ہو جاتا ہے وہ ان چند شعرا میں سے ایک ہیں جو اتنی شگفتہ اور جاندار نثر لکھتے ہیں کہ یوسفی کی چھاؤں میں بیٹھ کر یوسف کی طرح روشن چمکتے ہوئے تابناک فقرے لکھنا ان کا حصہ ہے وہ بہت بڑے کاروباری آدمی ہیں خود ہی راہ رو بھی ہیں اور راہبر بھی اور منزل بھی کہا جاتا ہے کہ زندگی کی طرح ان کی گاڑیاں کلکتہ سے اتر پردیش اور نہ جانے کہاں کہاں سرگرم سفر رہتی ہیں وہ سنگ مرمر کی طرح شفاف پتھروں کے تاجر ہیں اور یہی شفافیت ان کی شخصیت کا بھی جز ہے اور ان کے اسلوب کا سب سے بڑا حسن—شاید آپ مجھ سے متفق ہوں اور اگر نہیں تو ایک بار ان سے مل کر دیکھئے۔ اس کتاب کا انتساب سید سراج مہدی کے نام ہے جو ایم ایل اے منزل پار کر چکے ہیں۔ دیکھئے کب منسٹر ہوتے ہیں۔

☆

# جدید غزل کی آبرو

ڈاکٹر انور سدید (لاہور)

**منور** رانا سے میرا پہلا تعارف ان کے مجموعے''سفید جنگلی کبوتر'' سے ہوا تھا۔ اس کتاب میں انہوں نے معاشرے کی ہر کروٹ کو اپنے مشاہدے کا حصہ بنایا اور اس پر اپنے خاردار قلم سے آزادی اور جرأت مندی سے اپنا تبصرہ لکھا۔ ان کی ۱۰۰ غزلوں پر مشتمل یہ مجموعہ جسے نوشاد مومن مدیر''مژگاں'' (کولکاتا) نے منتخب اور مرتب کیا ہے، مجھے اظہر جاوید مدیر''تخلیق'' نے مطالعے کے لئے عنایت فرمایا۔ ۲۶ نومبر ۱۹۵۲ء کو رائے بریلی میں پیدا ہونے والے اور کچھ عرصہ لکھنؤ میں قیام کرنے کے بعد مستقل طور پر کولکاتا میں آباد ہو جانے اور شاعری سے مضبوط رشتہ قائم کرنے والے منور رانا سے دوسری ملاقات اس کتاب کے وسیلے سے ہوئی۔ معلوم ہوا کہ شاعری میں وہ منور علی آتش کے نام سے ۱۹۶۹ء میں متعارف ہوئے۔ اس دور میں انہوں نے پروفیسر اعزاز افضل کے آگے تکیہ تلمذ تہہ کیا۔ ان کی پہلی نظم ۱۹۷۲ء میں چھپی۔ نازش پرتاپ گڑھی اور راز الہ آبادی کے مشورے سے انہوں نے اپنا تخلص بدلا اور منور علی شاداں بن گئے۔ تخلص کی ایک اور تبدیلی انہوں نے ۱۹۷۷ء میں اس وقت کی جب انہوں نے والی آسی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ وہ اب''منور رانا'' موسوم ہونے لگے اور مشاعروں میں نمودار ہوئے تو ان کے جرأت مندانہ اظہار نے انہیں قومی اور بین الاقوامی سطح پر مرکزِ نگاہ بنا دیا۔ چند ہفتے پہلے وہ کراچی کے ایک بین الاقوامی مشاعرے میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ میں نے ٹیلی فون پر اکرام تبسم سے پوچھا کہ مشاعرہ کس شاعر نے لوٹا۔ انہوں نے بلا تامل جواب دیا......''منور رانا نے، جو کولکاتا سے آئے تھے۔'' میں نے دریافت کیا''ان کی شاعری کی کس خوبی کو سراہا گیا؟'' اکرام تبسم نے کہا''وہ عصر حاضر کے شاعر ہیں اور معاشرے کو حقیقت نگاری سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی بے باکی اور جرأت مندی کو سب نے پسند کیا۔ ان ہی سے زیادہ سنا گیا۔ سب سے زیادہ داد دی گئی؟''

زیرِ نظر کتاب ملی تو اکرام تبسم کی باتوں کا تاثر میرے ذہن میں موجود تھا۔ پہلی حیرت اس بات پر ہوئی کہ ۱۹۸۰ء سے لے کر ۲۰۰۵ء تک......''غزل گاؤں ...... ''پیپل چھاؤں''......''مور پاؤں''......''نیم کے پھول''......''سب اس کے لئے'' ......''بدن سرائے''......''کہو ظلِ الٰہی سے''......''گھر اکیلا ہو گیا''......اور''جنگلی پھول'' کے نام سے ان کے نو مجموعے شائع ہوئے، اب جو ۱۰۰ غزلوں کی کتاب چھپی ہے تو یہ ان کی تین کتابوں کا انتخاب ہے جسے ان کی شاعری کا عطر قرار دیا جا سکتا ہے۔

منور رانا کو ہندو پاک اور عالمی مشاعروں کا کامیاب شاعر قرار دیا جاتا ہے اور مشاعرے میں وہ غزل کامیاب ہوتی ہے جس کے دوسرے مصرعے کو مشاعرے کے سامعین اٹھائیں۔ اس سے یہ تاثر پیدا کیا گیا کہ مشاعرے کا شاعر سامعین کی سطح پر اتر کر شعر کہتا ہے جو رسالے یا کتاب میں چھپی ہوئی سامنے آئے تو اپنا تاثر قائم نہیں رکھ سکتی۔ منور رانا کی خوبی یہ نظر آتی ہے کہ وہ مشاعرے کے لئے شعر نہیں کہتے، بلکہ ان کے پیشِ نظر اپنے داخل کا اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ غزل کے ہر شعر کا پہلا مصرعہ بھی اپنے اظہار کے لئے کہتے ہیں اور اس کی مناسبت سے دوسرا مصرعہ بھی اس طرح تخلیق کرتے ہیں کہ سامع یا قاری ان کے نقوش پا پر ارتجالاً قدم نہیں رکھ سکتا۔ مجھے کچھ یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ قافیہ اور ردیف کی غلامی کرنے والے مشاعرہ باز شاعروں کی طرح وہ مصرع ثانی سے مصرع اولا کی طرف سفر نہیں کرتے بلکہ شاید ان پر پورا شعر اترتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلا مصرع پڑھنے کے بعد وہ دوسرے مصرعے کو اس طرح کروٹ دیتے ہیں کہ پورے شعر کی تازگی اور توانائی اور تجدد کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ ان کی غزل چونکہ جدید زمانے کی غزل ہے اس لئے اس میں پرانے رموز و علائم نہیں آتے لیکن عصر حاضر کے مظاہر و مسائل از خود غزل کی بنت میں شامل ہوتے چلے گئے ہیں۔ وہ روایتی معنوں میں مزاحمتی شاعر نہیں۔ ان کی شاعری میں انقلاب کی چاپ بھی سنائی نہیں دیتی لیکن وہ ذہنی اضطراب نمایاں ہے جس سے برصغیر کا پورا معاشرہ دوچار ہے اور سیاست کے جبر کے برداشت کر رہا ہے۔ جگ بیتی کی یہ حکایت درد افشاں منور رانا نے خامہ خوں چکاں سے لکھی ہے اور اس طرح بقول نوشاد مومن''بیداری کا چراغ روشن کیا ہے۔'' لیکن اس چراغ کی روشنی غم دیدہ اور کرب چشیدہ ہے:

کرفیو میں اور کیا کرتے مدد اس لاش کی\
بس اگربتی کی صورت ہم سرہانے لگ گئے

طوائف کی طرح اپنی غلط کاری کے چہرے پر\
حکومت مندر و مسجد کا پردہ ڈال دیتی ہے

سیاسی وار بھی تلوار سے کچھ کم نہیں ہوتا\
کبھی کشمیر جلتا ہے، کبھی بنگال کٹتا ہے

مفلسی نے سارے آنگن میں اندھیرا کر دیا\
بھائی خالی ہاتھ لوٹے، اور بہنیں بجھ گئیں

گلے ملنے کو آپس میں دعائیں روز آتی ہیں\
ابھی مسجد کے دروازے پہ مائیں روز آتی ہیں

اس میں بچوں کی جلی لاشوں کی تصویریں ہیں\
دیکھنا ہاتھ سے اخبار نہ گرنے پائے

سیاست ان دنوں انسان کے خوں سے نہائی ہے\
گواہی کی ضرورت ہو تو دریا بول سکتا ہے

عام فہم منور رانا عہد موجود کے شاعر ہیں اور انہوں نے عصری غزل لکھ کر اس فن لطیف کے حال کو ماضی کی جلوہ کاری اور گل و بلبل کی روایت سے منقطع کر دیا ہے۔ منور رانا نے ثابت کر دیا ہے کہ''غزل صرف محبوب سے گفتگو کا نام نہیں بلکہ اس سے آگے کی چیز ہے۔'' اس شعری انتخاب کا فکر انگیز پیش لفظ نوشاد مومن نے لکھا ہے۔ انہوں نے منور رانا کو اردو غزلیہ شاعری کی آبرو شمار کیا ہے۔ یہ رائے درست ہے لیکن اس کا اطلاق صرف جدید غزل کی شاعری پر ہونا چاہئے۔

# ''آنکھوں سے روشنی لے لے''

ظہیرغازی پوری
(بھارت)

**اس** نکتہ سے ہرفن شناس شاعرواقف ہے کہ غزل نگاری آسان نہیں، بہت مشکل صنف، مشکل سخن ہے۔مگر سید حامد کا یہ دعویٰ بڑا عجیب ہے کہ غزل گوکسی زبان کا سب سے بڑاشاعرنہیں ہوسکتااور اگر ہے تووہ زبان کم۔مایہ ہے۔ہائیکو،نظم اور سانیٹ تخلیق کرنے والاشاعر دنیا بھر کے ادب میں اپنی پہچان کے دائمی نقوش رسم کر سکتاہے۔توغزل کا شاعر بڑا،اہم یابلند قامت کیوں نہیں ہوسکتا۔اگر اردو کے ممتازاور ......نقادغزل کو اس طرح پیش نہیں کر سکے کہ بین الاقوامی ادب میں اپنی انفرادی حیثیت منواسکےتواس میں غزل کا کیا قصور ہے؟کلیم الدین احمؔد لیوؔس کے شاگردرہ چکے تھے۔انگریزی ادب میں انھوں نے کچھ بھی بے پڑھا(Untouched) نہیں چھوڑاتھامگر عالمی ادب کو چھوڑیئے لیوؔس کے دبستان میں بھی وہ اپنا کوئی مقام نہیں بنا سکے۔اردو میں بھی جب کچھ نہیں بن پڑاتوایک مسروقہ جملہ غزل کے چہرے پر چپکا دیااوراردوتنقیدکوفرضی اورمضحکہ خیز(آولیدس کاخیالی نقطہ یامعشوق کی موہوم کمر)قرار دے دیا۔ڈاکٹرتنویراحمد علوؔی کے قول کے مطابق غزل کی ایک خاص اور مخصوص اسلوب ہے جس کو جانے بغیر کوئی شاعر کہنے کوتو ایک ہزارایک غزلیں لکھ سکتا ہے مگرغزل گونہیں بن سکتا۔ایک زمانہ تھاجب غزل میں دس پندرہ اشعارعام طور پر کہے جاتے تھےاورپچیس سے پچاس اشعار تک وضع کرکے استادشعراءاپنی زودگوئی اور قادر الکلامی کی دھاک جمانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ایسے لوگ ایک ہزارایک تو کیا لاکھوں اشعار کہنے کے بعد بھی غزل گویوں کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل نہیں بن سکتے۔اس قماش کے شعراء اب نہ کسی پس منظر میں ہیں اور نہ پیش منظر میں۔ پروفیسرعبدالحئی رضانے عصر حاضر کے غزل گویوں سے متعلق خامہ فرسائی کی ہے کہ ''آج کے غزل گویوں نے غزل کی صورت خراب کردی ہےاوراسے زوال کی طرف ڈھکیل دیاہے۔غزل گویوں کی تخلیقی قوت کمزور پڑگئی ہے۔''

میرے خیال میں پروفیسرعبدالحئی رضا کی رائے انتہا پسندانہ ہے۔ وہ نئےغزل نگاروں سے خاصے ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ان کی ناقدانہ حیثیت کے بارے میں یہاں کچھ لکھنے کا موقع نہیں ہے۔علیمؔ .........کے خیال میں عصری غزل ارتقائی حدود کو چھورہی ہے۔ڈاکٹرعلیم اللہ حالؔی کے نزدیک غزل اس وقت تک زندہ رہے گی جب تک اردوزبان زندہ ہے۔حقیقتِ حال یہ ہے کہ اب غزل یہاں کی مختلف زبانوں میں بھی پابندی سے کہی جا رہی ہے اور بیرونی ممالک میں بھی اس کی مقبولیت قابلِ رشک ہے۔موجودہ عہد میں جب شعراء نے غزل کواسلوب اظہاراور معنویت کی نئی سج دھج عطا کی ہے ان میں منوؔررانا بھی شامل ہیں۔انھوں نے اپنی شاعری خصوصاًغزل کے بارے میں لکھاہے کہ:

''شاعری اگرالہام کا دوسرانام نہیں ہوتا توسب سے پہلے میں اپنانام شاعروں کی فہرست سے خارج کر دیتا کیوں کہ اپنی کوشش سے میں آج تک ایک شعر بھی نہیں کہہ پایا....غزل کی شاعری اس انتظار سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہے جو کسی دریچے پردوآنکھیں کرتی ہیں۔غزل اُس یقین سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہے جویقین آپ کوآئینے پر ہوتاہے۔شرط یہ ہے کہ غزل کوقاعدے سے برتا جائے۔''

غزل پری جمال، پری چہرہ اور پری پیکر ہوتی ہے۔اس کے رنگ روپ پھولوں کی طرح انگنت ہیں اوراس کی خوشبو نے ولؔی سے راناؔ تک کے عہد کو مصور کیا ہے۔اس کی کیفیت صرف محسوس کی جاسکتی ہےلفظوں میں بیان نہیں کی جا سکتی۔شایداسی وجہ سے اس کا من وعن ترجمہ کسی زبان میں ممکن نہیں ہوسکا۔منوؔررانا نےغزل کی تعبیر وتوضیح شعری انداز میں اس طرح کی ہے:

مقبرے کو جو حسین تاج محل کہتے ہیں
ان سے اچھے تو ہمیں ہیں کہ غزل کہتے ہیں
محلوں میں بیٹھ کر کبھی غزلیں نہیں کہیں
تحریر میری چشمِ پریشان میں پڑھو
ستارے، چاند، کلیاں، پھول پھلواری نہیں لاتے
غزل میں ہم کبھی بھرتی کی گلکاری نہیں لاتے
وہ مدرسوں کے نام پہ امداد لے کے آئے
مانگی ہوئی غزل پہ بہت داد لے کے آئے
خوبصورت جھیل میں ہنستا کنول بھی چاہئے
ہے اچھا تو پھر اچھی غزل بھی چاہئے
لپٹ جاتا ہوں ماں سے اور موسی مسکراتی ہے
میں اردو میں غزل کہتا ہوں ہندی مسکراتی ہے

مقبرے کوتاج محل کہنےوالوں سے اچھی غزل کہنے والے ہوتے ہیں مگر تاج محل دنیا کا ساتواں عجوبہ ہے،اس حقیقت سے توانکارنہیں کیاجاسکتا۔غزل ازاول تا آخر چہیتی بھی رہی اور ہردلعزیز بھی۔آزمائشوں کی صلیبی دوار سے گزرکر بھی یہ سخت جان کبھی ملول ومتاسف نہیں ہوئی۔محلوں یاپانچ ستارہ ہوٹلوں میں عیاشی تو ہوسکتی ہے، اچھی غزل تخلیق نہیں کی جاسکتی۔بہتوں نے بلندوبالاحویلیوں میں بیٹھ کردوربینوں سے فٹ پاتھ کے مناظر دیکھے ہیں مگران کے رشحات قلم فلموں کے گیت اور مکالموں سے آگے نہیں بڑھ سکے۔مانگی ہوئی غزل،مدرسوں کی امدادجیسی سہی لیکن وہ مشاعروں کی چھتیں اڑادیتی ہےاورشاعر بےچارہ اپنی مظلوک الحالی کے نوحے لکھنے پرمجبور رہتا ہے۔ یہ گورکھ دھندااوراستحصال لفظوں کوربر کی طرح کھینچ کرگٹکری لگاکرغزل گانے والوں کو راس آتا ہے۔منوؔررانانے اپنے دونوں اشعار میں اس المناک سوداگری پرتیکھا طنز کیا ہے۔آخری شعرمیں ایک تلخ حقیقت کا پراثر بیان ہے مگراب اردوزبان جوکبھی کرشن چندرکی ماں تھی،اردونوازوں کی بھینٹ چڑھ گئی اور ہندی(موسی)کے پرستار پروفیسر

راجندر یادو جیسے دانشور بھی اسے محض شاعری کی زبان، ہندی کی ایک شیلی وغیرہ قرار دے کرنہایت بے شرمی کے ساتھ خالص اردو میں لکھے گئے نغموں اور مکالموں کو ہندی کا سرٹیفکیٹ عطا کرتے ہیں اور جب وہی نظمیں غزلیں کتابی شکل میں سامنے آتی ہیں تو اردو ادب کا حصہ بن جاتی ہیں۔ یہ بوالعجی نہیں بلکہ کینہ پروری اور اردو دشمنی کی ایک عبرتناک تاریخی سازش ہے۔ اردو کے ہر شاعر نے، ہر دور میں ہر قسم کی بے انصافیوں اور زیادتیوں کے خلاف احتجاج بھی کیا ہے، مزاحمت بھی اور اپنے لفظ و شعر میں عکس تاب بھی کیا ہے۔ منوّر رانا کے بعض اشعار ملاحظہ فرمائیں:

منصفِ وقت ہے تو اور میں مظلوم مگر
ترا قانون مجھے پھر بھی سزا ہی دے گا
انصاف وہ کرتا ہے گواہوں کی مدد سے
ایمان کی بنیاد یقیں پر نہیں رکھتا
سقراط جیسا بھی جس کو نہ پی سکا
اس تلخیء حیات کو بھی ہم نے پی لیا
ہر شخص مرے شہر میں دشمن کی طرح ہے
اب رام کا کردار بھی راون کی طرح ہے
جگمگاتے ہوئے شہروں کو تباہی دے گا
اور کیا ملک کو معزور سپاہی دے گا
شہر کو فرقہ پرستی کی وبا کھا جائے گی
یہ بزرگوں کی کمائی داشتا کھا جائے گی
مری سرشت میں شامل رہا ہے بچپن سے
پتنگ ہاتھ نہ آئی تو اس کو پھاڑ دیا
ہم تو اک اخبار سے کاٹی ہوئی تصویریں ہیں
جس کو کاغذ چننے والے کل اٹھا تا جائیں گے
اس طرح قسطوں میں مرنا مجھے منظور نہیں
اب مرے شہر کو فوجوں کے حوالے کر دے
کلی کا خون کر دیتے ہیں قبروں کی سراوٹ میں
مکانوں کو گرا دیتے ہیں پھلواری سجانے میں

منوّر رانا جاگتے ذہن کے شاعر ہیں۔ ان کی بے باکی، حق گوئی اور برجستہ کلامی قاری اور سامع کے دل میں تحرک پیدا کرتی ہے، ورغلاتی نہیں۔ ان کے اشعار ہیجان پیدا کرنے کی بجائے عزم وحوصلہ کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کے یہاں خواہ مخواہ کی گھن گرج، نعرہ بازی اور فیشن گزیدہ جدیدیت پرستی کا شائبہ تک نہیں۔ وہ تنہائیوں اور ان کی مریضانہ ذہنیت کے بھی قائل نہیں ہیں۔ وہ حسن وعشق کی سطحی باتوں سے بھی گریز کرتے ہیں اور میراجی، راشد، علوی اور پاشی کی جنسی اشتہا انگیزی سے بھی دامن بچاتے ہیں۔ وہ اپنے جذبے کی ترجمانی صاف وسادہ الفاظ میں کرتے ہیں۔ لیکن انداز شاعرانہ ہوتا ہے۔ وہ سامنے کے الفاظ سے استعارہ سازی اور پیکر تراشی کی دلکش فضا قائم کرتے ہیں۔ انھیں تصنع اور بناوٹ پسند نہیں، وہ راست لہجے اور بیبا کانہ انداز میں اپنی بات کہہ کے ذہن پر گہرا تاثر قائم کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ذیل کے اشعار سے ان باتوں کی توثیق ہوجائے گی۔

کسی دن پیاس کے بارے میں اس سے پوچھئے
جس کے کنویں میں بالٹی رہتی ہے رسّی ٹوٹ جاتی ہے
سب اوڑھ لیں گے مٹی کی چادر کو ایک دن
دنیا کا ہر چراغ ہوا کی نظر میں ہے
کسی کے پاس آتے ہیں تو دریا سوکھ جاتے ہیں
کسی کی ایڑیوں سے ریت میں چشمہ نکلتا ہے
آنکھوں میں کوئی خواب پرانا نہیں آتا
اس جھیل میں اب کوئی پرندا نہیں آتا
مدت سے تمنائیں سجی بیٹھی ہیں دل میں
اس گھر میں بڑے لوگوں کا رشتہ نہیں آتا
موت لگتی ہے مجھے اپنے مکاں کی مانند
زندگی جیسے کسی اور کے گھر میں رہنا
کسی دکھ کا کسی چہرے سے اندازہ نہیں ہوتا
شجر تو دیکھنے میں سب ہرے معلوم ہوتے ہیں
خود سوکھ گیا زخم نے مرہم نہیں دیکھا
اس کھیت نے برسات کا موسم نہیں دیکھا
اس میں بچوں کی جلی لاشوں کی تصویریں ہیں
دیکھنا ہاتھ سے اخبار نہ گرنے پائے
ہمارے رہبروں کو فکر رہتی ہے حکومت کی
ہمارے عالموں کے ذہن پر مسلک کا قبضہ ہے
میت پر کھیلتے بچوں کو ابھی کیا معلوم
کوئی سیلاب گھروندا نہیں رہنے دیتا

منوّر رانا نظریاتی اعتبار سے کسی ایک کھونٹ سے بندھے ہوئے نہیں ہیں۔ ان کی کلاسکیت غزل کی ساخت اور لہجاتی تہذیب سے عبارت ہے۔ وہ ترقی پسند ہیں تو اس لئے کہ غزل کے ہر شعر میں معنی کی ارتقا چاہتے ہیں اور وہ جدیدیت نواز ہیں تو اس لحاظ سے کہ غالبؔ نے ذوقؔ پر سبقت حاصل کرنے کی غرض سے جدید طرز نگارش کی بنیاد رکھی تھی۔ منوّر رانا کے مندرجہ بالا تمام اشعار میں معصومیت کی نئی جہتیں ہیں، استعاروں کی دل فریب کہکشاں ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان اشعار میں پیاس، بالٹی، چراغ، گھر، شجر، رشتہ، موسم، حکومت، ریت اور گھروندا وغیرہ کے شعری تلازمات زمینی حقیقتوں کو آشکار کرنے والے ہیں اور اسلوب بیان میں توانائی ہے۔ ترشی اور تلخی کے باوجود ہر خیال شرفِ قبولیت کا جائز حقدار ہے۔ نظریہء حیات میں سچ کا عمل دخل ہو تو زندگی میں غیر

محسوس طریقہ پروارد ہونے والی تبدیلیاں بھی ایک خاموش تغیر اور نئے انقلاب کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور پھر اپنے آپ ادبی و ثقافتی قدریں بدلنے لگتی ہیں۔ تہذیب بھی نئی کروٹیں لیتی ہے۔ معاشرہ اور فرد کے رشتے کی معنوی جہت بھی بدل جاتی ہے اور شعر و ادب کے تقاضے، وسیلے اور زاویے اور اسے جانچنے پرکھنے کے طریقوں میں بھی واضح اور نمایاں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی تبدیلی تخلیق کاروں کے لئے سمت نما بھی بنتی ہے اور ان صداقتوں کا ادراک بھی کراتی ہے جو انسانی اور سماجی بصیرت کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر قمر رئیس:

''پچھلے تین دہوں سے اردو میں جو ادب پیدا ہو رہا ہے، وہ اپنے عہد کی زمینی حقیقتوں سے بہرہ یاب ہو کر ایسی ادبی صداقتوں کو سامنے لا رہا ہے، جن کی شناخت کے لئے مغرب سے مستعار تھیوریز موثر ثابت ہو رہی ہیں اور نہ ہی روایتی رویوں کے اوزار ان کے پیچ و خم کی پوری گرفت کر پا رہے ہیں..... اس حقیقت کو نظر انداز کرنا بھی مشکل ہوگا کہ ہمارے یہاں بھی اردو میں گزشتہ ربع صدی کے عرصہ میں جو ادبی سرمایہ وجود میں آیا ہے، وہ اپنی الگ پہچان ضرور لا یا ہے۔ یہ وہ ادب ہے جو آج کی برہنہ حقیقتوں اور سلگتے ہوئے مسائل سے آنکھیں ملانے میں جھجک محسوس نہیں کرتا۔'' (سہ ماہی ''آب ِ گل'' شمارہ نمبر ا)

منوّر رانا کی غزل نئی حقیقت نگاری، نئی فکری بصیرت اور نئی صداقت آفریں آمیجری سے عبارت ہیں۔ اس میں ان کی غریبی، امیری، محنت اور جانفشانی بھی شعری لباس میں موجود ہے اور ماں، بچے، بہن اور بزرگوں کی تقدیس بھی دردمندانہ شعری لب و لہجہ میں منعکس ہوئی ہے۔ ان حقیقت افروز انسلاکات نے انھیں ایک حق پسند غزل گو کی حیثیت سے ہم عصر شعراء سے الگ ایک پہچان عطا کی ہے جو غیر شعری اشیا سے بھی شعری وژن خلق کرنے پر ہنرمندانہ دسترس رکھتی ہے۔ اس نوعیت کے چند اشعار کے مطالعہ سے مندرجہ بالا حقائق کا عرفان ہو جائے گا:

دولت سے محبت تو نہیں تھی مجھے لیکن
بچوں نے کھلونوں کی طرف دیکھ لیا تھا
مری دولت، میری کار اور مرا گھر دیکھنے والو
سبھی دیکھا مگر تم نے مری محنت نہیں دیکھی
کس دن کوئی رشتہ مری بہنوں کو ملے گا
کب نیند کا موسم مری آنکھوں کو ملے گا
اس لئے بیٹھی ہیں دہلیز پہ میری بہنیں
پھل نہیں چاہتے تاعمر شجر میں رہنا
معلوم نہیں کیسی ضرورت نکل آئی
سر کھولے ہوئے گھر سے شرافت نکل آئی
کچھ نہیں ہوگا تو آنچل میں چھپا لے گی مجھے
ماں کبھی سر پہ کھلی چھت نہیں رہنے دے گی
تیرے دامن میں ستارے ہیں تو ہوں گے اے فلک
مجھ کو اپنی ماں کی میلی اوڑھنی اچھی لگی
وہ جا رہا ہے گھر سے جنازہ بزرگ کا
آنگن میں اک درخت پرانا نہیں رہا
عادت بھی بزرگوں سے ہماری نہیں ملتی
چہرہ بھی بزرگوں سے ہمارا نہیں ملتا

ان اشعار میں برہنہ حقیقتوں اور سلگتے مسائل کی عکس بندی سادہ مگر تخلیقی زبان اور شعری جمال و کمال کے ساتھ ہوئی ہے لہٰذا یہ عصری میلانات اور ٹوٹتی بکھرتی اقدار کے نہ صرف ترجمان ہیں بلکہ زندگی کی تلخ سچائیوں اور مسائل کی شدت آثار اذیتوں پر غور و خوض کا مطالعہ بھی کرتی ہیں۔ منوّر رانا نے ماں اور بچوں کے موضوع پر بہت زیادہ شعر تخلیق کئے جو ان کے دردمند دل، پرخلوص اور شگفتہ مزاج اور انکسارانہ ذہنی رویہ کی نشاندھی کرتے ہیں۔ غریبی تنگ دستی اور مفلسی کے جذبوں سے مغلوب ہو کر جو اشعار انھوں نے کہے ہیں ان میں تیکھا پن ہے اور تلخ و درشت لفظ و بیان ہے لیکن کہیں بھی شعری تقاضے مجروح نہیں ہوئے ہیں۔ ایسے اشعار سخت دل انسانوں پر بھی دل گرفتگی کا عالم طاری کر دیتے ہیں۔ چند اشعار ان حقائق کے ادراک کے لئے پیش ہیں:

اے مرے خاک وطن تیرا سگا بیٹا ہوں میں
کیوں رہوں فٹ پاتھ پر مجھ کو محل بھی چاہیئے
مفلسی ہرگز نہیں یہ سانحہ ہے دوستو
گود میں بچہ ہے لیکن روٹیاں کھانے لگا
بازار میں عجیب کل اک واقعہ ہوا
مزدور کے پسینے کو ریشم نے پی لیا
جو چھپا لیتا ہے دیوار کی عریانی کو
دوستو ایسا کلینڈر نہیں پھینکا جاتا
مفلسی نے سارے آنگن کو اندھیرا کر دیا
بھائی خالی ہاتھ لوٹے اور بہنیں بجھ گئیں
مرے خدا مری آنکھوں سے روشنی لے لے
کہ بھیک مانگتے سیّد دکھائی دینے لگے
سو جاتے ہیں فٹ پاتھ پہ اخبار بچھا کر
مزدور کبھی نیند کی گولی نہیں کھاتے
مفلسی پاس ِ شرافت نہیں رہنے دے گی
یہ ہوا، پیڑ سلامت نہیں رہنے دے گی
کوئی پڑوس میں بھوکا ہے اس لئے شاید
مرے گلے سے نوالا نہیں اترتا ہے

اکیسویں صدی کے آغاز سے بہت پہلے ڈاکٹر سید محمد عقیل نے ایک مضمون ''اکیسویں صدی کی غزل'' لکھا تھا۔ انھوں نے مشاعروں کے بعض

کامیاب شعراء کے چند ایسے اشعار بطور حوالہ نقل کئے تھے جو معنوی لحاظ سے گنجلک تھے یا یوں کہہ لیں کہ ان میں معنویت مفقود تھی اور لفاظی لچھے دار تھی۔ ان اشعار میں منوّر رانا کا یہ شعر بھی شاید پہلی بار بطور حوالہ نقل ہوا تھا۔

تو ہر پرندے کو چھت پر اتار لیتا ہے
یہ شوق وہ ہے جو زیور اتار لیتا ہے

اس شعر میں مخاطب کبوتر باز قسم کا کوئی شخص ہے۔ کبوتر بازوں کو تو بہت قریب سے (غازی پور اور الہٰ آباد میں) مجھے دیکھنے اور سمجھنے کے مواقع ملے تھے، مگر ہر پرندے کو چھت پر اتار لینے والی بات یا دعویٰ میرے فہم سے بالاتر ہی رہا اور اس شوق کا "زیور اتار" لینا مجھے ایک حد تک مضحکہ خیز بھی معلوم ہوا۔ میں نے چھت، پرند اور زیور کے الفاظ کو استعاراتی اور علامتی طور پر سمجھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ایک بار کلکتہ گیا تو منوّر رانا کا مجموعہ کلام نیم کے پھول (اپنے دیرینہ مخلص دوست منیر نیازی کے یہاں سے) اپنے ساتھ لیتا آیا اور پورا مجموعہ پڑھ ڈالا مگر افہام وتفہیم کا کوئی الجھاوا نظر نہیں آیا اور ان کی غزلوں نے مجھ پر گہرا تاثر قائم کیا۔ کچھ مدت بعد منوّر رانا نے اپنا نیا مجموعہ کلام "کہو ظلِ الٰہی سے" مجھے ارسال کیا۔ اسمیں شامل تازہ غزلوں کے مطالعہ کے بعد میں نے رسید بھیجی تو اور بہت سی باتوں کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ دونوں مجموعوں سے انکشاف ہوا کہ غزل کا ایک دل آویز اور بے باک لہجہ اور بھی ہے جو ہر لحاظ سے متاثر کرتا ہے۔ انسان کے چہرہ کو کتاب اور اخبار کی طرح پڑھنے پڑھانے کی ترغیب، بہت سے شعراء نے دی ہے۔ مجھے بھی اپنا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

شدت کرب سے ہر جذبہ ابھر آیا ہے
اک ذرا غور سے انسانوں کے چہرے پڑھئے

منوّر رانا نے بھی اپنے چہرے کو اخبار بنا کر پیش کیا ہے، جس کی اثر آفرینی اپنی جگہ مسلّم ہے۔ ملاحظہ ہو۔

تم اپنے شہر کے حالات جان سکتے ہو
میں اپنے چہرے کو اخبار کرنے والا ہوں

منوّر رانا ابھی عمر کی اس منزل تک تو نہیں پہونچے ہیں، جہاں ابلے ہوئے کھانے پر صبر کرنا پڑتا ہے۔ خدا کے فضل کا 'کارنشیں' شاعروں میں ان کا بھی شمار ہوتا ہے۔ سرحد پار کے کسی شاعر کا ایک شعر مدتوں سے ذہن میں محفوظ ہے، کیونکہ بات سچی ہے اور سلیقے سے کہی گئی ہے۔ ایسے شعر ضرب المثل کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ شعر ہے۔

وہ لوگ سگِ حال سے آگے نہیں بڑھے
جو لقمہء حلال سے آگے نہیں بڑھے

منوّر رانا نے ابلے ہوئے کھانے کی بات اپنی عمر سے جوڑ کر کہی ہے۔ ممکن ہے یہ آپ بیتی کی بجائے جگ بیتی ہو۔ انکا شعر ہے۔

جانے اب کتنا سفر باقی بچا ہے عمر کا
زندگی ابلے ہوئے کھانے تک تو آ گئی

میں پہلے بھی یہ بات کئی بار لکھ چکا ہوں کہ شاعر کو قدرت کی جانب سے شاعری کا ذوق اور جدت طبع کے ساتھ ہی اسلوب بھی ودیعت ہوتا ہے۔ اسلوب کی تازہ کاری اور نئی حقیقت پسندی نے مل کر منوّر رانا کی غزل میں وہ رعنائی اور اثر انگیزی پیدا کر دی ہے کہ جو بہت کم شعراء کے حصے میں آتی ہے۔ انھوں نے اپنی انفرادیت اور نئی فکری روش کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

غالبؔ کی طرف دار ہے دنیا تو ہمیں کیا
غالبؔ سے کوئی شعر ہمارا نہیں ملتا

جمیلؔ جالبی کے قول کے مطابق اب کوئی موضوع اور لہجہ ایسا نہیں ہے جو غزل کی زینت نہ بن چکا ہو لیکن منوّر رانا نے اپنے معاشرہ اور زندگی کو قریب سے دیکھا اور نقاد کی طرح پڑھا اور غزل کے وسیلے سے تنقیدزات وحیات لکھی۔ لہٰذا بھیڑ سے الگ اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ غزل سے متعلق پروفیسر گوپی چند نارنگؔ نے انتہائی معروضی انداز میں لکھا ہے۔

"غزل اشاریت اور رمزیت، اس کا کہا جانے اور پا جانے کا انداز، اس کی لطیف اور ایمائی فضا اور ماورائی احساس ہندوستانی ذہنی افتاد سے گہری مناسبت رکھتا ہے۔" (اردو غزل اور ہندوستانی ذہن تہذیب۔ ۴۰۸)

منوّر رانا کی غزل ماورائی احساس اور ہندوستانی ذہنی افتاد کی منھ بولتی تصویر ہے۔ اسمیں اشاریت، رمزیت اور ماورائی فضا سچ کے کسیلے ذائقے کے ساتھ جلوہ تاب نظر آتی ہے۔ آخیر میں یہ اشعار بھی ذہن ونظر کینوس پر منعکس کر لیں کہ ان میں غزلیت کی جمال آمیزی کے ساتھ ہی حقیقت شعاری کی شیرازہ بندی بھی ہے۔

سچائی کے اصول سے ہٹ کر پہن لیا
جب جھوٹ بولنا ہوا کھدر پہن لیا
شہرت ملی تو اس نے بھی لہجہ بدل دیا
دولت نے کتنے لوگوں کا شجرہ بدل دیا
میں نے لفظوں کو برتنے میں لہو تھوک دیا
آپ تو صرف یہ دیکھیں گے غزل کیسی ہے
سب کے کہنے سے ارادہ نہیں بدلا جاتا
ہر سہیلی سے دوپٹہ نہیں بدلا جاتا

بلاشبہہ الفاظ کو برتنے اور "خیال کی تجسیم" کرنے میں شعر پختہ بھی خون تھوک دیتا ہے۔ مگر کیا کیجئے یہ تو روشنی کا سفر ہے اور اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک سانسیں چلتی ہیں اور آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ لہٰذا یہ محاسبہ تو ہوتا ہی رہے گا کہ غزل کیسی ہے، کہاں تک پہونچی ہے اور اس کی انتہائی منزل کہاں ہے؟ منوّر رانا کھدر، شجرہ، دوپٹہ، کلنڈر، مزدور اور شرافت وغیرہ عام فہم الفاظ سے پیکر تراشتے ہیں اور استعارے کی زبان میں ایسے وژن خلق کرتے ہیں جو محدود معنوی تناظرات کو ایک وسیع وعریض کینوس عطا کرتے ہیں۔ اسی مثالی کمالِ فن نے انھیں کشش انگیز معیار رسیدگی سے ہم کنار کیا ہے۔

# ''تمہارے شہر کی رونقیں''

حقانی القاسمی
(دہلی، بھارت)

ہر اچھی شاعری میں ڈھائی اکشر ہوتے ہیں۔منور رانا کی شاعری میں بھی ڈھائی اکشر ہی ہیں۔ان کے پہلے اور دوسرے حرف کی تفہیم تو آسان ہے مگر اس نصف حرف کے طلسمی اسرار کو سمجھنے کے لیے ذہن کی بہت ساری توانائیاں صرف کرنی پڑیں گی۔اس نصف حرف کے پراسرار آہنگ کی جستجو ہر اس شخص کو کرنی چاہئے جو منور رانا کے تخلیقی نظام اور طرز احساس کو ایک نئے زاویے اور نئے تناظر میں دیکھنے کا آرزومند ہے۔روایتی،تنقیدی طریقۂ کار سے الگ ہو کر ہی ان کے متن میں مضمر معانی کی تفہیم ecioietucs کی روشنی میں کی جائے تو شاید زیادہ بہتر ہوگا کیونکہ منور رانا کی شاعری میں بہت کچھ وہ ہے جو دوسروں کی شاعری میں نہیں ہے۔

ان کی 'تخلیقی روح' کو تنقید کے میکانکی تصور کے ذریعہ سمجھنا مشکل ہے۔ان کی شاعری کی تفہیم کے لیے صرف ادب ہی نہیں بلکہ سائنس کی نئی شاخوں سے آگہی بھی ناگزیر ہے۔ان کی شاعری کو آج کے ٹیکنالوجیکل ترقیات کے منفی اثرات کے تناظر میں بھی سمجھا جاسکتا ہے۔دراصل یہ پوری شاعری تخلیق اور ٹیکنالوجی کے مابین تناؤ اور کشمکش کی شاعری ہے۔تخلیق کو ٹیکنالوجی میں تبدیل کردیا جائے تو پھر تخلیق کی نہ صرف معنویت مجروح ہوگی بلکہ اس کا منشور بھی بدل جائے گا۔منور رانا کی شاعری میں انسانی اقدار و اخلاقیات پر ٹیکنالوجی کے پڑنے والے منفی اثرات کے خلاف سخت تخلیقی ردعمل کا اظہار ملتا ہے۔یہ مکمل طور پر انسانی احساس و اظہار کی شاعری ہے۔ urbanization اور industrilization کی تمام جہتوں کو سمجھے بغیر منور رانا کی شاعری کی معنویت روشن نہیں ہوسکتی۔ان کی شاعری میں انہی چیزوں کے منفی اثرات اور نتائج سے آگہی کے آثار نمایاں ہیں۔جہاں تک اربنائزیشن urbanization کی بات ہے تو یہ ایک منفی فینامنا ہے۔اس کی وجہ سے نہ صرف ذرائع کا استحصال ہوتا ہے بلکہ زرعی معیشت کا عدم استحکام، کثافت اور علاقائی توازن کا خاتمہ جیسے گھمبیر مسائل پیدا ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ سماجی اقدار اور ماحولیات کو بھی اس سے سخت خطرہ لاحق ہوتا ہے۔اس کی وجہ سے سماجی اور اقتصادی تضادات کی شکلیں بھی رونما ہوتی ہیں۔چونکہ شہر ایک ٹیکنیکی نظام کا پابند ہوتا ہے، اس کا لے آؤٹ پلان بھی اس کی ایک علیحدہ شناخت کا مظہر ہوتا ہے۔رہائشی زون کی تقسیم سے بھی شہری ذہنیت کی تفہیم ہوسکتی ہے۔ان کی اپنی زبان اور اپنا کلچر ہوتا ہے جہاں انسانی رشتے اور اقدار کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔بلاک، وارڈ اور کالونی میں تقسیم شدہ یہ شہر ایک نئے کلچر کا اشاریہ ہیں اور اس کی وجہ سے آبادیوں کے آپسی رشتے بھی مجروح ہوتے ہیں اور اب تو لفظ شہر اپنے مفہوم اور معنی کے اعتبار سے بھی تنہائی، اجنبیت سے عبارت ہو کر رہ گیا ہے جس میں انسانی رشتوں کی حرارت یا حدت کا کوئی عمل دخل نہیں ہے اور اس کے علاوہ بورزوائیت کو فروغ دینے میں شہروں کا بھی بڑا کردار رہا ہے۔نیک ورک سٹی، پوسٹ ماڈرن سٹی کی موجودگی نے لوگوں کے ذہنی، اخلاقی رویے میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ ان کی ترجیحات بھی بدل دی ہیں۔آج دنیا کے غریب ممالک میں طبقاتی تنازعہ مزدور اور سرمایہ دار کے درمیان نہیں اور نہ ہی ملکی اور غیر ملکی مفادات کے درمیان ہے بلکہ اصل تنازعہ شہری اور دیہی طبقات کے درمیان ہے اور یہ خلیج مسلسل بڑھتی ہی جارہی ہے۔

منور رانا شہر اور دیہات کے تضادات کی تصویریں اپنی شاعری میں کھینچی ہیں اور اپنی تہذیبی جڑوں کی جستجو کے چراغ کو روشن رکھا ہے۔ان کی شاعری میں شہر سفاکیت کا استعارہ اور گاؤں معصومیت کی علامت ہے:

تمہارے شہر کی یہ رونقیں اچھی نہیں لگتیں
ہمیں جب گاؤں کے کچے گھروں کی یاد آتی ہے
بھیک سے تو بھوک اچھی گاؤں کو واپس چلو
شہر میں رہنے سے یہ بچہ برا ہوجائے گا
تمہارے شہر میں میت کو سب کاندھا نہیں دیتے
ہمارے گاؤں میں چھپر بھی سب مل کر اٹھاتے ہیں
اتنا روئے تھے لپٹ کر در ودیوار سے ہم
شہر میں آکے بہت دن رہے بیمار سے ہم
تمہارا کام ہے شہروں کو صحرا میں بدل دینا
ہمیں بنجر زمینوں کو حسیں کرنے کی عادت ہے
ان گھروں میں جہاں مٹی کے گھڑے رہتے ہیں
قد میں چھوٹے ہوں مگر لوگ بڑے رہتے ہیں
ابھی موجود ہے اس گاؤں کی مٹی میں خودداری
ابھی بیوہ کی غیرت سے مہاجن ہار جاتا ہے
خدا کے واسطے اے بے ضمیری گاؤں مت آنا
یہاں بھی لوگ مرتے ہیں مگر کردار زندہ ہے

انٹرنیٹ، گلوبلائزیشن نے سماجی، اخلاقی صورت حال کو اور بھی خطرناک بنادیا ہے۔ٹیکنالوجی کے جو منفی اثرات سامنے آئے ہیں، اس کی وجہ سے اخلاقی قدریں زوال کا شکار ہوئی ہیں۔نہ صرف ٹیکنالوجی کی ترقیات نے روایتی اخلاقی اقدار کو چیلنج کیا ہے بلکہ اس کی وجہ سے انسانی جسموں میں بھی کیمیاوی آلودگی پیدا ہوگئی ہے۔انسانی رابطے کا خاتمہ، اسٹرکچرل بے روزگاری اور کثافت کے منفی اثرات آج پورے سماج میں نظر آتے ہیں اور جدید دور کی ٹیکنالوجی کی وجہ

سے انسانیت جراثیم کی ایک کالونی میں تبدیل ہوگئی ہے۔گویا ٹیکنالوجی نے انسان کا رشتہ فطرت سے منقطع کردیا ہے۔صنعتی انقلاب سے پہلے سماج اور معاشیات کا تعین زمین اور زراعت سے ہوتا تھا اور اب صنعتی انقلاب اس کی وجہ سے زمین سے عوام کا رشتہ ٹوٹ گیا۔انڈسٹریلائزیشن کا ایک منفی پہلو یہ بھی ہے کہ اس نے خاندانی اکائی Family Unity کو تباہ و برباد کردیا۔

منوررانا کی شاعری میں انڈسٹریلائزیشن صارفیت، بورژوائیت اور نودولتیہ طبقہ کے خلاف شدید جذباتی ردعمل کا اظہار ملتا ہے۔ انہوں نے کمرشیلائزیشن (Commercialization) کے رویے کی وجہ سے نہ صرف پورے معاشرے کے بازار میں بدلنے کی روش پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے بلکہ بایوٹیکنالوجی ایج میں انسان کے بازار میں تبدیل ہونے کے رویے کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے کہ بایوٹکنالوجی(Biotechnology) نے انسانی جسم کو قابل فروخت تحقیقی مواد اور طبی پروڈکٹ میں تبدیل کردیا ہے۔میڈیکل کامرس میں انسانی اعضاء کی ڈیمانڈ نے یہ ثابت کردیا ہے کہ ہماری اخلاقیات پر اقتصادیات حاوی ہوچکی ہے اور انسانی جسم بھی "متاع بازار" بن کر اپنا تقدس کھوچکا ہے۔کنزیومر کلچر یا مارکیٹ کلچر کی وجہ سے ماحولیات، آب وہوا اور قدرتی ذرائع پر منفی اثرات پڑے ہیں۔یہ کلچر صرف سماجی نظام کی شکست وریخت کا ذمہ دار نہیں ہے بلکہ اس نے فرد کے ذہنی نظام کے ساتھ خاندانی قدریں بھی تبدیل کردی ہیں۔اتحاد کے بجائے انتشار کو جنم دیا ہے۔مسابقت، مادیت پرستی اور بیگانگی کے رویہ کو فروغ دیا ہے۔منور رانا نے اقتصادی مادیت (Economic Materialism)، کنزیومر کیپٹل ازم کے خلاف اپنی شاعری کو ایک مؤثر اور متحرک ذریعہ بنایا ہے۔

بدن کا کوئی بھی حصہ خرید سکتے ہو
میں اپنے جسم کو بازار کرنے والا ہوں
مرے بچے نامرادی میں جواں بھی ہوگئے
مری خواہش صرف بازاروں کو تکتی رہ گئی
نمائش پر بدن کی یوں کوئی تیار کیوں ہوگا
اگر سب گھر کے ہوجاتے تو یہ بازار کیوں ہوتا
شہرت ملی تو اس نے بھی لہجہ بدل دیا
دولت نے کتنے لوگوں کا شجرہ بدل دیا
وہ تو بیوی ہے جو دکھ سکھ میں بسر کرتی ہے
ورنہ بازار کی عورت تو محل مانگے ہے
ایک خواہش کے لیے کیا کیا بکا مت پوچھئے
مختصر یہ ہے کہ چادر ریشمی مہنگی پڑی
امیرِ شہر کی ہمدردیوں سے بچ کے رہو
یہ سر سے بوجھ نہیں سر اتار لیتا ہے
ہمیشہ ٹوٹتی سانسوں کی لے معلوم ہوتی ہے
امیرِ شہر کی دعوت میں تے معلوم ہوتی ہے
یوں ان سے ملتے ہوئے توہین ہو خودداری کی
ایسے بے فیض امیروں کی طرف کیا دیکھیں
خوش حالی میں سب ہوتے ہیں اونچی ذات
بھوکے ننگے لوگ ہریجن ہوجاتے ہیں

منوررانا کی شاعری اسی بدلتی دنیا کے منفی اثرات کے خلاف ایک تخلیقی ردعمل ہے۔ اربنائزیشن، کمرشیلائزیشن، گلوبلائزیشن اور انڈسٹریلائزیشن کا دائرۂ اثر جوں جوں بڑھتا جائے گا منور رانا کی شاعری کی تاثیر وتوانائی بھی بڑھتی جائے گی۔ urbanization اور دیگر تلازمات کے مکمل پروسیس کو سمجھے بغیر منور رانا کی شاعری کی معنویاتی جہتیں نہ منکشف ہوسکتی ہیں اور نہ ہی ان کے فنی اور فکری اعماق کی تفہیم ممکن ہے۔انہوں نے جس نظام فکر کو اپنا مطاف اور محور بنایا ہے وہ موجودہ دور کے گلوبلائزیشن کے نظام سے بالکل مختلف ہے۔آج جبکہ ٹیکنالوجی نے انسانی ذہنوں سے اس کے خواب، اس کی یادیں، گم شدہ لمحے اور ماضی کو سلب کرلیا ہے، ایسے میں منور رانا کی شاعری میں گم شدہ لمحوں، چہروں اور اشیاء کو یاد کرنے کا عمل روشن ہے۔یادآفرینی کے اس عمل نے ان کی شاعری کو ایک نئی تعبیر عطا کی ہے۔یاد ہی شاعری کو سانس عطا کرتی ہے اور ذہن کی زندگی اور تابندگی بھی Mnemosyne پر منحصر ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی شاعری میں خواب زندہ ہیں اور خوابوں کی گم شدگی کائنات کا ایک بڑا المیہ ہے۔ خوابوں کا کھوجانا شخصیت کو زوال سے آشنا کرتا ہے یا انہدامی مرحلے سے گزارتا ہے۔ماضی، خواب اور یادیں منور رانا کے تخلیقی محرکات ہیں۔منور رانا اپنے عنصر سے الگ یا جدا نہیں ہیں اسی لیے ان کی شناخت باقی ہے، پہچان قائم ہے۔وہ اپنے اقدار سے کبھی انحراف نہیں کرتے۔ان کے تخلیقی فکری نظام کے ساتھ روایت کی روشنی بھی ہے۔اسی لیے وہ کہتے ہیں:

دیکھی ہے منور نے بزرگوں کی نشانی
دستار پرانی ہے مگر باندھے ہوئے ہیں
روش بزرگوں کی شامل ہے میری گھٹی میں
ضرورتاً بھی سخی کی طرف نہیں دیکھا
بہت حسین سا اک باغ گھر کے نیچے ہے
مگر سکون پرانے شجر کے نیچے ہے
کوزہ گھروں کے گھر مسرت کہاں سے آئے
مٹی کے برتنوں کا زمانہ نہیں رہا
ہم ہیں گزرے وقت کی تہذیب کے روشن چراغ
فخر کر ارض وطن ہم آج تک دنیا میں ہیں
نئے کمروں میں اب چیزیں پرانی کون رکھتا ہے

پرندوں کے لیے صحرا میں پانی کون رکھتا ہے
ہمیں گرتی ہوئی دیوار کو تھامے رہے ورنہ
سلیقے سے بزرگوں کی نشانی کون رکھتا ہے
کہاں کی دوستی کیسی مروت کیا رواداری
نئی قدریں سبھی چیزیں پرانی چھین لیتی ہیں

منور رانا کی شاعری میں ماضی کی آہٹوں کے ساتھ آج کی تاریخ، تہذیب اور تصویر قید ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کی ذہنی ساخت اور انفرادی احساس کا روزنامچہ ہے جس میں ایک ایک لمحے کا حال درج ہے۔

عصری حسیت سے معمور اس شاعری میں جو پولیٹیکل آئرنی ہے وہ ان کے داخلی احساس کی عکاسی ہی نہیں ہے بلکہ موجودہ سماجی و سیاسی سسٹم کے خلاف ایک ری ایکشن بھی ہے۔

فضا میں گھول دی ہیں نفرتیں اہلِ سیاست نے
مگر پانی کنویں سے آج تک میٹھا نکلتا ہے
بڑا گہرا تعلق ہے سیاست سے تباہی کا
کوئی بھی شہر جلتا ہے تو دلّی مسکراتی ہے
طوائف کی طرح اپنی غلط کاری کے چہرے پر
حکومت مندر و مسجد کا پردہ ڈال دیتی ہے
یہ سنسد ہے یہاں آداب تھوڑے مختلف ہوں گے
یہاں جمہوریت جھوٹے کو سچا مان لیتی ہے
دنیا مرے کردار پہ شک کرنے لگے گی
اس خوف سے میں نے کبھی کھدر نہیں پہنا
اب مدرسے بھی ہیں تیرے شر سے ڈرے ہوئے
جائیں کہاں پرندے شجر سے ڈرے ہوئے
کمہلا دیے ہیں پھول سے چہرے فساد نے
معصومیت بھی ان نوکِ سناں تک پہنچ گئی
عدالتوں ہی میں جب لین دین ہونے لگیں
تمہی بتاؤ بے چارے وکیل کیا کریں
ہر اک خوشبو کا جھونکا ہمیں کافور لگتا ہے
کسی بھی شہر سے گزریں وہ بھاگلپور لگتا ہے
جسے بھی دیکھئے وہ خوف کی سولی پہ لٹکا ہے
ہمارے شہر کا ہر آدمی منصور لگتا ہے
یہ دیکھ کر پتنگیں بھی حیران رہ گئیں
اب تو چھتیں بھی ہندو مسلمان ہوگئیں
چلو چلتے ہیں مل جل کر وطن پر جان دیتے ہیں
بہت آسان ہے کمرے میں وندے ماترم کہنا

تمہارے شہر میں تاثیر سے خالی ہے یکجہتی
جہاں ہر روز دنگے ہوں وہاں گالی ہے یکجہتی
سیاست کی دکانوں میں محبت ڈھونڈتے کیوں ہو
یہ کھدر بیچنے والے ہیں کیا ریشم دکھائیں گے

منور رانا کے یہاں حیات و کائنات کے تضاد اور انتشار میں ایک ربط کی جستجو کا عمل روشن ہے۔ اس قوس قزح رنگ کی شاعری میں زندگی، سماج، مذہب اور اساطیر کی متضاد لہروں کا امتزاج ہے۔ منور رانا نے اپنی شاعری میں ان اساطیر، علامات اور تلمیحات کا استعمال کیا ہے جن سے نہ صرف ماضی روشن ہے بلکہ مستقبل کو بھی ان سے توانائی اور تحرک ملتا ہے۔ ماضی سے مستقبل کو مربوط کرنے کا یہ تخلیقی عمل بہت معتبر ہے اور کائنات کو ایک تسلسل میں دیکھنے کی روش بھی اس میں مضمر ہے۔ زمانہ بدل جاتا ہے مگر کردار کسی نہ کسی شکل میں زندہ رہتے ہیں۔ ماضی کے حوالے سے حال اور مستقبل کی علامات اور اساطیر کا یہ تخلیقی استعمال دیکھئے:

گوتم کی طرح گھر سے نکل کر نہیں جاتے
ہم رات میں چھپ کر کہیں باہر نہیں جاتے
دل وہ بستی ہے جہاں کوئی تمنا نہ ملی
میں وہ پنگھٹ ہیں جسے کوئی رادھا نہ ملی
ایک ہی آگ میں تا عمر جلے ہم دونوں
تم کو یوسف نہ ملا ہم کو زلیخا نہ ملی
میرا بن باس پہ جانے کا ارادہ تھا مگر
مجھ کو دنیا میں کہیں بھی کوئی سیتا نہ ملی
اس عہد کا کوفہ ہے میرا شہر بھی شاید
کوئی طرف دارِ منور نہیں نکلا
پھر چلا ہے کوئی وعدہ کو نبھانے کے لیے
یہ ندی پھر آج ایک کچا گھڑا کھا جائے گی
دیا ہے صحرا نوردی کا حکم جب مجھ کو
تو سوہنی کو بھی پنجاب سے نکالا جائے
ہر شخص مرے شہر میں دشمن کی طرح ہے
اب رام کا کردار بھی راون کی طرح ہے

ان کے ہر شعر میں باطنی احساس کا آہنگ ہے۔ احساس کی تمام رگوں میں انہوں نے اتر کر دیکھا ہے اس لیے ان کی شاعری میں حزنیہ رنگ آہنگ بھی ہے اور طربیہ لے بھی۔ انسانی وجود کے آہنگ سے آشنائی نے ان کی تخلیقی تکنیک اور کینوس کو وسعت عطا کی ہے۔

منور رانا کی شاعری میں پورے چاند کی رات روشن ہے۔ بانسری کی سریلی مدھر آواز ہے۔ کنول کے پھول ہیں۔ پریم کی روشنی ہے۔ محبت کا سورج ہے۔ باطن کے آہنگ سے ان کے احساس و اظہار کا آہنگ جڑا ہوا ہے۔ ان کی

شاعری میں داخلی اور خارجی وجود کی وحدت اور ہم آہنگی ہے۔ایک ہی تانت ہے جو بج رہی ہے۔کبیر کی مانیں تو ان کی تخلیقی شخصیت انار کی طرح نہیں ہے جس کا باطن سفید اور ظاہر سرخ ہوتا ہے۔

اس اختصاصی دور میں منور رانا کی عوامی اور غیر اختصاصی شاعری کی بھی اپنی الگ ادا اور اسلوب ہے۔انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ان تمام جذبات واحساسات کو پیش کیا ہے جو عوام سے جڑے ہوئے ہیں۔عوام کے نفسی رجحانات اور رویے تک ان کی رسائی ہے اور عوامی سائیکی سے ان کی شاعری کا رشتہ بہت مضبوط ہے اس لیے ان کی شاعری میں نظیرا کبرآبادی کی طرح ایک اجتماعی کردار نظر آتا ہے۔انہوں نے اپنی شاعری میں گم ہوتے گاؤں اور غریب کو پھر سے زندہ کر دیا ہے۔گاؤں ان کی شاعری میں ایک رمز اور استعارہ ہے اور اسی کی تہہ میں ان کے ذہنی نظام کی جڑیں ہیں۔ان کی شاعری میں زیادہ تر ایسے ہی تجربے بولتے ہیں اور مشاہدے مکالمہ کرتے ہیں۔ایک ایک شعر میں کئی کہانیاں اور کئی حکایتیں چھپی ہوتی ہیں۔ان کے اندر کا بچہ مرا نہیں، زندہ ہے۔وہ ایک معصوم سا بچہ جو خاندان کی اکائی سے جڑا ہوا ہے اور ایک مربوط ذہن جس کے لیے خاندانی قدریں بہت اہمیت رکھتی ہیں۔منور رانا کی شاعری میں ماں، بہن، بھائی، بیوی، بیٹی یہ سب زندہ کردار ہیں اور انہی کرداروں کے جذبوں اور احساسات کی کائنات پر ان کی پوری شاعری مشتمل ہے۔چھوٹی بڑی حقیقتیں، تضادات اور کشمکش سے ان کی شاعری کی تشکیل ہوئی ہے۔ان کی شاعری پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خیال کے خلوت کدے میں کوئی نہ کوئی طلسم ہوشربا کا ساحر یا شعبدہ باز ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری پڑھتے ہوئے قاری کا ذہن اور دل گداختگی کی کیفیت سے روشن ہوتا ہے۔جانے ان کی شاعری میں ایسا کون سا موہنی منتر ہے کہ قاری اسیر اور وارفتہ ہو جاتا ہے۔

منور رانا کی شاعری میں عجب جادوئی سحر انگیزی ہے کہ انسانی ذہن اپنے حواس کے تمام دروازوں کو مقفل پاتا ہے۔ایسی صورت میں یہ مشکل آن پڑتی ہے کہ قاری شعر کے مکمل معنوی وجود تک رسائی میں ناکام ہو جاتا ہے اور شاعری میں موجزن لہروں سے آشنا نہیں ہو پاتا۔یہی وجہ ہے کہ شاعری اپنی تمام تر حسیاتی، معنویاتی وجود کے ساتھ روشن نہیں ہو پاتی۔سب سے بڑی مصیبت منور رانا کی شاعری کی طلسمی کیفیت کو اپنی گرفت میں لینے کا ہے۔

منور رانا کا اپنا غزلیہ آہنگ ہے اور الگ ڈکشن بھی۔لفظیات کی سطح پر بھی انہوں نے مقتدرہ یا اشرافیہ کی سوچ کا اثر قبول نہیں کیا بلکہ بہت سے بوسیدہ، کہنہ، فرسودہ لفظوں میں بھی زندگی کی رمق پیدا کر دی۔لفظوں کو حیات نو بخشنا بھی ایک بڑا تخلیقی مجاہدہ ہے۔انہوں نے لفظوں کی کراہ کو سمجھا ہے اسی لیے ان کے یہاں ایسے الفاظ بھی مل جاتے ہیں جو عصر حاضر کے شعری فرہنگ سے جلاوطن کر دیے گئے ہیں۔زبان سے ہی نظریہ متحرک ہوتا ہے اس لیے زبان کو زندہ رکھنا ضروری ہے۔شاعری کو مختلف ساحلوں پر لفظوں کے سمندر کی ضرورت پڑتی ہے اور منور رانا نے زبان کی سطح پر بھی جستجو کے اس عمل کو روشن رکھا ہے۔

منور رانا نے تغزل کی خانقاہ میں نئے چراغ جلائے ہیں۔وہ اجڑی ہوئی ویران خانقاہ جہاں جذبہ اور احساس کی مشعل روشن نہیں تھی جہاں کے در و دیوار سے وحشت ٹپکتی تھی، انہوں نے کائی زدہ احساسات سے الگ جذبہ واحساسات کی ایک مضطرب کائنات کی تشکیل کی اور عمومی تجربات کو نئے رنگ و آہنگ میں پیش کر کے تحیر کے چراغ جلائے اور یہی چراغ تحیر ان کے تخلیقی انفراد کا ضامن ہے۔

منور رانا کے بعض شعروں میں اس قدر pathos ہے کہ آنسوؤں کی بارش ہونے لگتی ہے اور ذہن کی زمین نم ہو جاتی ہے۔وہ المیہ احساسات کے بھی ایک اچھے شاعر ہیں۔ان کی شاعری میں ایک داخلی وحدت ملتی ہے اور یہی وحدت ان کے احساس و اظہار کی اپنی الگ داخلی منطق کا مظہر ہے۔انہوں نے انسانی وجود میں اس میلوڈی کو تلاش کیا ہے جس کی وجہ سے ان کی تخلیق بہت سی باطنی لہروں اور خارجی ارتعاشات سے آشنا ہوئی ہے۔یہی ارتعاشات انسانی ذہن کو نئی کیفیات سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔دیکھا جائے تو ان کی شاعری میں وہ چراغ لالہ ہے جس سے روشن ہے کوہ ودمن۔

احساس و اظہار کی سطح پر منور رانا نے نہایت شاداب تجربے کیے ہیں اور لفظیات کی سطح پر بھی توازن اور تناسب کا خیال رکھا ہے۔ان کی شاعری میں نہ زیادہ بارش کا احساس ہوتا ہے اور نہ زیادہ تیز دھوپ کا۔لیکن سمندر کی طرح ان کے ذہن کی لہریں مضطرب اور بے قرار ہیں۔انہیں اپنے وجود کی خوشبو کی خبر ہے اسی لیے وہ اپنی ذات میں اور اپنے وجود کے اندر بھی کائنات کی جستجو کرتے ہیں۔خاص طور پر اس صوت سرمدی کی جستجو جس کی وجہ سے کائنات میں روشنی ہے۔

منور رانا ایک معمولی احساس کو بھی اپنے تخیل کی قوت اور جدت سے غیر معمولی وقوعے میں تبدیل کر دیتے ہیں۔قاری کو بادی النظر میں محسوس ہوتا ہے کہ یہ سامنے کی بات ہے مگر جب اس کے اسرار کی تہیں کھلتی ہیں تو دیدۂ حیراں وا ہو جاتے ہیں۔منور رانا کا ایک شعر ہے:

سو جاتے ہیں فٹ پاتھ پہ اخبار بچھا کر
مزدور کبھی نیند کی گولی نہیں کھاتے

یہ سامنے کا شعر ہے مگر اس میں معنی کی نہ جانے کتنی تہیں پوشیدہ ہیں۔یہ دو قطبی تضادات کی بہترین تصویر و تعبیر بھی ہے۔اس شعر کی صحیح معنویت انہی لوگوں پر منکشف ہو سکتی ہے جو نیند جیسے جادوئی فینومینا سے محروم ہیں اور جو اس کے لیے hypnotics کا استعمال کرتے ہیں۔پھر بھی وہ مختلف طرح کے امراض کے شکار ہوتے ہیں۔وہ still nox, zolpiden, ambien اور barbiturates اور دیگر خواب آور گولیاں استعمال کرتے ہیں پھر بھی فشار دم یا ذیابیطس کے مریض رہتے ہیں۔یہ آج کے ماڈرن لائف اسٹائل اور بدلتی دنیا کی ایک بھیانک تصویر بھی ہے اور دوسری طرف اس غریب انسان کی تقدیر بھی جو تمام تر مشکلات کے باوجود نیند جیسی نعمت سے مالا مال ہے۔وہ مزدور ضرور ہے مگر میڈیا

Mania نہیں۔وہ کسی طرح کے cataplexy یا narcolepsy یا fibromyalgia کا شکار نہیں ہے۔نیند نہ آنے کی صورت میں جو بیماریاں انسانی وجود کو دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہیں، اگر ان تمام بیماریوں کے مہلک اثرات کی روشنی میں اس شعر کو پڑھا جائے تو اس کی معنویت نہ صرف روشن ہوتی ہے بلکہ یہ احساس ہوگا کہ تخلیق کار کے احساس کی سطح کتنی بلند اور کتنی جہتوں پر پھیلی ہوئی ہے۔

منور رانا کی شاعری میں انقلابی آہنگ، مزاحمتی رنگ اور وہ موج منصوری بھی ہے جس سے آج کے تخلیق کار محروم ہیں کہ زیادہ تر تخلیق کاروں کی رگوں میں کیڈمیم کی مقدار زیادہ ہے جس کی وجہ سے وہ ہر لحہ ایک خوف یا بزدلی کی نفسیات کے زیر اثر رہتے ہیں مگر ایک سچا تخلیق کار کبھی بھی سچ بولنے سے پیچھے نہیں ہٹتا بلکہ وہ سرِ دار بھی حرف حق بلند کرتا ہے۔منور رانا کے یہاں بھی وہی شجاعت اور شہامت کی لہریں ملتی ہیں۔

امیرِ شہر کو تلوار کرنے والا ہوں
میں جی حضوری سے انکار کرنے والا ہوں
میں بھی سقراط ہوں سچ بول دیا ہے میں نے
زہر سارا میرے ہونٹوں کے حوالے کردو
جرأت سے ہر نتیجے کی پرواہ کیے بغیر
دربار چھوڑ آیا ہوں سجدہ کیے بغیر
یہ دور احتجاج ہے خاموش مت رہو
حق بھی نہیں ملے گا تقاضا کیے بغیر
خانقاہوں سے نکل آؤ مثالِ شمشیر
صرف تقریر سے بخشش نہیں ہونے والی
قتل ہونا ہمیں منظور ہے لیکن راناؔ
ہم سے قاتل کی سفارش نہیں ہونے والی
وہ سربلند ہمیشہ خوشامدوں میں رہا
میں سر جھکائے رہا اور سرمدوں میں رہا
کہیں ہم سرفروشوں کو سلاخیں روک سکتی ہیں
کہو ظلِ الٰہی سے کہ زندانی پلٹتا ہے

Saint Pol Roux نے کہا تھا Poetry is the greatest force on Earth اور منور رانا نے زمین کی سب سے بڑی توانائی کا استعمال انسانیت کی تکریم اور احترام آدمیت کے لیے کیا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ انسانی مستقبل کو تابناک بنانے کا کام کیا ہے کہ دراصل اس ترقی یافتہ تکنالوجی کے دور میں ثقافتی بحران کا حل شاعری ہی تلاش کرسکتی ہے۔فطرت، تکنالوجی اور انسانی رشتوں کے مابین مفاہمت تخلیق کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔انہوں نے اپنے تخیل کی قوت کو ضائع ہونے سے بچالیا ہے۔ انہیں احساس ہے کہ ماحولیاتی بحران کی وجہ سے تخیل کا بحران (crisis of imagination) جنم لیتا ہے اسی لیے انہوں نے انسانی تخیل اور ماحولیاتی حقیقت کے درمیان اس رشتے کی دریافت کی ہے جس کا عدم توازن کائنات کو نئی سطحوں پر بحران میں مبتلا کرسکتا ہے۔طبعی ماحول کا انفرادی اور اجتماعی ادراک پر گہرا اثر پڑتا ہے اور منور رانا نے اپنی شاعری میں اس طبعی ماحول کی بہت ہی فنکارانہ انداز میں عکاسی کی ہے۔

انہوں نے اپنی شاعری کے لیے ایک نئی بشارت دی ہے اور یہی انسانی جذبہ اور احساس ان کی شاعری کو زندہ رہنے کی ضمانت عطا کرتا ہے۔ان کی شاعری میں سب سے بڑی لہر جو ہے وہ ہے انسانیت کی لہر۔وہی سورج، وہی روشنی، وہی خوشبو، وہی پھول ہے جو انسانی وجود سے وابستہ ہیں۔انسانی رشتے کی فطری خوشبو نے ہی ان کی شاعری کو تازگی، تحرک، توانائی اور تمکنت عطا کی ہے۔

## ''حق گوئی کے عناصر''

**منور** رانا نے اردو غزل کو ایک وقار عطا کیا ہے۔دربار سے شاعر کا پرانا رشتہ رہا ہے۔بڑے بڑے شعرا بادشاہوں اور امراء کی شان میں کچھ ایسے رطب اللسان رہے ہیں کہ وہاں خودداری، انا اور حق گوئی کا تو گذر بھی نہیں تھا بلکہ خوشامدانہ لہجہ، بے جا تعریفات اور ان کے ہر عمل اور اقدام کو مشیت الٰہی تک کا درجے دینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔بادشاہوں حتیٰ کہ انگریزوں کی شان میں قصائد پڑھنے میں بھی ہمارے شعراء نے کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔یہ روایت کافی بعد تک ہمارے متعدد شعراء کے مزاج کا حصہ رہی ہے۔اس کی بڑی وجہ ہمارے شعراء وادباء میں سے زیادہ تر کا مفلوک الحال ہونا بھی ہے۔مجبوریاں قلم فروخت کرنے پر مجبور کرتی رہی ہیں۔منور رانا اردو کے ایسے شعراء میں سے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کی گاڑی کو محنت ومشقت کے ایندھن سے چلایا ہے۔جنہوں نے جانفشانی اور خودداری سے پیسہ کمایا ہے۔وہ محنت کا رنگ پہچانتے ہیں۔انہوں نے حقیر اور کمتر سمجھے جانے والے شعراء کا وقار بلند کرنے کا کام کیا۔خودکفیل اور اہل ثروت شعراء اکثر خوددار ثابت ہوئے ہیں۔یہی سبب ہے کہ منور رانا کے یہاں خودداری، حق گوئی اور انا کے عناصر ملتے ہیں۔

**اسلم جمشید پوری** (میرٹھ، بھارت)

# منوّر رانا متنازعہ کیوں؟

ڈاکٹر سیّد احمد قادری
(بھارت)

**منور رانا** آج شہرت اور مقبولیت کی جس بلندی پر ہیں،ایسی شہرت اور مقبولیت اردو شاعروں کے حصہ میں کم آئی ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ منور رانا کو سیدھے سادے الفاظ اور عام فہم انداز بیان سے براہ راست لوگوں کے دلوں میں اتر جانے کا ہنر آتا ہے۔ان کی غزلیں جذبے کی صداقت، تخیل کی گہرائی، فکر کی ندرت اور معنویت کی وسعت سے معمور ہوتی ہیں۔جن سے ان کی شعری اور فکری شناخت میں انفرادیت کی جھلک بہت نمایاں ہوتی ہے۔منور رانا کے اشعار سادگی میں پرکاری کی بہترین نمونہ ہوتی ہیں۔انسانیت، معاشرت، فرد اور دنیا کی اعلیٰ قدروں سے منور رانا کی چونکہ گہری وابستگی ہے،اس لئے ان کے اشعار کا کینوس کافی وسعت لئے ہوتا ہے۔جس کے باعث ملک اور بیرون ممالک کے جس مشاعرے میں بھی وہ پہنچ جاتے ہیں اس مشاعرے کی بازگشت بہت دور تک اور دیر تک سنائی پڑتی ہے،اور عام سے عام آدمی بھی منور رانا کے اشعار گنگناتا رہتا ہے۔میری اس بات کی بھی لوگ ضرور تائید کرینگے کہ اس وقت پرنٹ میڈیا،الکٹرانک میڈیا اور سوشل میڈیا میں منور رانا کی شخصیت اور شاعری کی دھوم مچی ہوئی ہے۔اس دھوم میں لاکھوں کروڑوں لوگ شامل ہیں،لیکن کچھ کوتاہ نظر ایسے بھی ہیں جو حقائق سے واقف ہوتے ہوئے بھی مخالفت برائے مخالفت کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں۔ایسے ہی چند لوگوں کے ذریعہ منور رانا کو متنازعہ بنانے کی بلاوجہ کوششیں ہو رہی ہیں۔

منور رانا نے ابھی ابھی کینسر جیسے موذی مرض کو شکست دی ہے۔جن دنوں وہ کینسر کے آپریشن کے لئے بمبئی کے اسپتال میں داخل ہوئے تھے،ان کی صحت یابی کے لئے لاکھوں ہاتھ اٹھے تھے،ان ہاتھوں میں ہر مکتبہ فکر اور مذہب وملت کے لوگ شامل تھے۔اس وقت ایسا کون سا ہندی، انگریزی، اردو ودیگر زبانوں کا اخبار تھا،جس نے ان کی بیماری کی خبر نمایاں طور پر نہیں شائع کی تھیں،اوران لاکھوں لوگوں کی دعاؤں کا ہی فیض ہے کہ منور رانا نے کینسر جیسی خطرناک بیماری کو شکست دینے میں کامیابی حاصل کی اور انھیں ایک نئی زندگی ملی۔ابھی وہ پوری طرح صحت یاب بھی نہیں ہوئے تھے کہ ملک میں بہت تیزی سے بڑھتی عدم رواداری، منافرت، بدامنی، فرقہ واریت اور فاشزم کے خلاف آواز اٹھی اور یہ آواز ملک وبیرون ملک میں پھیلتی چلی گئی۔نینا سہگل نے ایوارڈ واپسی کی پہل کی اور یہ سلسلہ بھی دراز ہوتا چلا گیا۔اسی دوران کسی ٹی وی چینل میں ان سے اس سلسلے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہہ دیا کہ تھکے ہوئے لوگ ایوارڈ واپس کر رہے ہیں۔لیکن دوسرے ہی دن انھیں اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا اور انھوں نے یہ طئے کر لیا کہ وہ بھی ملک کی فسطائی قوتوں کے خلاف اپنی احتجاج درج کرانے کے لئے اپنا ایوارڈ واپس کریں گے۔ہاں، یہ ضرور ہے کہ وہ خاموشی سے ایوارڈ واپسی کے بجائے تمام میڈیا میں کوریج چاہتے تھے،تاکہ اس کی بازگشت دور تک ہو اور یہ ضروری بھی تھا،اس لئے کہ اس وقت تک بہت ساری زبانوں کے مصنفین احتجاج میں اپنا ایوارڈ واپس کر چکے تھے،جن کا ذکر بار بار کیا جا رہا تھا،لیکن افسوس کہ اردو کے سوائے ایک خلیل مامون اور کشمیری زبان کے غلام نبی خیال نے ہی اپنے ساہتیہ اکاڈمی واپس کیا تھا،لیکن ان دونوں کا ذکر زیادہ کوریج نہیں پا رہا تھا اور سوال اٹھ رہے تھے کہ یہ اردو والے خاموش کیوں ہیں۔بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ تو اب بھی خاموش ہیں،گوپی چند نارنگ،سلام بن رزاق،جاوید اختر،ندا فاضلی،ش.ک.نظام،شمس الرحمٰن فاروقی، جابر حسین،عبدالصمد وغیرہ یہ سب کے سب خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں،جبکہ پانی سر کے اُوپر سے گزر رہا ہے۔بہرحال،اس دوران منور رانا کو جب دہلی IIT سے مشاعرے کی دعوت ملی،تو گرچہ وہ اپنی بیماری اور نقاہت کے باوجود سفر نہیں کرنا چاہتے تھے پھر بھی انھوں نے سفر کا قصد کیا اور اس موقع پر ایوارڈ واپس کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔اس مشاعرہ میں جانے سے چند دن قبل انھیں A B P نیوز چینل والوں نے ایوارڈ واپسی پر مباحثہ کے لئے مدعو کیا اور انھیں پلین کا ٹکٹ بھی بھیج دیا لیکن انھوں نے پلین کی بجائے ٹرین سے سفر کیا اور اس نیوز چینل والوں کو کہہ دیا کہ وہ اپنے پلین کا ٹکٹ واپس لے لیں، میں مقررہ وقت پر پہنچ جاؤں گا......اور وہ حسب پروگرام ABP اسٹوڈیو اپنا بیگ لئے ،جس میں ایوارڈ اور چیک تھا، لئے پہنچے کہ اس ABP کے پروگرام کے فوراً بعد ہی انھیں IIT کے مشاعرہ میں جانا تھا، جہاں پہنچ کر انھیں اپنا ایوارڈ واپس کرنا تھا۔لیکن ABP کا وہ، مذکورہ پروگرام جس طرح شروع ہوا اور بہار کے انتخاب کے پیش نظر وہ جس طرح ہنگامہ خیز ہوتا گیا اور بی جے پی کے سمپت پاترا جس طرح زہرافشانی کر رہے تھے اسے سن کر منور رانا جیسے حساس شاعر کا غم وغصہ میں مبتلا ہونا فطری اور لازمی تھا،انہوں نے IIT کے مشاعرہ کے دوران ایوارڈ واپسی کا پروگرام بدل دیا اور وہ مباحثہ کے دوران ہی وہاں سے اٹھے، دوسرے روم میں گئے جہاں ان کا بیگ رکھا ہوا تھا اپنا ایوارڈ نکالا اور واپس آ کر پورے پینل کے سامنے ہی اپنے ایوارڈ واپسی کا اعلان کر دیا۔

منور رانا کی اس جواں مردی، بے باکی، حوصلہ مندی اور جرأت مندی کی جس طرح دھوم مچی اور ایک ہنگامہ کھڑا ہوا۔اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ایوارڈ واپسی ایک علامت ہے،احتجاج اور غم وغصہ کا،اور ایسا احتجاج بیرون ملک کے ساتھ ساتھ اپنے ملک میں بھی کئی بار کیا جا چکا ہے،لیکن اس بار جو شدّت ہے،اور زور ہے۔ایسا زور اور شدّت اس سے پہلے نہیں دیکھنے کو ملا۔اس لئے کہ جس طرح کلبرگی، گووند پنسارے، نریندر دابھولکر کو ان کے سیکولر

نظریات کی پاداش میں اور گوشت رکھنے کا بہانہ بنا کر جس بے رحمی سے اخلاق کو ،اس کی بے گناہی کی سزادی گئی -اس سے کون سا ایسا دل ہوگا ، جو روئے گا نہیں اور منورانا تو بلاشبہ سفّاک عہد کا معصوم شاعر ہے، جو کہتا ہے کہ

خدا کے واسطے ائے بے ضمیری گاؤں مت آنا
یہاں بھی لوگ مرتے ہیں مگر کردار زندہ ہے

منورانا نے اپنا ایوارڈ واپس کر کے بے شک ایسے لوگوں پر جو اپنے دل میں بے ضمیری کو بسائے ،زبان سے ضمیر کی بات کرتے ہیں۔ان کے ساتھ ساتھ ملک میں منافرت، فرقہ واریت اور مذہبی جنون کو بڑھا کر، ملک کے آئین اور انسانی اقدار کو پامال کرنے والوں پر، زبردست حملہ کیا اور جس کی گونج ملک اور بیرون ملک کے طول وعرض کے ساتھ ایوان بالا میں بیٹھے لوگوں تک پہنچی اور انہیں یہ احساس ہوا کہ اب اس معاملے کو روکنا ضروری ہے۔ چنانچہ اس سلسلے کی گفتگو کے لئے PMO سے منورانا کے پاس فون آتا ہے ۔فون پر تاریخ اور وقت بھی طے ہوجاتا ہے۔لیکن منّو رانا کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے کہ وزیر اعظم سے ملنے،ان کا تنہا جانا مناسب نہیں ہے ،اور انہوں نے PMO کو فون کر کے کہہ دیا کہ ملنے کے مقررہ وقت کو منسوخ کر دیا جائے ،بعد میں کسی دن ملنے کی تاریخ طے کی جائے۔ PMO سے فون کی خبر کو بھی کافی سرخیاں ملیں اور ایک امید جگی کہ ملک کے اندر بڑھتی بے زاری اور عدم رواداری کو قدغن لگانے کی پہل کی جارہی ہے۔اس واقعہ کے بعد ایک ٹی وی چینل والے نے ان سے پوچھا کہ وزیر اعظم ان سے اگر ملتے ہیں،تو ان سے کیا مطالبہ کرینگے؟ جس کے جواب میں انہوں نے بلاشبہ بہت اچھی بات اور دانشورانہ ومدبرانہ بات کہی کہ...ملک میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے،اسے بند ہونا چاہئے ،اس سے ہماری برسہا برس کی گنگا جمنی تہذیب ،روایت اور رواداری پامال ہورہی ہے، ملک کے بے گناہ لوگ مارے جارہے ہیں، پورے ملک میں نا قابل برداشت مسموم فضا بن رہی ہے اگر اس پر ابھی قدغن نہیں لگایا گیا تو ملک کی سالمیت خطرے میں پڑ جائیگی۔ان حالات پر گفتگو کے لئے ،اگر میں وزیر اعظم سے ملتا ہوں تو ان سے میں وہ چمٹا مانگوں گا ، جو ملک راج آنند کے ناول THE FAIR میں ایک بچہ باپ کے ساتھ میلہ گھومتے ہوئے اپنے لئے کھلونوں کی بجائے ایک چمٹا لینا چاہتا ہے کہ اس کی ماں جب روٹیاں بناتی ہے تو اس کے ہاتھ جل جاتے ہیں۔اگر وزیر اعظم ایسا چمٹا دینے کا اور ملک کے ایسے حالات پر افسوس کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی مذّمت کرتے ہیں ، نیز ایسے سنگین سانحات پر قدغن لگانے کا وعدہ کرتے ہیں،تو وہ ملک کے امن وامان ،یکجہتی ،رواداری ، بھائی چارگی اور اخوت کے لئے ان کے جوتے بھی اٹھا لینے کو تیار ہیں ......جوتا اٹھانا ایک محاورہ ہے،جو تعظیم کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ملک کا سربراہ اگر ملک کے مصنفین ،،موٗرخین،سائنس دانوں،فلم سازوں اور فوجی افسران کے احساسات وجزبات کی قدر کرتے ہوئے افسوس کا اظہار کرتا ہے،تو پھر ایسے نفرت انگیز شخص کی تعظیم کے لئے ملک کا شہری تیار ہوگا۔اس لئے کوئی بھی شخص ہو، وہ شخص قابل نفرت نہیں ہوتا، بلکہ اس کا عمل قابل نفرت ہوتا ہے۔

اب مجھے کوئی یہ بتائے کہ منورانا نے ایسی کون سی غلط بات کہہ دی کہ مٹھی بھر لوگ مسلسل انہیں متنازعہ بنانے کی پیہم کوششوں میں مصروف ہیں ۔ منورانا ان لوگوں میں قطعی نہیں جو بقول خود منورانا

شہرت ملی تو اس نے بھی لہجہ بدل دیا
دولت نے کتنے لوگوں کا شجرہ بدل دیا

بلکہ منورانا وہ ہیں، جو وہ کہتے ہیں کہ

باپ کی دولت سے یوں دونوں نے حصہ لے لیا
بھائی نے دستار لے لی،میں نے جوتا لے لیا

اور جو لوگ منورانا کو جانتے ہیں اور ان کے مزاج سے واقف ہیں ،وہ اس امر کا بھی اعتراف ضرور کریں گے کہ منورانا کا

دل ایسا کہ سیدھے کئے جوتے بھی بڑوں کے
ضد اتنی کہ خود تاج اٹھا کر نہیں پہنا

منوررانا کی ضد اور سخت گیری کے ساتھ ہی ساتھ ان کی ہمت،حوصلہ ، جرأت کی بھی داد دینی ہوگی کہ انھوں نے ملک کے اندر بہت تیزی سے بڑھتی منافرت، فرقہ پرستی اور فسطائت پر خاموش تماشائی بنے رہنے والے سربراہ کو کھلم کھلا چیلنج کیا اور کہا کہ

اگر دنگائیوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا
تو پھر سن لے حکومت، ہم تجھے نامرد کہتے ہیں

منوررانا کو اگر کسی منصب کی چاہ ہوتی تو وہ اتر پردیش اردو اکادمی کی چیئر مین شپ،جس میں وزیر کا درجہ اور ساری سہولیات ملتی ہیں،اس پر صرف چند ماہ کے اندر ہی خودداری کی لات نہیں مار دیتے۔

اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ تنقید برائے تنقید کرنے سے بہتر ہے کہ پورے حالات اور سیاق وسباق کو پہلے سمجھا جائے،اس کے بعد ہی تنقید وتبصرہ ہو۔

## ''للکار''

جب کوئی خود کشی کا ارادہ کر لے تو اُسے روکنا ہر کس و ناکس کی بات نہیں ہوتی سو پیارے منور رانا جب تم نے یہ فیصلہ کر ہی لیا ہے تو ڈٹے رہو اور جابروں کو بے جگری سے للکارتے رہو۔میری دعائیں اور نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں کہ میں بھی اس دشت کا ایک سپاہی ہوں اور یہ دل ہی جانتا ہے کہ اس سیاحت میں مجھ اور میرے اہلِ خانہ پر کیا کچھ گزری ہے۔

احمد فراز

# ''کہوظلِّ الٰہی سے''

## تاج پیامی

(بھارت)

**ویدک** روایت میں خدا کو شاعر کہا گیا ہے اور کائنات اس کی شاعری ہے۔ جب ہم کائنات کا مطالعہ کرتے ہیں تو مختلف قسم کے نقوش اور تجربات سے دوچار ہوتے ہیں۔ پہاڑ کی سربلندی، سمندر کی گہرائی، میدان کی وسعت، جھرنوں کا نغمہ، دریا کی روانی، چڑیوں کا چہچہانا، پانی کا برسنا، پھولوں کی خوشبو، چاندستاروں کی جگمگاہٹ وغیرہ۔ افلاطون نے کہا ''دنیا عالم مثال کی نقل ہے اور شاعر نقل کی نقل کرتا ہے۔'' ارسطو نے کہا: ''شاعر زندگی کی نقل کرتا ہے اور تخئیل کی مدد سے جیسا ہونا چاہیے، ویسا بنا کر پیش کرتا ہے۔'' سڈنی نے کہا: ''شاعر نقل نہیں کرتا بلکہ تخلیق کرتا ہے۔ تخلیق کا مطلب یہ نہیں کہ زندگی سے ماورا کوئی چیز ہو بلکہ اسے بہتر بنا کر وجود میں لاتا ہے۔'' اس نے کہا: ''دنیا کو میں نے پیتل پایا، اسے سونا بنادیا۔'' اور اقبال نے کہا: ''تو شب آفریدی، چراغ آفریدم۔''

کائنات میں انسان کا وجود خود ایک شاہکار ہے۔ انسان کی نفسیات، اس کے جذبات و احساسات کا مطالعہ بہت دلچسپ اور حیرت انگیز ہے۔ شاعر خدا کی کائنات اور انسان کی فطرت دونوں کی شاعرانہ تعبیر پیش کرتا ہے۔ چونکہ شاعرانہ تعبیر کا زیادہ تر تعلق انسانی زندگی سے ہے، اس لیے شاعر اپنی شاعری میں زندگی کے محسوس تجربات کا اظہار کرتا ہے۔ تجربہ مذہب کا ہو یا محبت کا، سیاست کا ہو یا معاشرہ کا، گل کا ہو یا نغمہ کا، دیہات کا ہو یا شہر کا، شاعر ان کے کوائف اور مسائل سے متاثر ہوتا ہے۔ ہر شاعر کی اپنی ایک الگ انفرادی شخصیت ہوتی ہے۔ اس کی تخلیق پر اس کی انفرادیت اور شخصیت کا عنصر غالب ہوتا ہے، اس لیے جو چیز وہ پیش کرتا ہے، وہ نئی معلوم ہوتی ہے لیکن وہ کوئی نئی چیز ایجاد نہیں کرتا بلکہ وہ دریافت کرتا ہے اور یہ دریافت شدہ تخلیق شاعر کی شخصیت کو بھی پیش کرتی ہے اور اس کے عہد کو بھی۔

منوّر رانا کی کتاب ''کہوظلِّ الٰہی سے'' کے مطالعہ سے منوّر رانا کی شخصیت اور ان کی کائنات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ منوّر رانا ایک لائق فرزند، مخلص بھائی، بزرگوں کی عزت کرنے والا، بچوں سے پیار رکھنے والا، غریبوں اور مزدوروں کا ہمدرد اور ایک عاشق بھی ہے۔ اس کی کائنات میں شہر بھی ہے، دیہات بھی، شہر کی ریاکار سیاست ہے اور دیہات کا خلوص اور معصومیت۔ یہاں دولت مند بھی ہیں۔ غریب بھی، شہر یار بھی ہیں اور بے نوا بھی۔ مندر بھی ہے، مسجد بھی، ظالم بھی ہیں، مظلوم بھی۔ زاغ بھی ہے، کبوتر بھی۔ ایک غزل میں بیک وقت کئی حقائق پیش کیے جاتے ہیں اور ایک شعر میں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ باتیں کہی جاتی ہیں:

سو جاتے ہیں فٹ پاتھ پر اخبار بچھا کر
مزدور کبھی نیند کی گولی نہیں کھاتے

شاعر کا مشاہدہ بہت اہم ہے۔ اس نے ایک شعر میں بہت سی باتیں کہہ دی ہیں۔ مثلاً فٹ پاتھ کو لیجیے:

فٹ پاتھ: شہر کی شاہراہ سے متصل پیدل چلنے والوں کے لیے جو پتلا راستہ بنادیتے ہیں، اُسے ''فُٹ پاتھ'' کہتے ہیں۔ یہ گاؤں کی پگ ڈنڈی نہیں جس پر لوگ صرف چلتے ہیں۔ شہر کے فٹ پاتھ پر بے کار کے لوگ چلتے ہیں اور غریب سوتے ہیں۔

اخبار: جس کا صبح دم تازہ خبروں کے لیے بے چینی سے انتظار رہتا ہے، پڑھنے کے بعد بے کار ہو جاتا ہے۔ یہی اخبار کتنوں کو کرسی پر بیٹھاتا ہے اور کتنوں کو کرسی سے اتارتا ہے اور کتنوں کی نیندیں حرام کر دیتا ہے لیکن غریب مزدور اپنے لیے اخبار کو بطور بستر بچھا کر اس پر چین کی نیند سوتا ہے۔

نیند کی گولی: نیند کی گولی ذہنی تناؤ کو کم کرتی ہے اور قلب کو سکون بخشتی ہے۔ بڑے بڑے سیٹھ ساہوکار، جاگیردار، وڈیرے، دولت مند، تجارمل مالک، وزراء وغیرہ بنگلوں اور کوٹھیوں میں آرام دہ اور گدے دار بستر پر بھی نیند سے محروم رہتے ہیں۔ انھیں نیند کی گولی کھا کر سونا پڑتا ہے۔ لیکن شہر کے غریب مزدور کو سونے کے لیے نیند کی گولی نہیں کھانا پڑتی۔ وہ آرام دہ بستر کی جگہ اخبار بچھاتے ہیں اور سکون کے ساتھ سو جاتے ہیں۔

مزدور: ہندوستان کی ۴۵% فیصد آبادی خطِ غربت سے نیچے زندگی بسر کرتی ہے۔ اسے زندگی کی بنیادی ضرورت روٹی، کپڑا اور مکان میسّر نہیں۔ دیہات کی ۷۵% فیصد آبادی جو محض زراعت پر انحصار کرتی ہے، خشک سالی وغیرہ سے بیروزگار ہو کر شہر کی طرف مزدوری تلاش کرنے آتی ہے۔ شہر کی ۷۵% فیصد آبادی، کل کارخانے، تجارت، آمدورفت کے وسائل، عمارت کی تعمیر وغیرہ میں لگی ہوتی ہے۔ مزدور، جو کل کارخانوں، عمارت کی تعمیر، سڑک بنانے، ہوٹل وغیرہ میں لگے ہوتے ہیں، جنہیں سر چھپانے کے لیے اپنا گھر نصیب نہیں، وہ فٹ پاتھ کو اپنا گھر سمجھتے ہیں اور ردّی کے اخبار کو بستر۔ فٹ پاتھ پر اخبار بچھا کر رات بھر آرام سے سوتے ہیں۔

اخبار کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ اس میں قتل و غارت گری، لوٹ مار، آتشزنی، بھوک سے تنگ آ کر خودکشی، جہیز کی خاطر نئی نویلی دلہن کو جلانا وغیرہ کی خبریں بھی شائع ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے ان دل خراش خبروں کا اثر ایک حساس شخص پر پڑنا ضروری ہے۔ شاعر کا چہرہ دیکھ کر شہر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

تم اپنے شہر کے حالات جان سکتے ہو
میں اپنے چہرے کو اخبار کرنے والا ہوں

مزدوروں سے متعلق چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہمیں مزدوروں اور محنت کشوں کی یاد آتی ہے

عمارت دیکھ کر کاری گروں کی یاد آتی ہے
بوجھ اُٹھانا شوق کہاں ہے مجبوری کا سودا ہے
رہتے رہتے اسٹیشن پر لوگ قلی ہو جاتے ہیں
ہمارے ساتھ چل کر دیکھ لیں یہ بھی چمن والے
یہاں اب کوئلہ چنتے ہیں پھولوں سے بدن والے
کون ہنستے ہوئے ہجرت پہ ہوا ہے راضی
لوگ آسانی سے گھر چھوڑ کے کب جاتے ہیں
ہجرت کی آندھیوں نے گرائے بہت سے پیڑ
کتنے ہی میرؔ چھوڑ کے دِلّی چلے گئے

ہندوستان کے چار سب سے بڑے شہر دِلّی، کلکتہ، ممبئی اور چنئی ہیں۔ منوّر رانا کلکتہ میں رہتے ہیں۔ وہ اس شہر کی ساری خوبیوں اور خامیوں سے واقف ہیں۔ ان کے اثرات جو حسّاس دل شاعر پر مرتب ہوئے، انھیں شعر کے قالب میں یوں ڈھالا ہے:

جل رہے ہیں دھوپ میں لیکن اسی صحرا میں ہیں
کیا خبر وحشت کو ہم بھی شہر کلکتہ میں ہیں
بڑے شہروں میں قربانی کا موسم جب سے آیا ہے
مرے بچے کبھی ہولی میں پچکاری نہیں لاتے
بڑا گہرا تعلق ہے سیاست سے تباہی کا
کوئی بھی شہر جلتا ہے تو دِلّی مسکراتی ہے
امیر شہر کی ہمدردیوں سے بچ کے رہو
یہ سر سے بوجھ نہیں سر اُتار لیتا ہے
شہر کے شور سے گھبرا کے اگر بھاگو گے
پھر تو جنگل میں بھی وحشت نہیں رہنے دے گی
ہماری چیختی آنکھوں نے جلتے شہر دیکھے ہیں
بُرے لگتے ہیں اب قصّے ہمیں بھائی بہن والے

ظاہر ہے جب شہر کی صورت حال یہ ہے تو شاعر کو گاؤں کی یاد آنا لازمی ہے:

تمہارے شہر کی یہ رونقیں اچھی نہیں لگتیں
ہمیں جب گاؤں کے کچّے گھروں کی یاد آتی ہے

گھر کے ساتھ اگر ماں باپ کا سایہ بھی نصیب ہو تو کیا کہنا:

میرا بچپن تھا مرا گھر تھا کھلونے تھے مرے
سر پہ ماں باپ کا سایہ بھی غزل جیسا تھا

ماں اور بچہ کے رشتے پر بھی شاعر نے بہت سے خوبصورت اشعار کہے ہیں:

کھانے کی چیز ماں نے جو بھیجی ہیں گاؤں سے
باسی بھی ہو گئیں ہیں مگر لذت وہی رہی
کچھ نہیں ہوگا تو آنچل میں چھپا لے گی مجھے
ماں کبھی سر پہ کھلی چھت نہیں رہنے دے گی
بہن کا پیار ماں کی مامتا دو چیختی آنکھیں
یہی تحفے تھے جن کو میں اکثر یاد کرتا تھا
محبت کرتے جاؤ بس یہی سچی عبادت ہے
محبت ماں کو بھی مکہ مدینہ بنا دیتی ہے

ان اشعار میں جو مضمون پیش کیا گیا ہے، اس کی مثالیں روایتی شاعری میں شاذ و نادر ہیں۔ موجودہ دور کے کچھ شعراء اپنے اشعار میں شہر، مکان، گھر، ماں جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ منوّر رانا کے یہاں سچائی ہے، صداقت ہے، خلوص ہے اور یہی چیز انہیں دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔

میں نے کہا ہے منوّر رانا ایک عاشق بھی ہے۔ دل ہے تو وہ محبت سے معمور بھی ہوگا۔ ہر شخص چاہتا ہے وہ کسی کو چاہے اور اسے بھی کوئی چاہے اور یہی محبت ہے۔ شاعر کا دل بھی جذبہء محبت سے معمور ہے لیکن اس عشق میں ابتذال نہیں، سوقیانہ پن نہیں۔ کہتے ہیں لیلیٰ مجنوں کا عشق مکتب سے شروع ہوا تھا، منوّر رانا نے بھی عشق کی تعلیم مکتب میں حاصل کی:

مکتبِ عشق ہی اک ایسا ادارہ ہے جہاں
فیس تعلیم کی بچوں سے نہیں لی جاتی

اور غالبؔ کا عشق بھی لڑکپن ہی سے شروع ہوا تھا:

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

منوّر رانا کہتے ہیں:

تیری گلی کو دیکھ کے آیا ہمیں خیال
ہم جیسے اس جگہ کبھی بچپن میں آئے تھے
ہجر میں پہلے پہل رونا بہت اچھا لگا
عمر کچی تھی تو پھل کچا بہت اچھا لگا

اور پھر یہ شعر:

عشق میں رائے بزرگوں سے نہیں لی جاتی
آگ بجھتے ہوئے چولہوں سے نہیں لی جاتی

شاعر نے عشق کو تہذیب عطا کی ہے، شعور بخشا ہے:

محبت کرنے والا زندگی بھر کچھ نہیں کہتا
کہ دریا شور کرتا ہے سمندر کچھ نہیں کہتا
تجھ سے ملتی جلتی ہوگی ایسی غزل کہہ سکتا ہوں
میں چاہتا ہوں کہ تجھ پر کسی کا حق نہ رہے

حسرتؔ موہانی کا محبوب دوپہر کی دھوپ میں ننگے پاؤں چھت پر آتا تھا۔ ہمارا عاشق بھی چھت پر اپنے محبوب کو ڈھونڈنے نکلتا ہے مگر دھوپ اتنی تیز ہے کہ اتنی تیز دھوپ میں مزدور بھی چھت پر کام کرنے نہیں آتے:

اس وقت بھی اکثر تجھے ڈھونڈنے نکلے
جس دھوپ میں مزدور بھی چھت پر نہیں آتے

میرا خیال ہے مؔوررانا پہلا شاعر ہے، جس نے عاشق اور مزدور میں رشتہ قائم کیا ہے۔ایک شکم سے مجبور ہے، دوسرا دل سے۔دل کا معاملہ شکم پر غالب آتا ہے۔ آرام طلب کبھی عشق نہیں کرسکتا۔بقول مؔیر:

ہوگا کس دیوار میں پڑا مؔیر
کیا کام محبت سے ہے آرام طلب کو

یوں تو شعروشاعری میں ہر لفظ علامت ہے لیکن مؔوررانا کی شاعری میں روایتی شاعری کے علائم گل وبلبل نہیں ملیں گے۔ان کی شاعری بیانیہ شاعری کی بہترین مثال ہے۔اس میں ترقی پسندوں کی نعرہ بازی اور شکم پروری نہیں اور نہ جدیدیوں کی طرح معنی سے بے گانہ گنجلک اندازِ بیان ہے بلکہ مؔوررانا کی شاعری تیسری آواز کی شاعری ہے۔لہجہ نہایت متین، مہذب اور سلجھا ہوا ہے۔اُسلوب میں خارجی افکار اور داخلی کوائف کا خوب صورت امتزاج پایا جاتا ہے۔

مؔوررانا کی کتاب ''کہوظلِ الٰہی سے'' سے چند اشعار اور پیش کرنا چاہوں گا جن سے فکروکیف کی مختلف جہتیں واضح ہونگی:

کئی گھر ہو گئے برباد خودداری بچانے میں
زمینیں بک گئیں ساری زمینداری بچانے میں
مجھے گھر بھی بچانا ہے وطن کو بھی بچانا ہے
مرے کاندھے پہ ذمہ داریاں دونوں طرف سے ہیں
یہاں رہو گے تو کچھ دن میں جان جاؤ گے
ضمیر بیچنے والا کمائی کرتا ہے
گفتگو فون پہ ہو جاتی ہے رؔانا صاحب
اب کسی چھت پہ کبوتر نہیں پھینکا جاتا
پیدا یہیں ہوا ہوں یہیں پر مروں گا میں
وہ اور لوگ تھے جو کراچی چلے گئے
کمھلا دیئے ہیں پھول سے چہرے فساد نے
معصومیت بھی نوک سناں تک پہنچ گئی
بے کفن لاشوں کے انبار لگے ہیں لیکن
فخر سے کہتے ہیں ہم تاج محل والے ہیں
اب مدرسے بھی ہیں تیرے شر سے ڈرے ہوئے
جائیں کہاں پرندے شجر سے ڈرے ہوئے
ہم میں اقداد کی بو باس نہیں ہے ورنہ
ہم جہاں سر کو جھکا دیں وہ عرب ہو جائے
کون پھر ایسے میں تنقید کرے گا تجھ پر
سب ترے جبہ و دستار میں کھو جاتے ہیں
ہمیں اے زندگی تجھ پر ہمیشہ رشک آتا ہے
مسائل سے گھری رہتی ہے پھر بھی مسکراتی ہے

''کہوظلِ الٰہی سے'' کی غزلوں کے اشعار آب دار موتی ہیں جن کی چمک دمک ہمیشہ قائم رہے گی۔

☆

## شجرِ ممنوعہ کے تین پتے

سیمیں کرن کی کہانیوں کے اسلوب وانداز مختلف ہیں۔یہاں زیست کے شب وروز، سوزفراق سے ہم آہنگ ہیں۔ایک دردناک اور عشق ناک دھند ہے جو اضطراب وبلا اورغموں سے نجات کے لیے تصوف اور روحانیت کی طرف قدم بڑھاتی ہے۔مسزعبدالقادر اور حجاب امتیاز علی کی کہانیوں میں جو آسیبی اُفق جھلملاتا تھا،سیمیں کی شناخت کا یہ اُفق نور کی تجلی،عشقِ حقیقی،تزکیۂ نفس سے عبارت ہے۔بقول رومی، بانسری کے نغمات دراصل درد کی صدا ہیں۔۔۔جب باغ جھلس جاتا ہے، ہم پھول کی خوشبو تلاش کرنے نکل جاتے ہیں۔اسی لیے سیمیں کرن کی کہانیوں میں ایک چیخ ہے۔۔۔لیکن یہ چیخ ایک عورت کی چیخ نہیں۔۔۔یہ بند معاشرے کی چیخ نہیں۔۔۔یہ چیخ کسی گھٹن،استحصال، جبر یا ظلم سے برآمد نہیں ہوئی،اس چیخ میں صدیوں کے انسانی سفر کی گونج بھی شامل ہے۔سیمون دبورانے کہا تھا۔۔عورت پیدا نہیں ہوتی بنائی جاتی ہے۔سیمیں کرن اس خیال کو تسلیم نہیں کرتیں وہ اپنی کہانیوں میں فکر کی جولانی اور روح کی دستک سے نئے فلسفے تراشتی ہیں۔۔۔ان کے یہاں روح ایک ایسی علامت ہے جو جسمانی نظام کی صعوبتوں سے الگ ایک نئی دنیا کی تشکیل وتعمیر میں مصروف نظر آتی ہیں۔

مشرف عالم ذوقی

# ''آبِ رواں کا عاشق''

نوشاد مومن

(کولکتہ، بھارت)

دنیائے فنونِ لطیفہ میں شعروادب کی تاریخ جتنی پرانی ہے، اتنی ہی پرانی مشاعرے کی روایت بھی۔ لہٰذا اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی ہے کہ اردو شاعری کو جلا بخشنے میں مشاعروں نے اہم رول ادا کیے ہیں۔ مشاعروں کی آوازوں کے ہجوم میں اپنے شعور وادراک کو غزل کا جامہ پہنا کر ایک مخصوص لہجہ اور ڈکشن کے بل بوتے پر اپنی شناخت قائم کرنا دراصل ایک کرشمہ ہے، جو بمشکل چند ہی شاعروں کا حصّہ رہا ہے۔ اُن معددے چند شاعروں میں منوّر رانا کی حیثیت ہراوّل دستہ کی ہے، جنہیں اپنی غزل کی معنویت اور مخصوص ادائے شعری کے حسین امتزاج سے مشاعروں کو لوٹنے اور سامعین سے دادو تحسین وصول کرنے کا ہُنر خوب آتا ہے۔

۲۰ رویں صدی کی ساتویں دہائی میں شاعری کا آغاز کرنے والوں میں منوّر رانا نے اپنے پُر جلال اظہار، ریڈیائی آواز، ۔۔۔۔۔لب ولہجہ اور جن و عروض کی صحت مند روایات کے احترام والتزام کے ساتھ زندگی کی مطاق حقیقتوں کا مظاہرہ کرکے نہ صرف پورے برصغیر میں مغربی بنگال کی نمائندگی کی بلکہ اردو شاعری کی عالمی بستیوں میں نمایاں مقام بھی حاصل کیا۔ منوّر رانا کا پورا نام سید منور علی ہے۔ اُن کی پیدائش ۲۶ رنومبر ۱۹۵۲ء میں اتر پردیش کے ضلع رائے بریلی میں ہوئی۔ اُن کے والد کا نام سیّد انور علی اور والدہ کا نام عائشہ خاتون ہے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم شعیب ودیالیہ اور گورنمنٹ انٹر کالج، رائے بریلی سے حاصل کی۔ چونکہ ان کے والد کشا کشِ روزگار سے نبرد آزما ہوتے ہوئے ۱۹۶۴ء میں کلکتہ منتقل ہو گئے تھے لہٰذا انہیں بھی ۱۹۶۵ء میں پہلی مرتبہ کلکتہ آنا پڑا لیکن اسی سال ہندو پاک جنگ کا بگل بج جانے کے پیشِ نظر انہیں اودھ (لکھنؤ) بھیج دیا گیا۔ جہاں انہوں نے سینٹ جانس ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اس طرح سیّد منور علی لکھنؤ میں اپنے قیام کے دوران نہ صرف اودھ کی حسین اور سرمئی شام کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے رہے بلکہ انہوں نے وہاں کے روایتی ماحول سے اپنی زبان وبیان کی بنیادیں پختہ کرنے کے سنہرے مواقع بھی ضائع نہیں کیے۔ بعد ازاں انہیں ۱۹۶۸ء میں دوبارہ کلکتہ بلوایا گیا، جہاں انہوں نے محمد جان ہائر سکنڈری اسکول سے ہائر سکنڈری کی تعلیم مکمل کی اور گریجویشن کی ڈگری کے لیے کلکتہ کی ہی امیش چندرا کالج میں بی۔ کام۔ کے لیے داخلہ لے لیا۔

کسی بھی شخصیت کے بارے میں کچھ قلم بند کرنے سے قبل ایمانداری کا یہی تقاضا ہے کہ اس سے براہ راست ملاقات کرکے اس کی شخصیت کی تہ بہ تہ گرہیں کھولی جائیں تاکہ قارئین کو اس کے مختلف پہلوؤں سے بخوبی روشناس کرایا جا سکے۔ چنانچہ راقم الحروف موصوف سے ملاقات کی غرض سے ان کے دفتر پہنچا تو ذہن میں طرح طرح کے سوالات ابھر رہے تھے، کیونکہ ''بزم یاراں'' نے منور رانا کی شخصیت کی عکاسی ایک بے ظرف، بے باک اور مغرور کے روپ میں کر رکھی تھی۔ تصنع سے قطع نظر، مجھے یہ عرض کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ پہلی ملاقات میں ہی میرے دل کے خانوں میں بسے ہوئے موصوف کے متعلق بے ظرف اور مغرور جیسے الفاظ بے معنی ہو کر رہ گئے۔ ہاں، وہ بے باک ضرور ہیں۔ اس بات کے سبھی قائل ہیں کہ انسان کے ظرف کا تعلق ضمیر سے ہوتا ہے اور ضمیر کا دل سے۔ وہ انسان ہی کیا، جس کا ضمیر بے صدا ہو۔ منوّر رانا زندہ دل ہیں اسی لیے ان کا ضمیر بھی زندہ ہے اور زندہ دل زندہ ضمیر لوگ بے ظرف نہیں باظرف ہوا کرتے ہیں۔ موصوف جتنے بے باک، بے لاگ اور حاضر جواب ہیں، اتنے ہی خوش مزاج، ملنسار اور خلیق بھی۔ اپنی زندگی کے ابتدائی قیام میں انہیں بے انتہا صعوبتیں، جھیلنی پڑیں اور انہیں تیز دھوپ کی تمازت میں بھی کسی سایہ دار پیڑ کے نیچے آرام کرنے کے بجائے زندگی کے نشیب وفراز اور تلخ و شیریں تجربات سے گزرنا پڑا۔ ایسے صبر آزما حالات سے دوچار ہونے والے جب ظلِ الٰہی کے انعام واکرام سے نوازے جاتے ہیں تو اکثر اپنے ماضی کو فراموش کر دیتے ہیں۔ لیکن منوّر رانا نے کبھی اپنے ماضی کو فراموش نہیں کیا، کیونکہ انہیں یقین کامل ہے کہ خدا جب کسی کو سب کچھ عطا کرسکتا ہے تو وہ اسے جب چاہے چھین بھی سکتا ہے۔ شاید اسی لیے منوّر رانا نے خدائے برتر کی دی ہوئی نعمتوں کا غلط فائدہ نہیں اٹھایا اور ان نعمتوں کو پریشان حال لوگوں میں اپنی بساط سے بڑھ کر تقسیم کرنے میں پیچھے نہیں ہٹتے۔ ان کے دل میں جذبہ پروری کوٹ کوٹ کر بھری ہے لہٰذا منوّر رانا کی ادبی شخصیت کو پروان چڑھانے میں اردو زبان وادب کا خطہ خاص لکھنؤ کے ماحول کے علاوہ ان کے ادب نواز بزرگ سیّد صادق علی کا گہرا اثر رہا ہے، جوان سے عہدِ طفلی میں دوسروں کی غزلیں باقاعدہ پڑھوایا کرتے تھے تاکہ ادب میں ان کی دلچسپی پڑھے اور انہیں تحریک ملے، جس نے آگے چل کر حقیقت کا روپ دھار لیا۔ شاید یہ اسی ریاضت کا ثمرہ ہے کہ منوّر رانا کو آج بھی ہزارہا اشعار ازبر ہیں۔ زمانہء طالبِ علمی سے منور رانا بے حد شرارتی اور عاشق مزاج واقع ہوئے۔ حسن، فلم اور شاعری ان کی کمزوری تھی۔ کمزوری جب کسی شخصیت پر حاوی ہو جائے تو اس کے ذہن ودل میں کوئی اور چیز راہ نہیں پاتی۔ منوّر رانا کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ پہلے پہل وہ شاعری سے ازحد متاثر ہو گئے تھے لیکن عہدِ شباب میں اپنے مزاج کی ناہمواری کی وجہ سے ان کی آنکھیں فلم کی مصنوعی چمک دمک سے چکاچوند ہو گئیں۔ لہٰذا وہ فلم کی طرف مائل ہو گئے اور فلم سے وابستگی کی ٹھان لی۔ جس کی شروعات انہوں نے فلمی ہیرو کی آوازوں کی نقالی سے کی۔ اس عمل میں منوّر رانا کئی فلمی ستاروں کی آوازیں نقل کرنے میں ماہر ہو گئے لیکن فلم اسٹار شتروگھن سنہا کی آواز کی نقل اس حد تک کرنے لگے کہ حقیقت کا گمان ہونے لگا اور انہیں ''کلکتہ کا شتروگھن سنہا'' بھی کہا جانے لگا۔

نتیجتاً فلمی ستاروں کے اسٹیج پروگراموں کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے ان کی اناؤنسنگ لازم وملزوم ہوگئی۔ انہی دنوں منوّر رانا نے کچھ افسانے اور منی کہانیاں بھی لکھیں جو کئی مقامی اخباروں میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئیں۔ چونکہ ان کے سر پر فلم کا آسیب سوار تھا لہٰذا ان کا ڈراموں کی طرف راغب ہونا ایک فطری عمل تھا۔ اس طرح ۱۹۷۱ء میں انہوں نے اپنا پہلا ڈراما ''جئے بنگلہ دیش'' کلکتہ کے ہومیوپیتھی کالج میں منعقدہ سہ لسانی ڈراما مقابلے کے لیے نہ صرف یہ کہ تحریر کیا بلکہ اس کی ہدایت کاری بھی انجام دی اور جسے انعام یافتہ بھی قرار دیا گیا۔ اسی پر بس نہیں، انہوں نے پرتھوی راج اور آغا حشر کاشمیری کے کئی ڈراموں میں اپنی اداکاری کے جوہر بھی دکھائے۔ بالخصوص سجن کمار کی زیرِ ہدایت آغا حشر کاشمیری کا ڈراما ''آنکھ کا نشہ'' میں بنی پرشاد کے مرکزی کردار میں ان کی اداکاری اتنی پسند کی گئی کہ اس ڈراما کے کئی کامیاب شوز منعقد کیے گئے۔ بالآخر انہوں نے فلم اداکار، ہدایت کار اور پروڈیوسر جوگندر کی ایک فلم ''گیتا اور قرآن'' کے لیے کہانی لکھ کر ہی دم لیا، جس کا ٹائٹل اندراج بھی ہوا تھا لیکن کسی وجہ سے فلم بن نہیں سکی۔ اس ناکامی کا یہ نتیجہ نکلا کہ ان کے سر سے فلم کا آسیب ہی اتر گیا اور وہ مغربی بنگال کی تاریخِ شاعری کی زندہ روایات کا پاس رکھنے کا مستحکم عزم لے کر میدانِ شاعری میں کود پڑے اور اس فن میں انہوں نے غزل کو اپنا وسیلہء اظہار بنایا۔

غزل اپنی نزاکت، شوخی، رمزوایما، جذبات اور احساسات نگاری کے لیے مشہور ہے۔ نزاکت اور شوخی محبوب سے منسوب ہے تو جذبات و احساسات دل سے۔ اسی لیے غزل کا رشتہ محبوب اور دل سے ہے۔ لہٰذا اس بات پر سبھی متفق ہیں کہ احساسات وجذبات کی چنگاری جب دل سے نکلتی ہے تو وہ شعلہ بن جاتی ہے، جس کی تپش سے زندگی میں ایک عجیب قسم کی تاب، کیف، کشش اور حلاوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس امر پر اپنا ایمان رکھتے ہوئے گلستانِ شاعری میں سیّد منور علی نے خود کو ۷۰۔۱۹۶۹ء میں قلبی واردات، احساسات اور جذبات کی چنگاری سے ''منور علی آتش'' بن کر متعارف کرایا۔ اس طرح میدانِ شعروسخن کے ابتدائی دنوں میں موصوف پروفیسر اعزاز افضل کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گئے اور ان سے اکتسابِ فیض کرتے ہوئے اپنی شعلہ بیانی کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ ہرچند کہ انہوں نے اپنی عمر کے سولہویں پڑاؤ میں پہلی نظم کہی جو محمد جان ہائر سکنڈری اسکول کے مجلّے میں چھپی لیکن بحیثیت شاعر ان کی پہلی تخلیق ۱۹۷۲ء میں منور علی آتش کے نام سے کلکتہ کے ایک معیاری رسالہ ماہنامہ ''شہود'' میں شائع ہوئی۔ آگے چل کر منوّر رانا نے نازشؔ پرتاپ گڑھی اور رازؔ الہٰ آبادی کے مشوروں سے اپنا تخلص بدلا اور ''منوّر علی شاداںؔ'' بن کر اپنی غزلوں میں گل بوٹے ٹانکنے لگے۔ بعد ازاں انہوں نے جب والی آسیؔ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا تو ان کے مشورے سے ۱۹۷۷ء میں ایک مرتبہ پھر اپنا تخلص بدلا اور ''منوّر رانا'' بن گئے۔ اس طرح سیّد منوّر علی کو ''منوّر علی آتش'' سے ''منوّر علی شاداں'' اور پھر ''منوّر علی شاداں'' سے ''منوّر رانا'' بننے تک پورے نو سال کا عرصہ لگ گیا۔ اس مدت میں انہوں نے نہایت سنجیدگی سے اپنی مشقِ سخن جاری رکھی اور اپنی فکر کی پرواز کو اوجِ کمال تک پہنچایا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ غزل پر انہوں نے منوّر رانا بن کر اپنی بیداری کا چراغ روشن کیا تو اردو شاعری کی دنیا کو ہی منور کر دیا اور لوگ اس ضوفشاویے کی نرم و نازک روشنی سے حیرت زدہ رہ گئے۔

منوّر رانا کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ وہ جس موضوع کو اپنے اشعار کے سانچے میں ڈھالتے ہیں اسے بڑی دلیری اور برجستگی سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اظہارِ خیال کے لیے اپنی غزلوں کے الفاظ وبیان میں ملمع سازی سے کام نہیں لیتے ہیں بلکہ اپنی زندگی کے تجربات، حادثات اور عصرِ حاضر کے مشاہدات کو نہایت سلیقے اور جرات مندی سے قارئین وسامعین تک اپنے اشعار کے ذریعہ پیش کرتے ہیں۔ شاید یہی خصوصیت ان کی کامیاب شاعری کی ضامن ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

یہاں تو جو بھی ہے آبِ رواں کا عاشق ہے
کسی نے خشک ندی کی طرف نہیں دیکھا

کرفیو میں اور کیا کرتے مدد اک لاش کی
بس اگربتی کی صورت ہم سرہانے لگ گئے

وزارت کے لیے ہم دوستوں کا ساتھ مت چھوڑو
ادھر اقبال آتا ہے اُدھر اقبال جاتا ہے

بلندی دیر تک کس شخص کے حصہ میں رہتی ہے
بہت اونچی عمارت ہر گھڑی خطرے میں رہتی ہے

اب رُلایا ہے تو ہنسنے پر نہ مجبور کرو
روز بیمار کا نقشہ نہیں بدلا جاتا

منوّر رانا کے متعدد شعری مجموعے ''غزل گاؤں'' (۱۹۸۰ء)، ''پیپل چھاؤں'' (۱۹۸۵ء)، ''مور پاؤں'' (۱۹۸۹ء)، ''نیم کے پھول'' (۱۹۹۳ء)، ''سب اس کے لیے'' (۱۹۹۵ء)، ''بدن سرائے'' (۱۹۹۸ء) اور ''کہو ظلِ الٰہی سے'' (۲۰۰۱ء) میں منصۂ شہود پر آ کر اہلِ شعروادب سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ جس کے عمیق مطالعے سے یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری مقدس رشتوں کی پاکیزگی اور احترام سے عبارت ہے۔ دنیا کے تمام رشتوں میں ''ماں'' کے رشتے کو نہایت مقدس اور پاکیزہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ منوّر رانا کا بھی اس رشتۂ عظیم سے نہ صرف دلی لگاؤ ہے بلکہ اس سے ان کی گہری اُنسیت بھی ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ محبت کے جذبوں کا اظہار آسان نہیں ہوتا لیکن منوّر رانا نے اس جذبے کا بھی خوب اظہار کیا ہے اور ہر ممکن موقعے پر ''ماں'' کے تصور کو نہایت خوبصورتی سے اپنے اشعار کے قالب میں ڈھالا ہے۔ منوّر رانا نے جس کثرت سے لفظ ''ماں'' کا استعمال کیا ہے، ان کے معاصر شعراء میں اس خصوصیت کا زبردست فقدان ہے۔ یہی نہیں بلکہ اردو شعروسخن کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ایسے شعراء خال خال ہی ہیں جن کا ہاں ''ماں'' کے مقدس رشتوں کی

پاسداری ملتی ہے۔ اس لیے اگر منوّر رانا کو ایک اجتہادی اور مقدس رشتوں کا پاسدار شاعر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

تیرے دامن میں ستارے ہیں تو ہوں گے اے فلک
مجھ کو اپنی ماں کی میلی اوڑھنی اچھی لگی
محبت کرتے جاؤ بس یہی سچی عبادت ہے
محبت ماں کو بھی مکہ مدینہ مان لیتی ہے
منوّر ماں کے آگے یوں کبھی کھل کر نہیں رونا
جہاں بنیاد ہو اتنی نمی اچھی نہیں ہوتی
کچھ نہیں ہوگا تو آنچل میں چھپا لے گی مجھے
ماں کبھی سر پہ کھلی چھت نہیں رہنے دے گی
یہ ایسا قرض ہے جو میں ادا کر ہی نہیں سکتا
میں جب تک گھر نہ لوٹوں میری ماں سجدے میں رہتی ہے

گاؤں کی مٹی سے منوّر رانا بیحد مانوس نظر آتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ گاؤں کے سیدھے سادے لوگوں کے قول وعمل میں تضاد ہوتا ہے، نہ ریا کاری اور نہ ہی اداکاری ہوتی ہے۔ اس مادّی دنیا میں شرم، حیا، غیرت، محبت، شرافت اور مروّت باقی ہے، تو وہ گاؤں میں ہے۔ گاؤں میں بسنے والے اپنی دیوار حیات پر رنگ وروغن چڑھا کر نمائش اور بناوٹ کے اصول پر کار بند نہیں رہتے بلکہ سچائی، سادگی، خلوص اور وظاہر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ منوّر رانا نے اپنے غزلیہ اشعار میں ''گاؤں'' کو ان ہی صفات کے لیے برتا ہے۔ ملاحظہ ہوں ذیل کے اشعار:

تمہیں سچی محبت کے کئی قصے سنائے گا
ہمارے گاؤں آنا تم وہاں اک پان والا ہے
وہ ایک شخص جو بچپن سے میرے گاؤں میں ہے
یہ جانتا نہیں کوئی کہ دیوتاؤں میں ہے
ابھی موجود ہے اس گاؤں کی مٹی میں خودداری
ابھی بیوہ کی غیرت سے مہاجن ہار جاتا ہے
ابھی لہجے میں تھوڑی سی انا کی دھوپ باقی ہے
ابھی تک ایک کمرہ گاؤں میں دالان والا ہے

منوّر رانا ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہیں، اس لیے ان کی سرشت میں جذبۂ اسلام موجزن ہے اور جس کی ترجمانی کرنا ان کا اہم فریضہ ہے۔ ان کے اشعار میں اسلامی تاریخ کی داستان ابھر کر سامنے آتی ہے جس کا مقصد واحد شاعر کا ان ناقابلِ فراموش واقعات سے آگاہ کرا کر ہمیں خود شناسی کی دعوتِ فکر دینا ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ اشعار:

اس قوم کو تلوار سے سر نہیں ملتا
تم نے کبھی محرم کا ماتم نہیں دیکھا
بھلا دل میں ہمارے کوئی کافر کس طرح آتا
خدا کے گھر میں تھوڑی سی بھی ناپاکی نہیں چلتی
ہم میں اجداد کی بو باس نہیں ورنہ
ہم جہاں سر کو جھکا دیں وہ عرب ہو جائے
اس چہرے میں پوشیدہ ہے اس قوم کا چہرہ
چہرے کا اُتر جانا مناسب نہیں ہوگا
کبھی کبھی مجھے یوں بھی اذاں بلاتی ہے
شریر بچے کو جس طرح ماں بلاتی ہے

مادرِ وطن سے منوّر رانا کی محبت اور وفاداری کا جذبہ بھی نمایاں ہے۔ وہ ملک میں روبہ انحطاط اخلاقی گراوٹ سے دل برداشتہ ہوتے ہیں اور ہماری تہذیب، ثقافت وتمدن کی بحالی کی کوشش میں اپنے اشعار کو زبان کا لبادہ عطا کرتے ہیں۔ چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

گلے ملتے ہیں موسم سے جہاں موسم دکھائیں گے
الٰہ آباد آنا ہم تمہیں سنگم دکھائیں گے
میرے بزرگوں کا سایہ تھا جب تلک مجھ پر
میں اپنی عمر سے چھوٹا دکھائی دیتا تھا۔
ہم ہیں وقت کی تہذیب کے روشن چراغ
فخر کر ارضِ وطن ہم آج تک دنیا میں ہیں

اس امر سے ہر حساس اور باشعور شخص بخوبی واقف ہے کہ موجودہ عہد میں سیاست نے نہ صرف ہماری سماجی اور معاشی زندگی کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر چھوڑی ہے بلکہ سیاستدانوں نے ملک کی روایتی، قومی ہم آہنگی، امن و آشتی اور انسان دوستی کو اپنی سیاسی بساط پر مہرے کی طرح استعمال کیا ہے تا کہ ان کی سیاسی دکانیں چمک سکیں۔ منوّر رانا کو بھی ہر لمحہ اس کا احساس ہے اور یہ احساس جب شدت اختیار کر لیتا ہے تو شاعر اسے اپنے قرطاس پر یوں بکھیرتا ہے:

بڑا گہرا تعلق ہے سیاست سے تباہی کا
کوئی بھی شہر جلتا ہے تو دلّی مسکراتی ہے
طوائف کی طرح اپنی غلط کاری کے چہرے پر
حکومت مندر و مسجد کا پردہ ڈال دیتی ہے
سپاہی مورچے سے عمر بھر پیچھے نہیں ہٹتا
سیاست داں زباں دے کر بہ آسانی پلٹتا ہے
دنیا میرے کردار پہ شک کرنے لگے گی
اس خوف سے میں نے کبھی کھدّر نہیں پہنا
سیاسی وار بھی تلوار سے کچھ کم نہیں ہوتا
کبھی کشمیر جاتا ہے کبھی بنگال کٹتا ہے

اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ہمارے سماج اور معاشرے کی ہر برائی کی واحد وجہ سرمایہ دارانہ نظام اور غیر مساوی تقسیمِ زر ہے۔ جس کی وجہ سے پوری قوم

کا مستقبل داؤ پر لگا ہوا ہے۔ بالخصوص نئی نسل کچھ ایسے ذہنی کرب واضطراب میں مبتلا ہے کہ موجودہ دور میں اُسے نہ کوئی روشنی نظر آ رہی ہے اور نہ ہی امید کی کوئی کرن دکھائی دے رہی ہے۔ غریب، غریب تر ہوتے جا رہے ہیں اور امیر، امیر تر۔

منوّر رانا کو بھی اس کا علم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں غریبوں اور مزدوروں کے ناگفتہ بہ حالات اور ان پر ہونے والے ظلم وستم اور استحصال کے خلاف برہمی اور احتجاج کی لے شدت اختیار کر گئی ہے مگر اس میں نعرے بازی نہیں بلکہ حقیقی زندگی کی برہنہ عکاسی ہے، جو انہیں ترقی پسند اور حقیقت نگار شاعروں میں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے:

کھیتیاں خون پسینہ بھی طلب کرتی ہیں
صرف نعروں سے غریبی نہیں جانے والی
مفلسی نے سارے آنگن میں اندھیرا کر دیا
بھائی خالی ہاتھ لوٹے اور بہنیں بجھ گئیں
بازار میں عجیب کل اک حادثہ ہوا
مزدور کے پسینے کو ریشم نے پی لیا
بھٹکتی ہے ہوس دن رات سونے کی دکانوں میں
غریبی کان چھدواتی ہے تو تنکا ڈال دیتی ہے
شرم آتی ہے مزدوری بتاتے ہوئے ہم کو
اتنے میں تو بچے کا غبارہ نہیں ملتا
غریبوں پر تو موسم بھی حکومت کرتے رہتے ہیں
کبھی بارش، کبھی گرمی، کبھی ٹھنڈک کا قبضہ ہے

عصر حاضر میں اردو شاعری کا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت واشگاف ہوگی کہ اردو شاعری پوری طرح یکسانیت کی شکار ہے اور شعراء چند بندھے ٹکے موضوعات کو دہرانے کے عمل میں سرگرم داں ہیں۔ منوّر رانا کی شاعری اس لیبل سے مستثنیٰ ہے، کیونکہ انہوں نے کبھی کسی کی تقلید نہیں کی بلکہ اپنے مخصوص لب و لہجہ اور عصرِ جدید کے ہر ممکن تقاضے کی پختہ اینٹوں پر اپنی عمارت تعمیر کی ہے۔ اس لیے انہیں ایک اچھوتا اور باکمال شاعر کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ وہ اپنے خیال کی ندرت اور فکر کے بانکپن کی آمیزش سے اپنی غزلوں میں انفرادیت قائم کرنے کی خداداد صلاحیت رکھتے ہیں۔ جس کی روشنی میں ہم بلا جھجک یہ کہہ سکتے ہیں کہ منوّر رانا اردو شاعری کی آبرو ہیں۔ ان کا لہجہ بظاہر کھردرا اور تیکھا ہے، مگر اس میں حلاوت اور حد درجہ دل آویزی ہے۔ انہوں نے ہر موضوع کو اپنی فکر اور ادراک کا ذریعہ بنایا اور اس کی ترسیل میں کوئی وقیقہ نہیں اٹھا رکھا لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ سات شعری مجموعوں کے مصنف، اردو کے اس عالمی شہرت یافتہ شاعر کو ''نیم کے پھول'' اور ''کہو ظلِ الٰہی سے'' کے سوا اپنے تمام مجموعے دیوناگری رسم الخط میں شائع کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

کہیں موصوف بھی اردو والوں کی بے حسی کے آگے مجبور تو نہیں...!!

☆

## ''یہ تیری سادگی''

''یہ تیری سادگی'' کرشن نندہ کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں اٹھائیس کہانیاں شامل ہیں۔ نندہ صاحب نے اپنی کہانیوں میں معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں اور عورتوں کے خلاف ہو رہے ذہنی وجسمانی تشدد کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ وہ ایک افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ سوشل ایکٹیوسٹ کی ذمہ داری بھی بخوبی نبھا رہے ہیں۔ سماج کو درپیش مسائل بڑی چابکدستی سے اُجاگر کرنے کے ساتھ اپنے افسانوں میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر قلم اٹھایا ہے۔ اُن کی زندگی کے تجربات اور گہرے مشاہدے اور مطالعے کا عکس بھی ان افسانوں میں نظر آتا ہے۔ انسانی رشتوں کی اہمیت اور پاکیزگی سے جڑے جذبات نندہ صاحب اپنے مخصوص انداز میں بیان کر رہے ہیں۔ بزرگوں کی بدحالی کی دردناک تصویر کشی بھی بڑی کامیابی سے ان افسانوں میں کی گئی ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے بھی نندہ صاحب نے ''لمبی چھلانگ'' میں بڑے اہم مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ ''زندگی امتحان ہے'' بھی اس مجموعہ کا دلچسپ افسانہ ہے جس میں نندہ صاحب نے اپنے تجربات سے لوگوں کو آگاہ کیا ہے جو اپنی بیٹیوں کو بِنا سوچے سمجھے بیرونِ ملک بسنے والے لڑکوں سے بیاہ دیتے ہیں۔ لہٰذا اس مجموعے کی خاصیت سلیس اور عام فہم زبان کے ساتھ روزمرہ کے مسائل کی دردمندی سے نشان دہی بھی ہے۔

ڈاکٹر رینو بہل

# ''بغاوت کا علَم''

(منوررانا صاحب کے غزلیہ کلام سے بقدرِ اختصار)

عادل رشید (دہلی، بھارت)

کسی کو گھر ملا حصّے میں یا کوئی دوکاں آئی
میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا مرے حصّے میں ماں آئی

یہاں سے جانے والا لوٹ کر کوئی نہیں آیا
میں روتا رہ گیا لیکن نہ واپس جا کے ماں آئی

ادھورے راستے سے لوٹنا اچھا نہیں ہوتا
بلانے کے لیے دنیا بھی آئی تو کہاں آئی

کسی کو گاؤں سے پردیس لے جائے گی پھر شاید
اُڑاتی ریل گاڑی ڈھیر سارا پھر دھواں آئی

مرے بچوں میں ساری عادتیں موجود ہیں میری
تو پھر ان بدنصیبوں کو نہ کیوں اردو زباں آئی

قفس میں موسموں کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا
خدا جانے بہار آئی چمن میں یا خزاں آئی

گھروندے تو گھروندے ہیں چٹانیں ٹوٹ جاتی ہیں
اُڑانے کے لیے آندھی اگر نام و نشاں آئی

کبھی اے خوش نصیبی میرے گھر کا رخ بھی کر لیتی
ادھر پہنچی اُدھر پہنچی، یہاں آئی وہاں آئی

...... ○ ......

☆

میرے آنسو کبھی زیور نہیں ہونے والے
یہ گنہگار پیمبر نہیں ہونے والے

تیری بخشش کی تمنا سے پَرے ہیں ہم لوگ
ہم قلندر ہیں گداگر نہیں ہونے والے

اور کچھ روز یوں ہی بوجھ اٹھا لو بیٹے
چل دیئے ہم تو میسر نہیں ہونے والے

ہم کو دنیا نے بسا رکھا ہے دل میں اپنے
ہم کسی حال میں بے گھر نہیں ہونے والے

یہ جو سورج لئے کاندھوں پہ پھرا کرتے ہیں
مر بھی جائیں تو منور نہیں ہونے والے

○

☆

جو دیکھنے میں بظاہر ہے گھر سنبھالے ہوئے
ہماری دنیا ہے وہ بے خبر سنبھالے ہوئے

نہ جانے کتنی ہی چوٹوں کو سہتا رہتا ہے
پھلوں کا بوجھ اکیلا شجر سنبھالے ہوئے

کسی بھی شکل میں مٹی کو ڈھال سکتے ہو
کہ چاک کو ہے ابھی کوزہ گر سنبھالے ہوئے

کسی کا بوجھ اُٹھاؤ تو جان جاؤ گے
ذرا سی مٹی ہے کیسے شجر سنبھالے ہوئے

چلو یہ مانا تسلّی سے کچھ نہیں ہوتا
یہ ننھے ہاتھ ہیں مجھ کو مگر سنبھالے ہوئے

اندھیرا ہوتے ہی گھبرا کے چھپ گیا سورج
مگر یہ جگنو کھڑا ہے سپر سنبھالے ہوئے

○

بادشاہوں کو سکھایا ہے قلندر ہونا　　آپ آسان سمجھتے ہیں منوّر ہونا
ایک آنسو بھی حکومت کے لیے خطرہ ہے　　تم نے دیکھا نہیں آنکھوں کا سمندر ہونا
صرف بچوں کی محبت نے قدم روک لئے　　ورنہ آسان تھا میرے لئے بے گھر ہونا
ہم کو معلوم ہے شہرت کی بلندی ہم نے　　قبر کی مٹّی کا دیکھا ہے برابر ہونا
اس کو قسمت کی خرابی ہی کہا جائے گا　　آپ کا شہر میں آنا مرا باہر ہونا
سوچتا ہوں تو کہانی کی طرح لگتا ہے　　راستے سے مرا تکنا ترا چھت پر ہونا
مجھ کو قسمت ہی پہنچنے نہیں دیتی ورنہ　　ایک اعزاز ہے اس در کا گداگر ہونا
صرف تاریخ بتانے کے لیے زندہ ہوں　　اب مرا گھر میں بھی ہونا ہے کلنڈر ہونا

...... ○ ......

☆

ان کے ہونٹوں سے مرے حق میں دعا نکلی ہے
جب مرض پھیل چکا ہے تو دوا نکلی ہے
ایک ہی جھٹکے میں یہ ہو گئی ٹکڑے ٹکڑے
کتنی کمزور یہ زنجیرِ وفا نکلی ہے
جو دیا سامنے پڑتا ہے وہ بجھ جاتا ہے
آج لگتا ہے نشہ کر کے ہوا نکلی ہے
اتفاق اس کو نہ کہیے کہ برا لگتا ہے
جس جگہ بچھڑے تھے ہم لوگ حنا نکلی ہے
میری ان آنکھوں نے انجامِ ہوس دیکھا ہے
سر جھکائے ہوئے محلوں سے انا نکلی ہے

○

☆

دریا دلی سے ابرِ کرم بھی نہیں ملا
لیکن مجھے نصیب سے کم بھی نہیں ملا
پھر انگلیوں کو خوں میں ڈبونا پڑا ہمیں
جب ہم کو مانگنے پہ قلم بھی نہیں ملا
سچ بولنے کی راہ میں تنہا ہمیں ملے
اِس راستے میں شیخِ حرم بھی نہیں ملا
میں نے تو ساری عمر نبھائی ہے دوستی
وہ مجھ سے کھا کے میری قسم بھی نہیں ملا
دل کو خوشی بھی حد سے زیادہ نہیں ملی
کاسے کے اعتبار سے غم بھی نہیں ملا

○

اتنی بھر پور ضمانت کوئی کم دیتی ہے　　چین سے سوتا ہوں ماں پڑھتی ہے دم دیتی ہے
اک محبت سے کئی سرحدیں کھل جاتی ہیں　　اور نفرت کئی ملکوں کو جنم دیتی ہے
ہم کہ ماں کہتے ہیں جس کو انہی ہاتھوں سے اُسے　　بیچ دیتے ہیں اگر دودھ وہ کم دیتی ہے
مفلسی چاہے تو اک دن میں محل بن جائے　　اس کے اندر کی انا اس کو قسم دیتی ہے
تیرے ان محلوں کو مزدور جلا ڈالیں گے　　بھوک ہاتھوں میں بغاوت کا علَم دیتی ہے
ایک اک قطرہ مرے دودھ کا واپس کرنا　　جنگ پر جاتے ہوئے ماں یہ قسم دیتی ہے
غور کرنا کبھی فرصت میں محبت کیا ہے　　تیر لے لیتی ہے ہاتھوں سے قلم دیتی ہے
زندگی نے تو رُلایا ہے ہمیں قسطوں میں　　موت اچھی ہے کہ تکلیف تو کم دیتی ہے

...... ○ ......

☆

اک کونے میں عزّت مری لاچار کھڑی ہے
دروازے پہ لیکن مرے اک کار کھڑی ہے
بیساکھی پہ اس ملک کی سرکار کھڑی ہے
کلمے کے سہارے پہ یہ دیوار کھڑی ہے
میں تاج کسی اور کو خود سونپ رہا ہوں
چپ چاپ مری فوجِ وفادار کھڑی ہے
حیرت سے پھٹی پڑتی ہیں ہر شخص کی آنکھیں
مرتے ہوئے انسان کی تلوار کھڑی ہے
یہ وقت جدائی بھی عجب ہوتا ہے ، دنیا
آنکھوں میں لیے حسرتِ دیدار کھڑی ہے
ٹوٹی ہوئی کشتی ہی پہنچ جاتی ہے اُس پار
مضبوط جو کشتی تھی اسی پار کھڑی ہے

○

☆

نئے لہجے کو شعری زاویے کو یاد رکھئے گا
مرے ٹانکے ہوئے ہر قافیے کو یاد رکھئے گا
یہ دنیا آپ کو اک روز پلکوں پہ بٹھائے گی
مگر اس وقت بھی اس بوریے کو یاد رکھئے گا
میں جب بھی گاؤں سے چلتا ہوں مجھ سے گاؤں کہتا ہے
محرم آئے تو اس تعزیے کو یاد رکھئے گا
لپٹ جاتا ہے یہ کہتے ہوئے ننھا سا اک جگنو
وہاں کی روشنی میں اس دیے کو یاد رکھئے گا
زبانِ خاص میں پیغام دے کر اُڑ گیا کاگا
ہمیں مت بھولیے گا ڈاکیے کو یاد رکھئے گا
ہوا جب بھی پسینہ خشک کرتی ہے تو کہتی ہے
میاں اچھے دنوں میں تولیے کو یاد رکھئے گا

○

انا ہوس کی دکانوں میں آ کے بیٹھ گئی — عجیب مینا ہے شِکروں میں آ کے بیٹھ گئی
جگا رہا ہے زمانہ مگر نہیں کھلتیں — کہاں کی نیندان آنکھوں میں آ کے بیٹھ گئی
وہ فاختہ جو مجھے دیکھتے ہی اُڑتی تھی — بڑے سلیقے سے بچوں میں آ کے بیٹھ گئی
تمام تلخیاں ساغر میں رقص کرنے لگیں — تمام گرد کتابوں میں آ کے بیٹھ گئی
نہیں تھی دوسری کوئی جگہ بھی چھپنے کی — ہماری عمر کھلونوں میں آ کے بیٹھ گئی
اُٹھو کہ اوس کی بوندیں جگا رہی ہیں تمہیں — چلو کہ دھوپ دریچوں میں آ کے بیٹھ گئی
چلی تھی دیکھنے سورج کی بدمزاجی کو — مگر یہ اوس بھی پھولوں میں آ کے بیٹھ گئی
تجھے میں کیسے بتاؤں کہ شام ہوتے ہی — اُداسی کمرے کے طاقوں میں آ کے بیٹھ گئی

...... O ......

☆

دنیا کی ہوس دل سے مرے دور ہوئی ہے
تب جا کے فقیری مری مشہور ہوئی ہے
اب کوئی سیاست کی سیاہی نہ اُلٹ دے
ویسے مری تائید تو بھر پور ہوئی ہے
یادیں کئی بچپن کی جڑی تھیں مری اس سے
شیشے کی یہ گڑیا جو ابھی چُور ہوئی ہے
مٹکے میں کئی سال اسے سڑنا پڑا ہے
تب جا کے کہیں دُخترِ انگور ہوئی ہے
حیرت ہے کہ تم کیسے چلے آئے یہاں پر
سچائی تو دربار میں معذور ہوئی ہے
ان ہاتھوں کو شمشیر بنانا پڑا مجھ کو
تب جا کے گذارش مری منظور ہوئی ہے

O

☆

پھر ہوا صرف چراغوں کا کہا کرتی ہے
جب دوا کچھ نہیں کرتی تو دعا کرتی ہے
اک سمندر ہے جو شہروں کو نگل جاتا ہے
اک ندی ہے جو سمندر کا بھلا کرتی ہے
تم کبھی اُس کو بھلانے کی نہ کوشش کرنا
یہ دوا اور بھی زخموں کو ہرا کرتی ہے
کوششیں کرتی چلی آئی ہے دنیا لیکن
عمر وہ پونجی ہے جو روز گھٹا کرتی ہے
یوں تو اب اس کو سجھائی نہیں دیتا لیکن
ماں ابھی تک مرے چہرے کو پڑھا کرتی ہے
ماں کی سب عادتیں بیٹی میں چلی آئی ہیں
میں تو سو جاتا ہوں لیکن وہ جگا کرتی ہے

O

آنکھوں کو انتظار کی بھٹّی پہ رکھ دیا — میں نے دیے کو آندھی کی مرضی پہ رکھ دیا
احباب کا سلوک بھی کتنا عجیب تھا — نہلا دُھلا کے مٹی کو مٹی پہ رکھ دیا
آؤ تمہیں دکھاتے ہیں انجامِ زندگی — سکّہ یہ کہہ کے ریل کی پٹڑی پہ رکھ دیا
پھر بھی نہ دور ہو سکی چہرے سے بیوگی — مندی نے سارا خون ہتھیلی پہ رکھ دیا
دنیا کو کیا خبر اسے کہتے ہیں شاعری — میں نے شکّر کے دانے کو چیونٹی پہ رکھ دیا
اندر کی ٹوٹ پھوٹ چھپانے کے واسطے — جلتے ہوئے چراغ کو کھڑکی پہ رکھ دیا
گھر کی ضرورتوں کے لیے اپنی عمر کو — بچے نے کارخانے کی چمنی پہ رکھ دیا
پچھلا نشان جلنے کا موجود تھا تو پھر — کیوں ہم نے ہاتھ جلتی انگیٹھی پہ رکھ دیا

...... O ......

☆

گھر میں رہتے ہوئے غیروں کی طرح ہوتی ہیں
لڑکیاں دھان کے پودوں کی طرح ہوتی ہیں
اُڑ کے اک روز بہت دور چلی جاتی ہیں
گھر کی شاخوں پہ یہ چڑیوں کی طرح ہوتی ہیں
سہمی سہمی ہوئی رہتی ہیں مکانِ دل میں
آرزوئیں بھی غریبوں کی طرح ہوتی ہیں
ٹوٹ کر یہ بھی بکھر جاتی ہیں اک لمحے میں
کچھ امیدیں بھی گھروندوں کی طرح ہوتی ہیں
آپ کو دیکھ کے جس وقت پلٹتی ہے نظر
میری آنکھیں مری آنکھوں کی طرح ہوتی ہیں

O

☆

صحرا پسند ہو کے سمٹنے لگا ہوں میں
اندر سے لگ رہا ہے کہ بٹنے لگا ہوں میں
کیا پھر کسی سفر پہ نکلنا ہے اب مجھے
دیوار و در سے کیوں یہ لپٹنے لگا ہوں میں
آتے ہیں جیسے جیسے بچھڑنے کے دن قریب
لگتا ہے جیسے ریل سے کٹنے لگا ہوں میں
کیا مجھ میں احتجاج کی طاقت نہیں رہی
پیچھے کی سمت کس لئے ہٹنے لگا ہوں میں
پھر ساری عمر چاند نے رکھا مرا خیال
اک روز کہہ دیا تھا کہ گھٹنے لگا ہوں میں

O

تھکن کو اوڑھ کے بستر میں جا کے لیٹ گئے — ہم اپنی قبرِ مقرر میں جا کے لیٹ گئے
تمام عمر ہم اک دوسرے سے لڑتے رہے — مگر مَرے تو برابر میں جا کے لیٹ گئے
ہماری تشنہ نصیبی کا حال موت پوچھو — وہ پیاس تھی کہ سمندر میں جا کے لیٹ گئے
نہ جانے کیسی تھکن تھی کبھی نہیں اُتری — چلے جو گھر سے تو دفتر میں جا کے لیٹ گئے
یہ بے وقوف انہیں موت سے ڈراتے ہیں — جو خود ہی سایۂ خنجر میں جا کے لیٹ گئے
تمام عمر جو نکلے نہ تھے حویلی سے — وہ اک گنبدِ بے در میں جا کے لیٹ گئے
سجائے پھرتے تھے جھوٹی انا جو چہروں پر — وہ لوگ قصرِ سکندر میں جا کے لیٹ گئے
سزا ہماری بھی کاٹی ہے بال بچوں نے — کہ ہم اُداس ہوئے گھر میں جا کے لیٹ گئے

...... ○ ......

☆

یہ سر بلند ہوتے ہی شانے سے کٹ گیا
میں محترم ہوا تو زمانے سے کٹ گیا
ماں آج مجھ کو چھوڑ کے گاؤں چلی گئی
میں آج اپنے آئینہ خانے سے کٹ گیا
جُوڑے کی شان بڑھ گئی محفل مہک اُٹھی
لیکن یہ پھول اپنے گھرانے سے کٹ گیا
اے آنسوؤ! تمہاری ضرورت ہے اب مجھے
کچھ میل تو بدن کا نہانے سے کٹ گیا
اس پیڑ سے کسی کو شکایت نہ تھی مگر
یہ پیڑ صرف بیچ میں آنے سے کٹ گیا
ورنہ وہی اُجاڑ حویلی سی زندگی
تم آ گئے تو وقت ٹھکانے سے کٹ گیا

○

☆

میں مُردہ قوم کی اس رہبری سے باز آتا ہوں
یہ اُمّت ہے تو میں پیغمبری سے باز آتا ہوں
یہ آنکھیں صرف رونے کے لیے تُو نے نہیں دی ہیں
میں روز و شب کی اس نوحہ گری سے باز آتا ہوں
مجھے اک دن خدا کے سامنے منہ بھی دکھانا ہے
امیرِ شہر تیری نوکری سے باز آتا ہوں
یہ پلکیں ٹوٹی بکھری کرچیاں کب تک اٹھائیں گی
میں شہرِ سنگ میں شیشہ گری سے باز آتا ہوں
اگر دیکھے ہوئے ہر خواب کی تعبیر ایسی ہے
تو میں خوابوں کی اس سوداگری سے باز آتا ہوں
رفُو کا کام مجھ جیسے سے ہرگز ہو نہیں سکتا
میں دردِ دل تری چارہ گری سے باز آتا ہوں
یہ احساسِ ندامت میرے بچوں میں نہ آ جائے
مجھے گھر چاہیے میں بے گھری سے باز آتا ہوں

○

اب اپنی انا سے مجھے ڈر لگنے لگا ہے　　صحرا میں نہ جانے کہاں سر لگنے لگا ہے
آگے کا سفر صرف مری روح کرے گی　　اب جسم بھی سامانِ سفر لگنے لگا ہے
لگتا ہے کہ دہلیز پہ آ پہنچی قیامت　　اک بھائی کو اک بھائی سے ڈر لگنے لگا ہے
ویسے تو کوئی چیز نہیں بدلی ہے لیکن　　تم جب سے گئے ہو مجھے ڈر لگنے لگا ہے
اے صحرا نوردی مجھے آبادی سے لے چل　　کچھ روز سے زنداں مجھے گھر لگنے لگا ہے
ان کو نہیں معلوم کہ گھر ہوتے ہیں کیسے　　ان بچوں کو فُٹ پاتھ ہی گھر لگنے لگا ہے

...... O ......

☆

اس کی عزّت ہی نہیں جان کے لالے پڑ جائیں
جس کے پیچھے بھی ترے چاہنے والے پڑ جائیں
پھر جگہ کون سی بچتی ہے ہماری خاطر
مسجدوں میں بھی اگر خوف سے تالے پڑ جائیں
یہ ہوس بارہا بازار میں لے آئی ہے
اے شکم! تجھ میں بھی دو چار نوالے پڑ جائیں
میں جہاں رہتا ہوں پتھر بھی نہیں رہ سکتے
آپ کچھ دیر ٹھہر جائیں تو کالے پڑ جائیں
چارہ گر جسم کے چھالوں کی دوا دیتا ہے
اب یہ قسمت ہے اگر روح میں چھالے پڑ جائیں
بادشاہت کی ہوس دل سے چلی جاتی ہے
آپ کو مہنگے نہ مٹّی کے یہ پیالے پڑ جائیں
بے گناہی مرا ایمان ہے تجھ پر لیکن
کہیں انصاف کی آنکھوں میں نہ تالے پڑ جائیں

O

☆

قلندر سنگ مرمر کے مکانوں میں نہیں ملتا
میں اصلی گھی ہوں بنیوں کی دکانوں میں نہیں ملتا
تو پھر دنیا میں میرے چاہنے والے کہاں ہوتے
یہ اچھا شعر ہے یہ کارخانوں میں نہیں ملتا
سگی بہنوں کا رشتہ ہے جو اردو اور ہندی میں
کہیں دنیا کی دو زندہ زبانوں میں نہیں ملتا
پرائے غم میں اپنے آپ کو برباد کر لینا
یہ جذبہ اچھے اچھے خاندانوں میں نہیں ملتا
پرندے شام ہوتے ہی فضا سے لوٹ آتے ہیں
زمیں پر جو سکوں ہے آسمانوں میں نہیں ملتا
یہی بوئیں، یہی جوتیں، یہی سینچیں، یہی کاٹیں
تو پھر خوش حال کوئی کیوں کسانوں میں نہیں ملتا
اگر تھوڑے سے بھی انصاف پرور لوگ ہو جاتے
تو کوئی بے قصور ان قید خانوں میں نہیں ملتا

O

# ''مسافراُتر گیا''

منوررانا

ریل کی کھڑکیاں کتنی خوبصورت کیوں نہ ہوں گھر کے دریچوں کا بدل نہیں ہوسکتیں ۔ اسٹیشن کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو، گھر آنگن نہیں ہوسکتا پٹریاں کتنی ہی چمکدار کیوں نہ ہوں چراغ نہیں بن سکتیں، ڈبے کتنے ہی آرام دہ ہوں کمرے نہیں بن سکتے، لیکن وحید عرشی برسوں انہیں کھڑکیوں سے جھانکتے رہے، ڈبوں میں سفر کرتے رہے، پٹریوں کی چمک سے روشنی حاصل کرتے رہے۔انھوں نے ساری زندگی ریل کی پٹریاں پار کرنے کا عمل جاری رکھا۔صبح سویرے جب نیند ماؤں کی طرح تھپکیاں دے کر سلانا چاہتی ہے، وحید عرشی جوٹ مل کے مزدوروں کی طرح اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ریل کا انتظار کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے پھر ذرا ہی دیر میں ریل گاڑی وحید عرشی کو اپنے سینے سے لگا کر کلکتے لے آتی ہے اور ادھر بچے جب جاگتے اور باپ کو نہ دیکھتے تو اداس ہوجاتے لیکن ماں امید کے کھلونے بچوں کے سامنے رکھ دیتی تھی (اب تو سب سے اچھا کھلونا بھی ٹوٹ گیا) ریل سے اتر کر بس اور بس کے سفر کے بعد کافی دور تک پیدل چل کر وحید عرشی کالج کی کتابوں میں ڈوب جاتے تھے۔شام کو جب وہ گھر واپس پہنچتے تو ٹرین کی بھیڑ، سفر کی تکان اور ذہنی پریشانیوں کے دکھ کو چائے کی پیالی میں گھول کر پی جاتے تھے، مسکراتے ہوئے بچوں کی طرف دیکھتے اور پھر گھر کے برابر والی پان کی دکان کی طرف روانہ ہوجاتے تھے۔ جہاں وفا سکندر پوری ان کے منتظر ہوتے ۔ وقت گذاری کے لئے یہ لوگ گھنٹوں اپنے اپنے دکھوں کی کتاب ایک دوسرے کو دے دیتے تھے۔حالانکہ وحید عرشی کی کتابِ زندگی بہت کم صفحوں کی تھی لیکن اس کو پڑھنے لئے سبھی بے قرار رہتے تھے ۔ انھوں نے اپنی زندگی کی کتاب پر لفظ''مسکراہٹ'' آنسوؤں سے تحریر کیا تھا، انگاروں پر شبنم کی بوندوں کو سجایا تھا، وہ قلم کو تلوار نہیں بناتے تھے، بانسری بنا لیتے تھے، وہ مجیب الحق کے بچوں کو بھتیجہ نہیں بیٹا سمجھتے تھے۔

پرتاب گڑھ کے باسی تھے لیکن انھوں نے جلیلؔ مانک پوری کی طرح درباروں کے چکر نہیں لگائے۔ بھیک تو بڑی چیز ہے! اس شخص نے تو کبھی اپنا حق بھی نہیں مانگا۔ اگر اس نے حق مانگ لیا ہوتا تو ایک ٹوٹے سے گھر کے میلے بستر پر اس کی موت کبھی نہیں ہوتی ۔ آکسیجن سلنڈر کے لئے اس کے گھر والے مارے مارے نہ پھرتے۔، ڈاکٹر عبدالرؤوف کو کسی سے بچوں کا خیال رکھنے کو نہ کہنا پڑتا۔ اس کی بھتیجی کی کانوں میں سونے کی بالیوں کی جگہ برسوں پرانے نیم کے تنکے نہ ڈالنے پڑتے۔اس کے گھر میں اینٹوں کا بے ترتیب فرش نہ ہوتا قالین ہوتے۔ گھر کی دالانوں میں پھٹی ہوئی چادریں نہ پڑی ہوتیں ریشمی پردے لہرار ہے ہوتے لیکن وحید عرشی تو ایک پیڑ تھا، سایہ دار پیڑ، میٹھے پانی کا چشمہ تھا وہ، ایک خوبصورت جھیل تھا، جس میں پرندے نہاتے تھے، نمازی وضو کرتے تھے اور بچے اپنی لکھی ہوئی تختی دھوتے تھے۔ بھلا جھیل کسی سے اپنا حق مانگتی ہے۔ وہ تو لوگوں کو ان کا عکس اپنے آئینے میں دکھاتی رہتی ہے۔

وحید عرشی کی مسکراہٹ میں گھنے پیڑ کی چھاؤں کا سکون، چاندنی کا رسیلا پن، غزل کی شگفتگی اور خوش الحان پرندوں کا بھولا پن شامل تھا، لیکن ان کا جسم مختلف بیماریوں کا شوروم تھا، ان کے کھوکھلے جسم میں کئی بیماریاں سانپوں کی طرح پنپ رہی تھیں ۔ ان بیماریوں میں ایک خطرناک بیماری خودداری اور انا کی بیماری تھی جو ان کے جسم کے قیمتی خون کا قطرہ قطرہ چاٹ رہی تھی۔ ایک روتے ہوئے آدمی کا کھلکھلا کر ہنسنا کتنا دشوار کام ہے یہ ان کی موت کے بعد اندازہ ہوا۔

۲۵/جنوری ۱۹ء سے ہی اس خوددار شاعر نے مستقل طور پر چارپائی پکڑلی تھی۔ زندگی اس سے منہ موڑ لینا چاہتی تھی سانسوں کی ریت جسم کی مٹھی سے نکل جانا چاہتی تھی (اور یوں بھی اگر باندھ کمزور ہوجائیں تو نالے دریا بن جاتے ہیں) اپنے ساتھ زندگی کی دانستہ بے وفائی سے وہ دل برداشتہ تھے لیکن ناراض قطعی نہیں تھے، ناراض ہونا تو وہ جانتے ہی نہیں تھے اور زندگی سے ناراض ہونا بھی نہیں چاہتے تھے کیوں کہ ابھی تو انھیں ماں جیسی بھابھی کی خدمت بھی کرنی تھی، پھول جیسے بھتیجے بھتیجیوں کی پرورش کرنا تھی، کسی کی مانگ کے سیندور کا قرض ادا کرنا تھا، روئی کے گالوں جیسے بچوں کی حفاظت کرنی تھی۔

اپنے لئے تو ہار ہے کوئی نہ جیت ہے
ہم سب ہیں دوسروں کی لڑائی لڑے ہوئے

بیماریاں تو غریب گھروں کو برباد کرنے کی قسم کھا کر نکلتی ہیں، مختصر سی مزدوری وہ بھی روزانہ کی تھکا دینے والی مسافت طے کرنے کے بعد.........بھوانی پور کالج کا فاصلہ چالیس کلومیٹر.......وحید عرشی کی عمر بھی تقریباً اتنی ہی، یعنی ایک کلومیٹر سالانہ کے حساب سے اس شخص نے زندگی خرچ کی تھی، ریل کی کھڑکیوں کی فولادی سلاخوں پر سر رکھے رکھے سوجانے والے اس شاعر نے کبھی خواب نہیں دیکھے تھے، وہ ساری زندگی جاگتا رہا اور کیوں نہ جاگتا، گھر میں دوپٹہ سنبھال کر اوڑھتی ڈھانپتی ہوئی بھابھی، کمرے میں بڑے بھائی کی تصویر، آنگن میں وقت کی تند ہواؤں سے کھیلتا ہوا پروفیسر مجیب کا چھوڑا ہوا چراغ! وہ تو ان بچوں کے بھی باپ جیسے تھے، آنگن میں لہلہاتا ہوا نیم کا پیڑ تو موسم موسم پھلتا پھولتا تھا لیکن ان کے معصوم ہونٹوں پر مسکراہٹ ہر فصل میں کھلی رہتی تھی کتنی کڑوی مسکراہٹ رہی ہوگی وحید عرشی کی شاید اسی لئے وہ منہ کا مزا بدلنے کے لئے ہر وقت پان کھاتے رہتے تھے۔

جس دن سیانی ہوتی ہوئی بھتیجیوں نے شوق میں نیم کے تنکے اپنے کان میں ڈالے، اسی دن سے وہ اور زیادہ پریشان رہنے لگے پھر بھلا وہ نرسنگ ہوم کیسے جاتے، جسے بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے ہوں، وہ اپنے پیلے ہوتے ہوئے چہرے کو کبھی نہیں دیکھتا بلکہ وہ تو آئینہ ہی نہیں دیکھتا......آئینہ تو حسن دیکھنے

کے لئے ہوتا ہے، آئینے میں بیماری نہیں دیکھی جاتی ۔

آلامِ روزگار سے فرصت نہیں ملی

آئینے سے بھی ہم کو محبت نہیں ملی

وہ زبانِ بے زبانی سے کہتے رہے ''مجھے بے موت مرنے سے بچالو'' لیکن مزدوروں کی بستی میں اسپتال کہاں، اسپتال ہو تو دوائیں کہاں، دوائیں ہوں تو ڈاکٹر کہاں، ایمبولنس ہو تو ڈرائیور کہاں، ایک خوددار شاعر کی آنکھیں آکسیجن کی محتاج ہو گئیں لیکن اس شخص نے محتاج بن کر تو جینا سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ پلاسٹک کے بے مصرف ٹکڑوں سے بٹن بنالیتا تھا۔ پاؤں میں چبھنے والے کانٹوں سے خلال کا کام لیتا تھا، لکڑی کے فضول ٹکڑوں سے غالب کی تصویر بناڈالتا تھا، روندی ہوئی ملائم مٹی سے میر و اقبال کے مجسمے ڈھال لیتا تھا، تلخیوں اور حادثوں کو تراش کر غزل تخلیق کرتا تھا، شیشوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں سے دل بنالیتا تھا ۔

جدھر مٹی اڑا دوں آفتابِ تازہ پیدا ہو

ابھی بچوں میں ہوں صابن کے غبارے بنا تا ہوں

آخری سفر پر روانہ ہونے سے کچھ دنوں پہلے ایک شام وہ البم سے اپنی تصویریں نوچ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ البم سے تصویروں کو الگ کرنے میں گوشت سے ناخن جدا کرنے والی تکلیف ہو رہی ہوگی لیکن وہ تو دکھ درد کی بندشوں سے بہت پہلے ہی رہا ہو چکے تھے معصوم شرقی کا خیال تھا کہ شاید وہ اپنی نشانیاں مٹا رہے ہیں لیکن نشانیاں کہاں مٹتی ہیں زخم اگر بھر جائے تو اس کا نشان باقی رہتا ہے۔ وحید عرشی کی نشانی پانی پر لکھی ہوئی تحریر نہیں ہے۔ ان کی قیمتی تصویریں ہمیشہ محفوظ رہیں گی پھول سے بچوں کی شکل وصورت میں خوبصورت غزلوں کی شکل میں اور نہ بھولنے والی یادوں کی شکل میں۔ وحید عرشی مرے نہیں ہیں وہ اس وقت تک نہیں مر سکتے جب تک اس دنیا میں مسکراہٹ موجود ہے۔ تمام مسکراتے ہوئے ہونٹ وحید عرشی کی یاد دلائیں گے۔

ہر برس کانکی نارہ سے مشاعرے والے یا ملنے والے وحید عرشی کا پیغام لے کر آتے تھے لیکن اس بار کوئی صاحب ان کی موت کی خبر لے کر آئے تھے وہی صاحب یہ بھی بتا گئے کہ مٹی عصر کی نماز کے بعد ہوگی۔ لہٰذا رئیس آنولوی اور حبیب ہاشمی کے ہمراہ میں بھی کانکی نارہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ یقیناً یہ لوکل ٹرین بھی وحید عرشی کو پہچانتی ہوگی کیوں کہ اس کی رفتار سے بھی تھکاوٹ اور بیزاری کا احساس ہو رہا تھا اسٹیشن پر ہر چہرہ وحید عرشی کا معلوم ہوتا تھا ہم لوگوں نے ریلوے لائن پار کی اور ان کے گھر کی طرف چلنے لگے۔

میں کانکی نارہ کئی بار جا چکا ہوں لیکن شب کے اندھیرے میں دن کی روشنی میں جب وحید عرشی کا گھر، وحید عرشی کے بچے اور وحید عرشی کا چہرہ دیکھا تھا تو میں پچھتانے لگا کہ کاش میں ادھر کبھی دن کی روشنی میں بھی آیا ہوتا۔

گھر کے آنگن میں نیم کا پرانا پیڑ، مکان کی کمزور دیواروں پر بے ترتیب بیلیں، دروازے پر ایک میلا سا پردہ، اس پردے سے جھانکتی ہوئی ایک تصویر جس پر ''اللہ'' لکھا ہوا تھا تصویر کے نیچے وحید عرشی اور مرحوم مجیب صاحب کے بلکتے ہوئے یتیم بچے، اندر سے ابھرتی ہوئی دو متواتر چیخیں، ایک بھابھی کی چیخ، جس میں ماں کا درد بھی شامل تھا، ایک اور نسوانی چیخ جس میں پروفیسر عبدالرؤف کی بوڑھی سسکیاں بھی لرز رہی تھیں لیکن پروفیسر عبدالرؤف کے چہرے پر ایک سکوت تھا، جو سمندروں میں ہوا کرتا ہے۔

گھر کے سامنے ایک اسکول اور اسکول سے بالکل ملی ہوئی ایک خوبصورت مسجد جس کے اونچے اونچے مینار چودہ سو برس کی کہانیاں سناتے ہوئے۔ صدر دروازے کے پاس رکھا ہوا ایک جنازہ، امام صاحب نماز پڑھاتے ہوئے لیکن آج تو امام صاحب وحید عرشی کے پیچھے کھڑے ہیں۔

گھر کے دروازے سے جھانکتے ہوئے وحید عرشی کے ننھے ننھے بچے، جیسے معصوم فرشتوں کی ٹولی، جیسے تھالی میں رکھے ہوئے پھول، جیسے پر جوڑ کر بیٹھے ہوئے کبوتر، جیسے رحل پر رکھی ہوئی مقدس کتابیں، جیسے طاق پر رکھے ہوئے نازک کھلونے، جیسے مصور کی نامکمل تصویریں، جیسے ادھ کھلی بیلے کی کلیاں، جیسے ہنسی کے لئے کھلتے ہوئے ہونٹ، جیسے ادھ لکھی ہوئی کہانی، جیسے نامکمل غزل۔

ہوا رخ بدلنا سارے وعدوں کا بکھر جاتا

کسی کا در سے تکنا اور کسی کا دار پر جانا

بلکتے ہوئے چہروں اور چیختی ہوئی آنکھوں کو عمر بھر کا زخم بخش کر وحید عرشی کا جنازہ اپنی آخری منزل کی طرف روانہ ہونے لگا لیکن یہ کیا! وحید عرشی تو ہمیشہ اپنا سفر صبح سویرے کرتے تھے، آج سرِ شام ہی گھر والوں کو اپنی بجھی ہوئی آنکھوں سے ''خدا حافظ'' کہتے ہوئے چل پڑے، آج انھوں نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا، ہزار ہا سوگواروں کا ایک طویل قافلہ، جس میں ادیب و شاعر بھی، ڈاکٹر و مریض بھی پروفیسر اور طلبہ بھی ...... ایک مریض پیس میکر کے سہارے اپنی دھڑکنوں کو گنتا ہو جسے کچھ دنوں پہلے وحید عرشی نے تسلیاں دی تھیں، حوصلہ دیا تھا اور مسکراتے ہوئے زندہ رہنے کا درس دیا تھا ۔

وقت خوش خوش کاٹنے کا مشورہ دیتے ہوئے

رو پڑا وہ آپ مجھ کو حوصلہ دیتے ہوئے

ریل کی پٹریوں سے وحید عرشی کا بہت پرانا رشتہ تھا لیکن ریل کی پٹریاں ہمیشہ انھوں نے اکیلے پار کی تھیں، آج ریل کی پٹریاں پار کرتے ہوئے ایک پل بھی پڑا لیکن وہ چار آدمیوں کے کاندھے پر سوار تھے، قبرستان میں ماتمی خاموشی، ناریل کے پیڑ اور گھنیرے درخت کے بیچ، قبر میں لیٹے ہوئے وحید عرشی کے والدِ محترم! باپ کی قبر کے پاس ہی آرام کرتے ہوئے پروفیسر مجیب، فرماں بردار بھائی بھی خاموشی کے بازو میں لیٹ کر سو گیا ع

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

قبرستان سے واپسی میں وحید عرشی کے بچپن کے دوست منور حسین ملے۔ میں نے ان سے از راہ معلومات پوچھا کہ اس قبرستان میں قبریں بہت کم

ہیں وہ مسکراتے ہوئے بولے کہ رانا صاحب! یہاں لوگ مرنا نہیں چاہتے لیکن دواؤں اور طبی سہولتوں کے نہ ہونے کی وجہ سے مرجاتے ہیں۔ میں نے دل میں سوچا کہ وحید عرشی تو عام آدمی نہیں تھے وہ تو اردو کے خاموش مجاہد تھے، اردو ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ یہ اردو کی محبت ہی تو تھی کہ وہ حمایت الغرباء اسکول کی پندرہ سو روپیہ کی نوکری کرنے کے بجائے بھوانی پور کالج میں چھ سو روپیہ کی غلامی کررہے تھے۔ دراصل وہ اس غیر مسلم علاقے میں جلتی ہوئی شمع اردو کو بجھتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے تھے، وہ ۴۰ کلومیٹر کا سفر طے کرکے پڑھانے یا پیسہ کمانے نہیں آتے تھے۔ یہ مسافت تو وہ اردو کو بچانے کے لئے طے کرتے تھے۔ وہ اردو کے سچے خادم تھے۔ انھوں نے کبھی نمائشی دوشالہ نہیں اوڑھا، کوئی ادبی دکان نہیں سجائی۔ کسی اکیڈمی کے آگے دست طلب نہیں پھیلائے، ان کی تحریروں نے کتابت یا طباعت کی بھیک نہیں مانگی، انھوں نے کبھی کوئی خوشامدی ڈگڈگی نہیں بجائی۔ وہ تو بانسری کی ایک دھن تھے۔ اس دلچسپ کتاب کا حصہ تھے، جس کو اندر اندر دیمک لگ رہی تھی جس کی دفتی سے جلد اکھڑنے لگی تھی۔

گھٹی گھٹی ہوئی چیخیں گلوں میں چھوڑ گیا
وہ عمر بھر کی رفاقت پلوں میں چھوڑ گیا

وکیل اختر اور مضطر حیدری کے بعد عرشی کی موت تیسری دردناک موت ہے۔ ہزارہا پانچ سو روپیوں کی انعامی بھیک دے کر ٹر خانے والی اکیڈمیوں کو چاہئے کہ ان شہیدوں کے بچوں کے مستقبل کو برباد ہونے سے بچالیں۔ ان چراغوں کی حفاظت بہت ضروری ہے ورنہ ادب کی آنکھیں بے نور ہوجائیں گی۔ باہر کے لوگوں کو انعام کی رشوت دے کر خوش کرنے کے بجائے وہی رقم ایسے فنکاروں کے لواحقین کو ملتی رہے تو ان لوگوں کی روحیں قبروں میں بے چین نہ رہیں گی۔ فیض اور فراق کے مجموعے تو برابر ہی چھپتے رہتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وکیل اختر کی آنکھوں سے ٹپکے ہوئے آنسوؤں کو کتابی شکل میں لایا جائے مضطر حیدری کے بندھے ہوئے ہاتھ پیروں کی بے بسی کو کاغذی پیرہن عطا کیا جائے علاج کی سہولت کے بغیر مرجانے والے وحید عرشی کو امدادی اور تحریری خراج عقیدت پیش کیا جائے۔ ابراہیم ہوش اور نواب دہلوی کے کمزور بڑھاپے کو ہمدردی کی بیساکھیاں دی جائیں۔

اے خدا پھول سے بچوں کی حفاظت کرنا
مفلسی چاہ رہی ہے میرے گھر میں رہنا

☆

## ''شوقِ گریہ''

منوّر رانا کو میں اُس وقت سے جانتا ہوں، جب میں پہلی بار ۱۹۷۰ء کے بعد اور ۱۹۷۵ء سے پہلے کے کسی سال جناب شہزادہ گلریز کے ساتھ کلکتہ کے ایک مشاعرہ میں جو مہاجتی سدن میں بلکچھیا کی ایک ادبی تنظیم نے مرحوم شہود عالم آفاقی کے زیر نگرانی اور سرپرستی منعقد کیا تھا، میں شریک ہوا، اُس وقت منوّر رانا کلکتہ کے 'شتروگھن سنہا' ہوا کرتے تھے اور اپنی پُرکشش وزنی آواز میں وہاں کے .Cultural Prog کی نظامت کیا کرتے تھے مگر اُردو زبان اور شاعری سے بھی اُن کی دلچسپی اُن کے مشاعروں میں سامعین کی صفوں میں اپنی نشست سنبھالے رکھتی تھی، شوخ اور بے باک طبیعت کی بنا پر مشاعرے میں اُن کی موجودگی مشاعرے کے لئے زندگی اور شاعروں کے لئے خطرہ مانی جاتی تھی۔۔۔ اگلی صفوں میں اُس وقت مرحوم نواب متین لطیفی جیسی باغ و بہار شخصیت بھی جلوہ افروز ہوتی تھیں وہیں اُن سے پچھلی صفوں میں کلکتہ کے شعراء اور باذوق سامعین کے درمیان اپنی تمام تر شوخیوں اور شرارتوں کے ساتھ منوّر رانا محاذ سنبھالے نظر آتے تھے۔ ایسے لوگوں کا پیچھے بیٹھ کر مشاعرہ سننا خطرناک ہے، آگے بیٹھے سامعین کو اپنا ہم خیال بنا کر ہمنوا بنالینا بالکل اِسی طرح ہے کہ جیسے کوئی بطخوں کے ریوڑ کو ہانکتا ہوا جس طرف چاہے لے جائے۔ مجھے یاد ہے کہ نیا نیا مشاعروں میں آیا تھا سو میں اُس وقت کے اُن اہم شعراء جو اس مشاعرے میں شریک تھے، سے قطعی ناواقف تھا، گو کہ اُس مشاعرے میں کیفؔ بھوپالی، خاموشؔ غازی پوری، بشیرؔ بدر، تمنّا جمالؔی سے لے کر حقؔ کانپوری تک موجود تھے اور نظامت جناب عمرؔ قریشی کے سُپرد تھی جو اُس زمانے میں اور بعد تک اپنی طلسمی گفتگو کے لئے مشہور رہے، لیکن اگر کسی کو شیر اور گدھے میں تمیز کرنا نہ آتا ہو تو وہ تو شیر کو بھی کان پکڑ کر سواری کے لئے استعمال کرلے گا لہٰذا میں نے کسی بھی شاعر سے متاثر ہوئے بغیر ناظمِ مشاعرہ کے پکارے جانے پر بے کھٹک غزل پڑھنا شروع کردی، یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ اب تک جتنے بھی مشاہیر شعراء پڑھ چکے تھے وہ یکے بعد دیگرے بہت آرام سے ''ہوٹ'' ہوکر اپنی جگہ واپس آچکے تھے اور اپنا نمک حلال کرکے ''زادِ راہ'' کے مستحق ہوچکے تھے۔

**طاہر فراز** (بھارت)

# ''اشکوں کی روانی''

- منور رانا صاحب کے نظمیہ کلام سے بصد انکسار -

تحسیر احمد (لکھنؤ، بھارت)

## یہاں ماں رہتی ہے

ایک بے نام سی چاہت کے لئے آئی تھی
آپ لوگوں سے محبت کے لئے آئی تھی
میں بڑے بوڑھوں کی خدمت کے لئے آئی تھی
کون کہتا ہے حکومت کے لئے آئی تھی

شجرۂ رنگ و گل و بو نہیں دیکھا جاتا
شک کی نظروں سے بہو کو نہیں دیکھا جاتا

رخصتی ہوتے ہی ماں باپ کا گھر بھول گئی
بھائی کے چہروں کو بہنوں کی نظر بھول گئی
گھر کو جاتی ہوئی ہر راہگزر بھول گئی
میں وہ چڑیا ہوں کہ جو اپنا شجر بھول گئی

میں تو جس دیس میں آئی تھی وہی یاد رہا
ہو کے بیوہ بھی مجھے صرف پتی یاد رہا

نفرتوں نے مرے چہرے سے اجالا چھینا
جو مرے پاس تھا اک چاہنے والا چھینا
سر سے بچوں کے مرے باپ کا سایہ چھینا
مجھ سے گرجا بھی لیا میرا شوالہ چھینا

اب یہ تقدیر تو بدلی بھی نہیں جا سکتی
میں وہ بیوہ ہوں جو اٹلی بھی نہیں جا سکتی
اپنے گھر میں یہ بہت دیر کہاں رہتی ہے
لے کے تقدیر جہاں جائے وہاں رہتی ہے

گھر وہی ہوتا ہے عورت کا جہاں رہتی ہے
میرے دروازے پہ لکھ دو یہاں ماں رہتی ہے

سب مرے باغ کے بلبل کی طرح لگتے ہیں
سارے بچے مجھے راہُل کی طرح لگتے ہیں

ہر دکھے دل سے محبت ہے بہو کا ذمہ
گھر کی عزّت کی حفاظت ہے بہو کا ذمہ
گھر کے سب لوگوں کی خدمت ہے بہو کا ذمہ
نوجوانی کی عبادت ہے بہو کا ذمہ

آئے باہر سے مگر سب کی چہیتی بن کر
وہ بہو ہے جو رہے ساتھ میں بیٹی بن کر

اے محبت تجھے اب تک کوئی سمجھا ہی نہیں
تیرا لکّھا ہوا شاید کوئی پڑھتا ہی نہیں
گھر کو چھوڑا تو پلٹ کر کبھی دیکھا ہی نہیں
واپسی کے لئے میں نے کبھی سوچا ہی نہیں

گھر کی دہلیز پہ کشتی کو جلا آئی ہوں
جو ٹکٹ تھا اسے دریا میں بہا آئی ہوں

میں نے آنکھوں کو کہیں پر بھی چھلکنے نہ دیا
چادرِ غم کو ذرا سا بھی مسکنے نہ دیا
اپنے بچوں کو بھی حالات سے تھکنے نہ دیا
سر سے آنچل کو کسی پَل بھی سرکنے نہ دیا

مدّتیں ہو گئیں کھل کر کبھی روئی بھی نہیں
اک زمانہ ہوا میں چین سے سوئی بھی نہیں

اپنی عزّت کو پرایا بھی کہیں کہتے ہیں
چاندنی کو کبھی سایہ بھی کہیں کہتے ہیں
کیا محبت کو بقایا بھی کہیں کہتے ہیں
پھل کو پیڑوں کا کرایا بھی کہیں کہتے ہیں

میں دلہن بن کے بھی آئی اسی دروازے سے
میری ارتھی بھی اُٹھے گی اسی دروازے سے

آگ نفرت کی بھلا مجھکو جلانے سے رہی
یہ سیاست مجھے اس گھر سے بھگانے سے رہی
چھوڑ کر سب کو مصیبت میں تو جانے سے رہی
اُٹھ کے یہ مٹّی تو اس مٹّی سے جانے سے رہی

میں اگر جانا بھی چاہوں تو نہ جانے دے گی
اب یہ مٹّی مری مٹّی کو نہ جانے دے گی

میری آنکھوں کی شرافت میں یہاں کی مٹّی
میرے جیون کی محبت میں یہاں کی مٹّی
میری قربانی کی طاقت میں یہاں کی مٹّی
ٹوٹی پھوٹی سی اس عورت میں یہاں کی مٹّی

کوکھ میں رکھ کے یہ مٹّی اسے دَھنوان کیا
میں نے پرینکا اور راہُل کو بھی انسان کیا

میرے ہونٹوں پہ ہے بھارت کی زباں کی خوشبو
کسی دیہات کے کچے سے مکاں کی خوشبو
اب مرے خون سے آتی ہے یہاں کی خوشبو
سونگھئے مجھ کو تو مِل جائے گی ماں کی خوشبو

پیڑ بویا ہے تو اک دن مجھے میوہ دے گا
میری ارتھی کو چتا بھی میرا بیٹا دے گا

رام کا دیس ہے نانک کا وطن ہے بھارت
کرشن کی دھرتی ہے گوتم کا چمن ہے بھارت
میر کا شعر ہے میرا کا بھجن ہے بھارت
جس کو ہر اک نے سجایا وہ دلہن ہے بھارت

خود کو اک روز اسی مٹّی میں بونا ہے مجھے
مر کے بھی چین سے بھارت میں ہی سونا ہے مجھے

پھول مجھ کو مرے بچپن کی طرح لگتے ہیں
پیڑ جتنے بھی ہیں چندن کی طرح لگتے ہیں
سارے چہرے مجھے درپن کی طرح لگتے ہیں
بھارتی سب مجھے پھمن کی طرح لگتے ہیں

جانتی ہوں کہ میں سیتا تو نہیں ہو سکتی
لیکن اتہاس کے پنّوں میں نہیں کھو سکتی

آپ لوگوں کا بھروسہ ہے ضمانت میری
دھندلا دھندلا سا وہ چہرہ ہے ضمانت میری
آپ کے گھر کی یہ چڑیا ہے ضمانت میری
آپ کے بھائی کا بیٹا ہے ضمانت میری

ہے اگر دل میں کسی کے کوئی شک نکلے گا
جسم سے خون نہیں صرف نمک نکلے گا

○

## شاعر

میں اپنی آنکھوں کو بیچنا چاہتا تھا
لیکن کبھی کوئی ڈھنگ کا
خریدار ہی نہیں ملا
ہر شخص آنکھوں کے ساتھ
میرے خواب بھی خریدنا چاہتا تھا
لیکن خواب خریدے اور بیچے کہاں جاتے ہیں
پھر میں اپنے ادھورے خوابوں کو
تکمیل کے اُبٹن کے بغیر
کیسے کسی کو دے سکتا تھا
دلہن خریدی اور بیچی جاتی ہے
ابٹن لگے جسم کا کاروبار
تو قصائی بھی نہیں کر سکتا
میں تو شاعر تھا

## الجھی ہوئی ایک دعا

تم اپنی انگلیوں سے
پوچھ لیتی ہو
میرے بارے میں
میری نیت اور ارادے کو
اگر میں بادشاہ وقت ہوتا تو
تمہاری انگلیوں کو ترشوا دیتا
کسی جلاّد کے ہاتھوں
اگر عاشق ہوا ہوتا
تو بڑھ کر چوم لیتا
یہ تمہاری انگلیاں بڑھ کر
مگر میں اپنی دُھن میں کھویا
اک قلندر ہوں
دعا دیتا ہوں تمہاری انگلیوں
کی مخبری اور چھیڑ خانی کو

○

## اشرف المخلوق

تتلی
بھونرے
اور شہد کی مکھی میں
لڑائی کیوں نہیں ہوتی
کیا لڑائی صرف انسانوں کا مقدر ہے
کیا رقابت کا احساس
صرف انسانوں کے پاس ہے
چلو یہ بات کسی پھول سے چل کر پوچھتے ہیں

○

## سفید داغ

چہرے سے کچھ پتہ نہیں چلتا
گفتگو میں بھی مٹھاس رہتی ہے
آنے جانے کا وقت بھی نہیں بدلتا
کپڑے اور خوشبو میں بھی مستی پسند ہوتی ہے
گھر کے لوگوں کو فضول خرچی کی بھی چھوٹ ہوتی ہے
صبح کی چائے اور اخبار بھی عادت کا حصہ بنے رہتے ہیں
ٹی، وی چینلوں پر خبروں کا معمول بھی وہی رہتا ہے
سسرالی رشتوں کی سرسراہٹیں بھی زندہ رہتی ہیں
بیوی سے چھیڑ چھاڑ بھی جاری رہتی ہے
تحفے تحائف کا سلسلہ بھی چلتا رہتا ہے
ہر چیز اپنی جگہ پر رہتی ہے
ہر کام اپنے وقت پر ہوتا رہتا ہے
لیکن بیوی کے چوکنا ہوتے ہی
شوہر کے چہرے پر دوسری عورت کی تصویر بن جاتی ہے

○

## لپ اسٹک

اس کی ہر بات
ہر اشارے
ہر کنائے کو میں آسانی سے
سمجھ لیتا تھا
لیکن پتہ نہیں کیوں اس نے
میرے لکھے ہوئے پرانے خطوں میں
سوئے ہوئے بے قصور لفظوں کو
اپنی لال رنگ کی لپ اسٹک سے
ہرا کرنے کی کوشش کی ہے
کیوں؟

## غالبؔ کے بعد..................

اللہ جانتا ہے محبت ہمیں نے کی
غالبؔ کے بعد آموں کی عزّت ہمیں نے کی

جیسے بھی آم ہم کو ملے ہم نے کھا لئے
آموں کا مان رکّھا مروّت ہمیں نے کی

کھٹّے بھی کھائے شوق سے میٹھے بھی کھائے ہیں
قسمت کے فیصلے پہ قناعت ہمیں نے کی

کھانے کو آم کس نے نہیں کھائے ہیں جناب
لیکن بیان آم کی لذّت ہمیں نے کی

تحفے میں ہم نے آم لئے بھی دئے بھی ہیں
پوری رسولِ پاکؐ کی سنّت ہمیں نے کی

لوگوں کے پاس ایک نہیں چار باغ ہیں
اس بات کی خدا سے شکایت ہمیں نے کی

ہم کو ڈرا نہیں سکا شوگر کا خوف بھی
اے موت تیرے سامنے ہمّت ہمیں نے کی

بارش کے باوجود بھی ہم باغ میں رہے
سجدے میں سب گئے تھے عبادت ہمیں نے کی

قسمت میں اس فقیر کے اک پیڑ بھی نہیں
لیکن امیرِ شہر کی دعوت ہمیں نے کی

کس سادگی سے چودھری صاحب نے کہہ دیا
دعوت تو سب ہی کرتے ہیں نیّت ہمیں نے کی

غالبؔ امین آباد نہیں آسکے تو کیا
ان کی طرف سے ہر جگہ شرکت ہمیں نے کی

غالب یہاں بھی آج نہیں آ سکے تو کیا
ان کی طرف سے آج بھی شرکت ہمیں نے کی

## اکتائے ہوئے بدن

عمر کی ڈھلتی ہوئی دوپہر میں
ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کا احساس بھی
آدمی کو تازہ دم کر دیتا ہے
اور اگر سچ مچ خنک ہوائیں
تھکن نصیب جسم سے کھیلنے لگیں
تو شب کی تاریکی خضاب جیسی دکھائی دیتی ہے
آس پاس گردش کرتا ہوا سناٹا
آرزوؤں کی گہما گہمی سے گونجنے لگتا ہے
خواب تعبیروں کی تلاش میں بھٹکنے لگتے ہیں
بدن کی اکتاہٹیں چوپال کے شور شرابے میں ڈوب جاتی ہیں
ڈھلتے ہوئے سورج کی لالی سے سہاگ جوڑے کی خوشبو
آنے لگتی ہے
لیکن خوابیدہ آرزوؤں کی شاہراہ سے گذرتے ہوئے
لوگ
اپنی منزل کی پتہ بھول جاتے ہیں
اسی پتہ بھولنے کو سماج
دھرم اور مذہب کی آڑ لے کر
ایسی بے ہودہ گالیاں دیتا ہے
جو طوائفوں کے محلوں میں بھی نہیں
سنائی دیتیں!

## سفید سچ

اس کی اُنگلیاں ہمیشہ سچ بولتی ہیں
بڑا یقین تھا اسے اپنی انگلیوں پر
ان کے سچے ہونے پر بھی بڑا ناز تھا
وہ ہمیشہ اپنی انگلیوں کو
باتوں باتوں میں چوم لیتی تھی
ایک دن نادانی میں اس نے
اپنی انگلیاں میرے ہونٹوں پر رکھ دیں
اس دن سے اس کی انگلیاں بھی سچ نہیں بولتیں
صرف جھوٹ بولتی ہیں

## رخصتی

جہاں بھی جاؤ مثال بہار بن جاؤ
ہر ایک دل کا مسلسل قرار بن جاؤ
نہ ختم ہو جو کبھی انتظار بن کے رہو
دلوں پہ راج کرو اعتبار بن کے رہو
جو ماں سے تم کو ملی ہیں وفائیں رکھ لینا
پتا کے ہونٹوں کی بوڑھی دعائیں رکھ لینا
بلکتا چیختا بچپن تمہیں پکارے گا
بہن کی آنکھوں کا ساون تمہیں پکارے گا
تمہارے کمرے کا درپن تمہیں پکارے گا
تمہارے بعد یہ آنگن تمہیں پکارے گا
مگر حسین سی منزل کی سمت جاتی ہے
یہ رہگزر جو کسی دل کی سمت جاتی ہے
بچھڑتی چھوٹتی راہوں کی سمت مت دیکھو
کسی بھی بھائی کی آہوں کی سمت مت دیکھو
پکارتی ہوئی باہوں کی سمت مت دیکھو
تم اپنی ماں کی نگاہوں کی سمت مت دیکھو
خوشی کی بات پہ آنکھوں کو تم نہیں کرتے
سفر کے وقت بچھڑنے کا غم نہیں کرتے
ہر ایک موسیٰ کی شفقت کا واسطہ تم کو
ممانیوں کی شرافت کا واسطہ تم کو
ہر اک بوا کی محبت کا واسطہ تم کو
تمہاری اپنی عبادت کا واسطہ تم کو
غموں کی دھوپ کو بادل بنا کے دم لینا
ہر اک اندھیرے کو کاجل بنا کے دم لینا

○

## منسوخ معاہدہ

کئی صدیوں کی بحث، حجت اور تکرار کے بعد
آندھی اور چراغ میں یہ معاہدہ ہو ہی گیا
دونوں ایک دوسرے کا خیال رکھیں گے
جتنی دیر تک یہ دیا جلے گا
ہوا ہونٹوں پر انگلی رکھے رہے گی
اور جب ہوا پھول پتیوں سے چھیڑ خانی
کرنے کے لئے نکلے گی
تب دیا جلے گا نہیں
دونوں اس سمجھوتے پر مطمئن دِکھے
لیکن جب سمجھوتے کے کاغذ پر دستخط کرنے کا
وقت آیا
تو دونوں نے اس فارمولے کو قبول کرنے سے
انکار کردیا
یہ بات سمجھ میں دونوں کے آ گئی
کہ زندگی چھیڑ چھاڑ کے بغیر
اور سمجھوتوں کے زنجیروں میں جکڑ کر
زندگی نہیں رہ جاتی
بلکہ اس کی موت ہو جاتی ہے

○

## کچا ساتھ

باتوں باتوں میں اس نے
ایک دن مجھ سے کہا
مجھے تو سونا پسند ہے
تمہیں کیا پسند ہے
میں نے ہنستے ہوئے کہا
جاگنا
اگلی ہی شام وہ کسی دوسرے کے ساتھ
پارک کی اس بنچ پر بیٹھی تھی
جہاں
اجالا بہت کم ہوتا ہے

## گھر کے آنگن کی طرح ملک سجانا ہے تجھے

ہاتھ اُٹھائے ہوئے مغموم دعا کرتے ہیں
جو مسرت سے ہیں ، محروم دعا کرتے ہیں
ٹوٹے بکھرے ہوئے مغموم دعا کرتے ہیں
تو سلامت رہے معصوم دعا کرتے ہیں
تیری کوشش سے مقدر یوں ہمارا چمکے
رات کو جیسے فلک پر کوئی تارا چمکے
خوف دہشت کا چلن بڑھ کے مٹانا ہے تجھے
بے گھروں کو بھی کسی روز بسانا ہے تجھے
آگ نفرت کی سلیقے سے بجھانا ہے تجھے
گھر کے آنگن کی طرح ملک سجانا ہے تجھے
ہاں اسی ملک کے سورج کی کرن ہے تو بھی
مادرِہند کی بیٹی ہے بہن ہے تو بھی
تو نے مذہب کی سیاست سے بچایا خود کو
فرقہ بندی کی کثافت سے بچایا خود کو
کسی ظالم کی حمایت سے بچایا خود کو
اوچھے لوگوں کی قیادت سے بچایا خود کو
تو نے خودداری کا دریا کبھی رکنے نہ دیا
سر کو غداروں کے دربار میں جھکنے نہ دیا
تیری شہرت سے لرزتے ہیں حکومت والے
تیری نباضی سے ڈرتے ہیں سیاست والے
تیری بیباکی کا دم بھرتے ہیں جرأت والے
جان دے دیں گے ترے نام پہ عزت والے
جیت اور ہار بھی موسم کی طرح ہوتے ہیں
اور دربار بھی موسم کی طرح ہوتے ہیں
تو نے تہذیب کی دیوار کو گرنے نہ دیا
سر سے لپٹی ہوئی دستار کو گرنے نہ دیا
کسی مندر کسی دیوار کو گرنے نہ دیا
اور اردو کے بھی معیار کو گرنے نہ دیا
تمکنت رکھتی ہے تو لکشمی بائی کی طرح
تجھ کو مظلوم نظر آتے ہیں بھائی کی طرح
جب وہ کرسی کی غلاظت سے نکل آئیں گے
پھینک کر ہاتھوں سے پھر نیل کنول آئیں گے
ہوگا جس وقت وہاں پھیر بدل آئیں گے
جو تجھے چھوڑ کے جاتے ہیں وہ کل آئیں گے
کل یہی کرتے ہوئے تیری ثنا آئیں گے
چومنے کو تری دستارِ انا آئیں گے
چھاؤں قسمت ہے تو پھر دھوپ کہاں پہونچے گی
بھول کر بھی نہ گلستاں میں خزاں پہونچے گی
عزّتیں خوب ملیں گی تو جہاں پہونچے گی
ایک شاعر کی دعا ہے تو وہاں پہونچے گی
سارے مظلوموں کو جس موڑ پہ مل جانا ہے
پھول جو سوکھ رہے ہیں انھیں کھِل جانا ہے

○

## خودکلامی

کیا ضروری ہے کہ ہم فون پہ باتیں بھی کریں
کیا ضروری ہے کہ ہر لفظ مہکنے بھی لگے
کیا ضروری ہے کہ ہر زخم سے خوشبو آئے
کیا ضروری ہے وفا دار رہیں ہم دونوں
کیا ضروری ہے دوا ساری اثر کر جائے
کیا ضروری ہے کہ ہر خواب ہم اچھا دیکھیں
کیا ضروری ہے کہ جو چاہیں وہی ہوجائے
کیا ضروری ہے کہ موسم ہو ہمارا ساتھی
کیا ضروری ہے سفر میں کہیں سایہ بھی ملے
کیا ضروری ہے تبسم یونہی موجود رہے
کیا ضروری ہے ہر اک راہ میں جگنو چمکیں
کیا ضروری ہے کہ اشکوں کو روانی بھی ملے
کیا ضروری ہے کہ ملنا ہی مقدّر ٹھہرے
کیا ضروری ہے کہ ہر روز ملیں ہم دونوں
ہم جہاں گاؤں بسائیں وہاں اک جھیل بھی ہو
کیا ضروری ہے محبت تری تکمیل بھی ہو

○

# ادھ کھلے پھولوں کا زمانہ

حسن منظر
(کراچی)

میری بات سننے کے لیے میری۔این Marianne اپنے ماں باپ سے دو قدم پیچھے رہ گئی۔ میں تیز تیز قدموں چل کر اس تک پہنچا تھا۔ اُس وقت وہ اُن کے ساتھ لنچ بریک میں گھر جا رہی تھی۔ اسٹریٹ جو اسٹاف کے دو رویہ بنگلوں کے درمیان تھی اس وقت سنسان تھی۔ مجھ میں جو حوصلہ اس سے پہلی بار بات کرنے کا اچانک بیدار ہوا تھا اس میں اسٹریٹ کے سنسان ہونے کا بھی دخل تھا۔ ورنہ، میں جھینپو تو ہرگز نہیں لڑکیوں سے بات کرنے کے معاملے میں شرمیلا حد سے زیادہ تھا۔ کولج میں داخلے کے بعد ایسا ان سب کے ساتھ ہوا تھا جن کا پہلی بار کو ایجوکیشن سے واسطہ پڑا تھا۔ جھینپو اس لیے خود کو نہیں کہا کہ کلاس میں پڑھانے والے کے سوال کا جواب دینے میں پہل اکثر میں ہی کرتا تھا۔

میں نے اس کے پاس پہنچ کر کہا تھا:

''Excuse Me''

جس پر اس نے گھوم کر مجھے دیکھا اور بات کرنے کو رک گئی۔ قدم بھر آگے اس کے ماں باپ بھی رک گئے۔

میں نے کہا: میں میموتی ہوں۔

اس نے کہا: میں جانتی ہوں۔

میں نے فوراً کہا: آپ کولج چھوڑ کر جا رہی ہیں۔

اس نے سر کی جنبش میں ہاں کہا۔ اس کے ماں باپ منتظر ہوں گے کہ میں آگے کیا کہتا ہوں۔

میں نے گلوگیری سے ٹھہر ٹھہر کر کہا: ''مجھے بڑا دکھ ہے''

وہ خاموش رہی۔ جو میں نے کہا تھا اس میں کوئی برائی بھی نہیں تھی جس کا وہ بُرا مانتی اور جس کا مجھے ڈر ہوتا۔ جو میرے منہ سے نکلا تھا وہ رسمی نہیں تھا۔ وہ اس سے آگے کچھ سننے کی منتظر تھی۔ پھر جو میرے منہ سے نکلا: ''آپ تھیں تو میں پڑھائی میں زیادہ محنت کر سکتا تھا، وہی میرے دل میں تھا لیکن تھی بے تکی سی بات''

اس نے ہلکی سی شرارت سے کہا ''مجھے نیچا دکھانے کے لیے''

میں سٹپٹا گیا۔ نہیں، آپ سے Compete کرنے کو۔ آپ سے Compete کرنا اچھا لگتا تھا۔ اب اتنی محنت نہیں کر سکوں گا۔

پھر میں نے اس کے باپ پروفیسر جورڈن کی طرف دیکھ کر کہا ''ہم دونوں ایک کلاس میں ہیں۔''

انہوں نے بھی وہی بات کہی جو چند لمحے پہلے میری۔این نے کہی تھی:

''I Know''

''You Know!'' میں نے تعجب سے کہا کیوں کہ وہ میتھس کے پروفیسر تھے اور ان کلاسوں میں کب آئے تھے جن میں ان کی بیٹی ہوتی تھی، اور میں۔ اور انہوں نے کب مجھے کسی سوال کا جواب دیتے ہوئے سنا ہوگا جو مجھے یقین تھا میری۔این سنتی تھی۔ اس عمر میں نوجوانی میں داخل ہونے والے لڑکے لڑکیاں جن چھوٹی چھوٹی باتوں کو گرہ میں باندھ لیتے ہیں بڑے ہونے پر پتہ چلتا ہے کچھ بھی نہیں تھا۔

وہ مجھ سے کم جھینپ رہی تھی بلکہ بالکل بھی نہیں۔ اس کی دنیا میں کم عمری سے عورتوں مردوں کا ساتھ روز کی بات ہے، مثلاً چرچ ہی میں، میری دنیا میں نہیں۔ اس کے چہرے پر متانت تھی۔ میرے پاس کہنے کو کوئی اور بات نہیں تھی لیکن وہاں سے ہٹنا بھی نہیں چاہتا تھا، جیسے بات ختم نہیں ہوئی ہے۔

اس کے باپ نے ہمدردی سے کہا: ''ہمارے ساتھ گھر کیوں نہیں چلتے۔ ساتھ کھانا کھانا، باتیں بھی ہوں گی۔''

اس کی ماں نے کہا ''Yes why not, Come'' وہ ہمارے یہاں نہیں پڑھاتی تھیں لیکن دیکھا انہیں میں نے اکثر پروفیسر جورڈن کے ساتھ تھا۔

دونوں کی بات میں مجھے ہمدردی لگی۔ میرا دل بھر آیا۔ ڈر رہا تھا رونا نہ آ جائے۔ کیا سوچے گی۔ اس مہینے پہلے بھی ایک موقع پر رو پڑا تھا، آج پھر! وہ غصے کا رونا تھا، یہ دکھ کا ہوتا۔

میں بلا تامل ان کے ساتھ چل پڑا۔

ہوسٹلز میں رہنے والے لڑکوں میں سے کسی نے لنچ کے لیے میس جاتے ہوئے۔۔۔ کچھ دور تک ان کی بھی وہی راہ تھی۔۔۔ اگر مجھے اس سے باتیں کرتے دیکھا ہوگا تو اس کی مجھے آج پرواہ نہیں تھی۔ جس رنج سے میں دوچار تھا اس وقت اس سے بات کرنے کی مسرت نے یکجا ہو کر مجھے باقی دنیا سے بے خبر کر دیا تھا۔ دماغ نے کہا یہی کہیں گے نا آج یہ ایک لڑکی سے بات کیسے کرنے لگ گیا اور بعد میں سننے والا یہ جان کر کہ وہ لڑکی میری۔این تھی ہو سکتا ہے میری ہنسی اڑائے۔ So What!

میری۔این کا گھر یا بنگلو ڈوکٹر ایلین کے بنگلے کے بعد اس اسٹریٹ پر سیدھے ہاتھ پر تھا جس کے خاتمے پر ایک بڑا راؤنڈ اباؤٹ تھا۔ وہ جگہ پورے کولج سے الگ تھلگ تھی۔ شروع کے دنوں میں جب تک میں نئے دوست نہیں بنا پایا تھا اور زندگی کا صرف ایک ہی مقصد جانتا تھا، پڑھنا، تقریباً ہر روز ہی لنچ بریک میں اسی اسٹریٹ پر چل کر خود کو وہاں لے جاتا تھا۔ ٹک شوپ میں جا کر پیٹ میں کچھ ڈالنے یا میس میں نام لکھوا کر دوپہر کا کھانا کھانے کا میرا یارا نہ تھا۔ راؤنڈ اباؤٹ میں بنچیں تھیں۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں ہوتا تھا۔ سینڈلز اتار کر بیٹھتا تو

پیروں تلے گھاس کی سرسراہٹ بھلی لگتی۔ چاروں طرف اسٹاف بنگلوز کی نیلے، پیلے پھولوں سے بھری باڑیں تھیں اور ہر طرف پودوں سے بھی پھول جھانک رہے ہوتے تھے۔ اوران سب سے بڑی چیز تھی وہاں کا سناٹا۔

وہاں بیٹھ کر میں پڑھنے کی کوشش کرتا۔ انگلش کے سوا سارے مضمون میرے لیے نئے تھے اور کلاس کے ساتھ ہم قدم رہنے میں مجھے تن من دھن کا نہیں پوری توجہ کا زور لگانا پڑ رہا تھا۔

کبھی پشت پر قدموں اور چھڑی کی آہٹ سنائی دیتی تو گھوم کر دیکھتا۔ کوئی تعلیم کا والہ وشیدا پروفیسر، جیسے کہ ٹائم ختم ہو جانے پر بھی کلاس کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے ہیں، تیز قدموں لنچ کے لیے گھر جا رہا ہوتا نظر آتا تو اس سے پہلے کہ میں لب کھولوں بول اٹھتا ''گڈ آفٹرنون'' اور اگر تعظیماً کھڑا ہونے کی کوشش کرتا تو کہتا: ''Keep Sitting۔ پڑھتے رہو''

اُن دنوں اس اسٹریٹ پر جو ٹیچنگ بلوکس، ایڈمنسٹریشن اور لائبریری کی عمارتوں کی حد کو پیچھے چھوڑ کر اسٹاف کے رہائشی علاقے میں داخل ہوتی تھی لنچ بریک میں کبھی کبھی میری۔ این کی جھلک مجھے نظر آتی یا وقفہ ختم ہونے پر اسے گھر سے نکل کر اسٹریٹ پر آتے ہوئے۔ ساتھ ہی پلک جھپکنے میں میری نظریں دوسری طرف پھر جاتیں۔

اس راؤنڈ اباؤٹ میں جا کر پڑھنا بس کچھ دن رہا۔

اس کے بعد میں نے وہ پینتالیس منٹ لائبریری میں صرف کرنے شروع کیے اور اُس اچٹتی ہوئی دلچسپی کی ملی جلی کیفیت سے جو میرے لیے نئی تھی وہاں بھی دو چار ہونا پڑا۔ روز نہیں کسی کسی دن اُسے کلاس کی لڑکیوں کے ساتھ یا اکیلے nestibule میں سے ہو کر اندر داخل ہوتے دیکھتا۔

ایک دن کاؤنٹر پر رک کر لی ہوئی کتاب واپس کرتے ہوئے جب اس کا پورا رُخ دور ہی سے سہی، میری طرف تھا تو مجھے پہلی بار یہ خیال آیا تھا ''یہ ہے وہ لڑکی''، یعنی میرے ذہن میں اس کا بن بنائے، اپنا خاکہ بن چکا تھا۔ اوروں کی شکلیں ابھی میرے دماغ میں اپنی جگہ نہیں لے پائی تھیں ان کی حیثیت جہاں بھی نظر آئیں ایک بھیڑ کی ہوتی تھی۔ لیکن لگتا تھا اُس پہلے ہی ہفتے میں جو میں نے کورلج میں گزارا تھا اس نے بلا بتائے اپنی پہچان پیدا کر لی تھی۔

لیکن اس آگاہی نے مجھے چوکنا کر دیا: یہ ٹھیک نہیں ہے۔

اس کے بعد کتنی ہی بار ایسا ہوا میں کاؤنٹر سے دور کوئی کتاب کھولے بیٹھا ہوں اور نظر اٹھتی تو دیکھتا کسی الماری میں سے کتاب چنتے ہوئے اس کی پشت میری طرف ہے یا کتاب اِشو کروا کر وہ جا رہی ہے۔

بغیر اس سے بات کیے یا کسی سے اس کے بارے میں پوچھے، ادارے کے خلاف میں اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا جا رہا تھا۔ کیا کچھ؟

یہی کہ میری۔ این ہندوستان کے انتہائی جنوب میں کہیں کی ہے: کیرالا کی۔ اس کی رنگت میری ماں کی جتنی تو نہیں اپنی ماں سے یقینی کھلتی ہوئی تھی اور اپنے ساتھ کی ہر لڑکی سے بھی۔ اس کے باپ پروفیسر تھے Maths کے۔ لیکن ان کی رنگت بیٹی کے حصے میں بالکل نہیں آئی تھی، نہ ہی۔۔۔ یہ کئی مہینے بعد پتہ چلا۔۔۔ اس کے بھائی کے حصے میں۔ دونوں اپنی ماں پر پڑے تھے۔ اس کا ڈریس سدا ایک ہی رہا۔ شرٹ اور اسکرٹ جو ہمیشہ اُجلی سفید، استری کی ہوئی ہوتی تھی اور کندھوں سے کچھ اوپر سفید ربن میں بندھے چوٹیوں کے گچھے لگتا تھا دونوں طرف سے چہرے کو سجائے ہیں۔ میرا خیال تھا گھر سے کورلج کے لیے نکلنے کے وقت یہ آخری کام ہوتا تھا جو اس کی ماں کرتی ہوں گی۔

اکثر الماری کی شیلف کی کتابوں کے ٹائٹل پڑھنے کے لیے اُسے پنجوں پر اچکنا پڑتا تھا۔ میری طرح۔ اور یہ بھی تھا کہ داخلے کے بعد جو لسٹ نئے اسٹوڈنٹس کے ناموں اور رول نمبرز کی ایڈمنسٹریشن بلوک میں لگائی گئی تھی اس میں لڑکیوں کے نام پڑھ کر ایک نام کے بارے میں میں نے فیصلہ کر لیا وہ Marianne تھی۔ دوسری لڑکیوں کے نام اور سرنیم، لباس میرے لیے نئے نہیں تھے۔ اُن میں سے صرف ایک اور اسکرٹ میں ہوتی تھی لیکن اس کی شرٹ اور اسکرٹ سفید نہیں ہوتی تھیں۔ خود اس کی طرح ڈلی رنگوں کی۔ وہ لمبی تھی، موٹے لینسوں کا چشمہ لگاتی تھی اور آئے دیر نہیں ہوئی لڑکوں نے اس سنجیدہ لڑکی کا بیہودہ سا نام رکھ لیا تھا۔ دوسری لڑکیوں کی نسبت وہ میری۔ این سے زیادہ قریب نظر آتی تھی۔

اسی لسٹ نے مجھے بتایا کہ اس لڑکی کا اور میرا مقابلہ رہے گا۔ وہ میری حریف تھی!

یہ تھا اس کا سراپا۔ اور میرا؟ جس دن میں داخلے سے پہلے کسی بھی قسم کی مراعات کی آرزو میں پرنسپل سے ملنے گیا تھا وہی کپڑے پہنے تھا جو چھوڑے ہوئے ملک میں اسکول پہن کر جاتا تھا۔ شورٹس۔ نئے مناسب کپڑے بنوانے میں کسی ملک میں نئے آنے والوں کو جو دولت سے لدے پھندے وہاں نہ آئے ہوں دیر لگتی ہے۔ باوجود پرنسپل کی سفید رنگت اور نیلی آنکھوں کے مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ میں کسی غلط جگہ آ گیا ہوں نہ ان سے بات کرتے ہوئے مجھے اپنا بے ڈھب لباس تنگ کر رہا تھا۔ انہیں میرے تعلیمی رکورڈ میں دلچسپی تھی اور مجھ میں۔

داخلے کے بعد جس دن سارے نووارد ہول میں جمع کئے گئے تھے ان سب کا لباس وہ تھا جو بڑے ہو جانے پر لڑکے (اور لڑکیوں) کا ہوتا ہے۔ میں اپنی خود اعتمادی میں یہ بھی محسوس نہیں کر رہا تھا اپنے کپڑوں سے تھوڑا بڑا ہو چکا ہوں۔ لیکن ہوں میں تقریباً سارے ہی کورلج کے لیے اچنبھا سا۔ آپس کی بات چیت میں میری بولی، میرے جوتے، کپڑے، ساتھ والوں سے کچھ کچھ الگ تھلگ رہنا اور کھاتے پیتے گھرانوں سے آنے والے نوجوانوں کی طرح روزانہ ٹک شوپ کا رخ نہ کرنا میری نظر میں یہ سب کوتاہیاں نہیں تھیں۔ دوسرے چاہتے تو ان سب کا مذاق اڑا سکتے تھے لیکن سو (۱۰۰) میں سے ۹۹.۹۹ نے کبھی ان کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ بس ایک کلاس فیلو کو میں پسند نہیں تھا۔ کیوں؟ یہ میں نہیں

جانتا۔ ہوسکتا ہے اُسے جس کولج میں وہ آیا تھا میں بے جگہ لگتا ہوں۔۔۔اَن فٹ۔ایک کم حیثیت انسان کی جان کاری، اس کا علم، ایک باحیثیت فرد میں جوان سے عاری ہو حقارت کے سوا کیا جگا سکتی ہے، میرا پیچھے ہٹتا ہوا بچپن اس دور میں اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا تھا ورنہ میں اسے قابل معافی سمجھتا۔

ہلکے جاڑے شروع ہو چکے تھے۔ اکثر اسٹوڈنٹس اب کولج سوٹ میں آنے لگے تھے۔ میں اپنی اسکول کے دنوں کی اچکن سے کام چلا رہا تھا۔ وہ لڑکا سگرٹ کے پیکٹ اور کھٹاکے سے کھلنے والے سگرٹ لائٹر کو ساتھ لئے کولج کی دنیا میں داخل ہوا تھا۔ جاڑوں میں ان میں رولی فلیکس کیمرے کا اضافہ ہوگیا۔ میرے پہناوے نے اس کی حقارت کی آگ کو اور بھڑکا دیا۔ اس کا کیمرہ سب کو مرعوب کرتا تھا، میرے پاس اس کا کوئی توڑ نہیں تھا۔ اُٹھتے، بیٹھتے، چلتے پھرتے اس کے جملے مجھے کاٹتے تھے اور میری بے بسی میں خاموش رہنے سے ان کی کاٹ بڑھتی جارہی تھی۔ وہ مجھے کلاس میں اور کلاس کے باہر مختلف ناموں سے پکارتا جن کے ساتھ انگلش بدزو کے لفظ جڑے ہوتے۔ جلد ہی میں کلاس میں پوچھے جانے پر بھی سوال کا جواب دینے سے کترانے لگا کہ میرے جواب کے ساتھ ہی مجھے اس کی ایک بھن سی سنائی دے گی جو کسی بیہودہ لفظ سے جڑی ہوگی۔ یا یہ کہ میرا جواب جسے پڑھانے والا/ والی نے تحسین سے سُنا ہو میری پیٹھ کی طرف کہیں کیچڑ میں ڈھیلے کی طرح گرا ہو اور اس کی چھینٹیں اچٹ کر مجھ پر پڑتیں جو تین عام استعمال میں آنے والی انگلش گالیاں ہوتی تھیں۔

اس دن جس کی تفصیل بیچ میں آ گئی ہے ہم ایک پریکٹیکل کے بعد تھکے ہوئے لیکچر تھیٹر میں آئے تھے جہاں دائیں بائیں دیواروں پر لگے ہوئے پینلز پر ہر رو (Row) میں بیٹھنے والوں کے رول نمبرز چوک سے لکھے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر لیکچرر خالی سیٹوں کے نمبر منٹ دو منٹ میں نوٹ کرتا اور لیکچر شروع ہو جاتا۔

اس دن سگریٹ لائٹر والے اسٹوڈنٹ کی تنگ کرنے کی رگ کچھ زیادہ ہی بھڑکی ہوئی تھی۔ وہ پہلے تو اپنی دو صف پیچھے والی سیٹ سے انگریزی کے وہی تین گرے ہوئے لفظ ''O' You'' کہہ کر مجھے پکارتا رہا، پھر کاغذ کے ٹکڑے چبا چبا کر ہاتھ بڑھا کر اس نے میری اچکن کے کولر اور گردن کے بیچ میں گھسیڑنے شروع کئے اور جب میری خاموشی یا اس کی دلیری اس کی برداشت سے باہر ہوگئی تو وہ اپنی سیٹ، اپنی رو (Row) چھوڑ کر نیچے آ کر میرے برابر والی خالی سیٹ پر بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرا ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ مجھے یاد نہیں کب میں نے اپنا ایک سینڈل اتارا اور تڑاتڑا اس کے سر اور چہرے پر برسانا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی پوری کلاس میں جیسے قیامت آ گئی۔

امریکی لیکچرر نے بلیک بورڈ سے مڑ کر اس سین کو دیکھا، اور انہیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ معاملہ کیا ہے۔ سیڑھیاں چڑھ کر وہ میری سیٹ تک پہنچے لیکن ان کا پہلا سوال مجھ سے نہیں، مجھے ایذا دینے والے سے تھا:

''تم اس سیٹ پر کیسے ہو؟''

میری حالت وہ دیکھ رہے تھے۔

انہوں نے میرے Tormentor کو وہیں چھوڑا جہاں تک وہ پہنچ پایا تھا اور مجھے ساتھ آنے کے لیے کہا۔ نیچے پہلی رو (Row) کے جس حصے میں لڑکیاں بیٹھی تھیں ان میں ایک سیٹ میرے لیے پیدا کی اور مجھے اس پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ لڑکیاں خاموش رہیں، میری۔ این میرے برابر کی سیٹ پر مورتی کی طرح بیٹھی تھی۔ میرے آنسو خشک نہیں ہوئے اور میں ابھی تک غصے سے کانپ رہا تھا۔ لیکن ایک طرح سے دل میں مطمئن تھا کہ اُس عمل پر زیادہ سے زیادہ مجھے کولج سے نکالا جا سکتا ہے تو کیا؟ شہر میں دوسرے کتنے ہی کولج ہیں، ان کے دروازے مجھ پر کھلے ہیں، لیکن نکالے جانے کا وہ خطرناک لفظ میرے ذہن پر منڈلا رہا تھا۔ کیوں کہ تھا بہرحال میں ایک نئے ملک میں پناہ لینے والے گھرانے کا فرد اور اگر کیا جاتا تو کر بھی کیا سکتا تھا۔

بعد میں کلاس ختم ہونے پر جب ہم باہر نکلے تو اس لڑکے نے پھر انہی انگلش گالیوں کے ساتھ مجھ پر حملہ کرنا چاہا لیکن وہ کم عمر امریکی پروفیسر اس سے طاقت میں کہیں زیادہ تھے۔ ان کے اُسے مجھ سے دُور کرنے ہی میں وہ گرتے گرتے بچا۔

اپنے کمرے میں انہوں نے مجھ سے پوری روداد سنی۔ اسٹوڈنٹس کی پچھلی اور حالیہ کارگزاری کے کاغذات ان کی میز پر موجود تھے جس پر انہوں نے نظر دوڑائی اور مجھے کاغذ قلم دیا کہ سب کچھ لکھ دوں۔

لیکن جب ہم دونوں باہر آئے، وہ مجھے ڈین کے پاس لے جانا چاہتے تھے تو کولج کا وقت ختم ہو چکا تھا اور اگلے دن سے کرسمس کی چھٹیاں تھیں۔ انہوں نے مجھے فکر مند نہ ہونے کے لیے کہا اور ساتھ ہی

''Enjoy the Holidays''

ڈین کے اوفس کے باہر دو طالب علم میرے دفاع کے لیے رک گئے تھے کیوں کہ انہوں نے دیکھا تھا وہ بگڑا ہوا، کسی بڑے گھرانے کا نوجوان کچھ دیر وہاں میری گھات میں کھڑا رہا تھا اور پھر ان بچانے والوں کے تیور دیکھ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔

کرسمس کی چھٹیوں کے بعد جب میں کولج لوٹا تو تنہا نہیں رہا تھا۔ میرا لنچ بریک میں راؤنڈ اباؤٹ میں جا کر بیٹھنا یا وقت کو لائبریری میں گزارنا ختم ہو گیا۔ اب میں کلاس کے ساتھیوں میں سے ایک تھا جو اس واقعہ کا ذکر ایک بار بھی زبان پر نہیں لائے۔ میرا لباس بھی اب وہ نہیں رہا تھا، ان سب جیسا ہی تھا۔ پاس سے گزرتی ہوئی لڑکیوں کے چہروں سے بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ ان کے لیے وہ واقعہ ایسا تھا کہ وہ اُسے یاد رکھتیں۔

میری۔ این اب زیادہ نظر آتی تھی اکثر اپنی اس دوست کے ساتھ، لیکن مجھے کبھی نہیں لگا انہوں نے مجھے خاص طور سے دیکھا ہو لیکن لائبریری جانا جو

سال کے شروع میں اتنا ریگولر تھا اب میرے لیے کبھی کبھی رہ گیا تھا اور اس کے لیے بھی۔ یہاں تک کہ سال ختم پر آ پہنچا۔ سال جو زیادہ سے زیادہ دس مہینے کا ہوگا۔۔۔اور انہی دنوں میں نے سُنا پروفیسر جوزف جورڈن انڈیا جا رہے ہیں۔ ان دنوں اکثر ایسا ہوتا تھا آج یہاں کے فلاں پروفیسر انڈیا منتقل کیے جا رہے ہیں۔ کل کوئی اور وہاں سے یہاں آ جائے گا۔ اور اُن کا یا مشنریوں کا ایک ملک سے دوسرے ملک میں ٹرانسفر ایسا تھا جیسے ملک کی کاٹ چھانٹ ہوئی ہیں، بورڈر کو پار کرنے کی پابندیاں ان کے لیے نہیں تھیں۔ ان کے لیے یہ بھی برما سے افغانستان اور ہمالیہ سے راس کماری تک پھیلا ہوا ایک ہی ملک تھا۔ مجھے اُن پر رشک آتا تھا اور کیوں نہ آتا۔ میں سنتا پروفیسر کیمپل گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے نیل گری میں پہاڑ جاتے ہیں اور مسٹر اور مسز ڈنکن مسوری۔ ہم وہاں جانے کا ارادہ بھی نہیں کر سکتے تھے بلکہ میں تو اپنے اس شہر کا بھی نہیں جہاں پیدا ہوا، پلا بڑھا تھا۔

پروفیسر جورڈن کے جانے کی خبر سے وہ اسٹوڈنٹس متاثر ہوئے تھے جنہوں نے میتھس لے رکھی تھی اور پروفیسر ہمارے نئے ملک میں عنقا ہو گئے تھے۔ میرے ساتھیوں پر اس خبر کا اثر نہیں ہوا لیکن خبر سن کر مجھے دل تھاما ہوا سا لگا۔ کیا میری۔ این بھی چلی جائے گی! اور اسی لمحے مجھے جواب بھی مل گیا وہ کیسے جا سکتی ہے، کورس پورے کرے گی۔ اس کی ماں اور وہ یہیں رہیں گی۔

امتحان کی آمد ہمارے لیے ایسے تھی جیسے کوئی سائکلون آ رہا ہو۔ اس نے سب کچھ بھلا دیا۔ میں نے ہفتہ دس دن محسوس ہی نہیں کیا کہ میری۔ این کلاس اٹینڈ نہیں کر رہی ہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ تھی وہ اسی کولج، اسی بنگلو میں۔

اچانک ایک دن وہ مجھے کیمسٹری لیبورٹری میں، دوسرے سرے پر، ایک ایکسپیری منٹ میں مصروف نظر آئی اور ہمارے ڈیمونسٹریٹر وہاں اس کے پاس کھڑے اس سے سوالات کر رہے تھے۔ جو ایکسپیریمنٹ اُسے کرنے کے لیے دیا گیا تھا اس سے مختلف تھا جو ہم کر رہے تھے۔ جو ہم شاید ہفتہ بھر بعد کرتے۔ پھر وہ اپنا جرنل سنبھالے ان کے ساتھ ان کی میز تک آئی۔ انہوں نے مزید دو ایک سوالوں کے بعد جرنل پر دستخط کیے اور اُسے میری۔ این کے حوالے کرتے ہوئے کچھ کہا۔ جس پر اس نے مسکرا کر تھینک یو کہا اور خاموشی سے باہر چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد لنچ بریک تھا۔ میں پیڑوں کے سائے میں جا کر اس بنچ پر بیٹھ گیا جہاں کولج کی اکیڈیمک عمارتوں کے خاتمے پر سامنے وہ اسٹریٹ تھی جو اسٹاف کے بنگلوز کے درمیان چلتی ہوئی اس راؤنڈ اباؤٹ کو جاتی تھی جہاں ایک زمانے میں میں بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا۔ تب ہی کی طرح کا سناٹا اسوقت بھی میرے اندر تھا۔

پھر وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ جاتی نظر آئی۔ میرا سارا حجاب یکبارگی اٹھ گیا اور تیز تیز قدموں چلتا میں اُن تین تک پہنچا اور میرے منہ سے نکلا:

''Excuse Me''

میرا خیال تھا وہ حیران ہے اس لڑکے کو آج مجھ سے کیا بات کرنی ہے جس نے سال بھر میں پاس سے گزرتے ہوئے کبھی سر کی جنبش سے بھی وہ کام نہیں لیا جو محض پہچان پر لوگ کیا کرتے ہیں، جیسے چرچ میں ہوتے اس نے بارہا دیکھا ہوگا جیسے مسجد میں ہوتے میں دیکھتا آیا تھا۔

گھر پہنچ کر وہ اپنے کمرے میں غائب ہو گئی۔ ماں میرا خیال ہے کچن میں چلی گئی تھیں اور باپ؟ وہ بھی گھر میں کہیں تھے۔ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا تھا جہاں میرے سامنے ایک چھوٹی میز پر رسالے پڑے تھے۔ ان میں سے میں نیشنل جیوگریفک کو جانتا تھا اور ریڈرز ڈائجسٹ کو بھی لیکن باقی رسالے کسی ایسے پرنٹ میں تھے جو ہندی سے ملتا جلتا تو تھا، ہندی نہیں تھا۔ میں اُن کے ورق الٹ رہا تھا کہ اس کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ اب وہ گھر کے کپڑوں میں تھی۔ ہلکے رنگوں کا گھٹنوں تک پہنچنے والا ڈریس۔ بالوں میں تبدیلی نہیں آئی تھی۔ چہرے کے دونوں طرف چٹیاں تو تھیں لیکن ان کے گچھے اس نے کھول دیے تھے اور وہ کندھوں کے آگے سینے پر آ گئی تھیں۔ وہ بھی اس وقت اسکول گرل لگ رہی تھی۔

میں بے ضرورت احتیاط برت رہا تھا کہ اس کی طرف دیر تک نہ دیکھوں، بس بات کا جواب دینے تک۔

ایک نوکر کمرے کے دوسرے سرے پر کھانا لگا رہا تھا۔

میری۔ این نے میرے ہاتھوں میں غیر زبان کے رسالے کو دیکھ کر کہا ''آپ اِسے پڑھ سکتے ہیں؟''

میں نے نہ میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''تصویریں دیکھنے کی حد تک'' وہ ہنس پڑی۔ ''کون سی زبان ہے؟''

اس نے جھک کر میز پر رسالوں کو تاش کے پتوں کی طرح سرکا کر تین گڈیوں میں کر دیا اور ایک پر انگلی رکھ کر کہا۔

''یہ ملیالی ہیں، یہ تیلگو اور اس سے آپ خود واقف ہیں''

''آپ ان دونوں کو پڑھ سکتی ہیں؟'' میں نے ان پر انگلیاں رکھ کر بھوؤں کی جنبش سے پوچھا۔

اس نے کہا ''صرف انگلش'' ساتھ ہی میں نے کہا ''میری طرح'' اور ہم دونوں ہنس پڑے۔

''نہیں اردو بھی'' اس نے کہا۔ میں کھسیا گیا۔ اسے معلوم تھا سائنس کے مضامین کے سوا میرا اوپشنل مضمون کیا تھا۔ پھر ملیالی رسالوں پر ہاتھ رکھ کر اس نے کہا: ''یہ مدر کے لیے ان کے پیا کوچن سے بھیجتے ہیں کہ ان کی بیٹی اپنی زبان نہ بھول جائے''

''اور یہ؟''

''یہ میرے فادر خود منگواتے ہیں شاید بنگلور سے۔ اور وہ مدر کے پاس آنے والے رسالے بھی پڑھتے ہیں۔ میرا خیال ہے اب انڈیا جا کر وہ زبانوں کے اپنے repertoire میں کچھ اور کا اضافہ کریں گے۔ وہ زندگی بھر علم

حاصل کرتے رہنے کے قائل ہیں''

میں نے متاثر ہوکر کہا: ''اور شاید ان کا اثر آپ میں بھی آیا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''آپ بھی اتنی ہی سنجیدہ ہیں، پڑھاکو''

اس کی ماں نے دور سے کہا: ''شام کو اسے گوشو کے ساتھ شور مچاتے سنو گے تو سمجھو گے ابھی نرسری میں ہے۔''

کھانے کا میز لگانے کا کام پورا ہو چکا تھا۔اس کی ماں، مسز جورڈن نے خود وہاں کھڑے ہوکر میرے لیے بھی پلیٹیں لگوائی تھیں۔

ماں کا اشارہ پا کر میری۔این نے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ ڈوکٹر جورڈن بھی ایک کمرے سے نمودار ہوئے۔اُن کے ہاتھ میں آج کا اخبار تھا۔میز پر سب کی جگہیں مقرر تھیں۔ مجھے اس طرف بٹھایا گیا جو میری۔این کے بالمقابل تھی۔ جو اس کے برابر کی جگہ تھی وہاں جب گھر میں ہوتا ہوگا تو گوشو بیٹھتا ہوگا۔ جب کرسی کھینچ کر پروفیسر جورڈن بیٹھنے کو ہوئے تو مسز جورڈن نے اخبار کو ان سے چھینتے ہوئے ملائم لہجے میں کہا ''یہ خیال رہے اس وقت گھر میں ایک مہمان بھی ہے''ہنس کر انہوں نے اخبار اپنے کندھے پر سے پیچھے اچھال دیا۔

میری۔این نے باپ کو چھیڑنے کے لیے مجھ سے کہا۔

''That's how my father is''

سب ہنس پڑے۔

شروع میں، میں نے باوجود اصرار کے کھانے سے انکار کر دیا اور کہہ رہا تھا ''میں تو صرف ملنے آیا تھا'' میری حالت اس ضرورتمند کی تھی جسے ایک عمر وہ جو کچھ چاہتا تھا نہیں ملا اور یکا یک غیب نے اپنی عطا کے دروازے اس پر کھول دیئے ہوں۔سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کیا کروں۔ جسے لاکھ جھٹلاؤں دور سے دیکھنے بلکہ دیکھ پانے کا آرزومند رہا تھا۔۔۔گھر کی تعلیم کے خلاف۔۔۔آج وہ اتنی نزدیک ہے۔یہ سب کچھ میری توقع سے باہر تھا۔پھر میں نے محسوس کیا ماں، باپ اور بیٹی کھانا شروع کرتے ہوئے جھجک رہے ہیں،اس لیے جب میری۔این نے میری طرف دیکھتے ہوئے چھری کانٹا میز پر رکھ دیا تو مجھے ان کا ساتھ دینا پڑا۔

کھانا کھاتے ہوئے یکبارگی ہمت کر کے میں نے کہا۔

''آپ لوگ لوٹ کر پھر یہاں آ جائیں گے؟''

''نہیں''اس نے آہستگی اور نرمی سے کہا

''No Never''اس کے ماں باپ جیسے چٹکارے۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر پروفیسر جورڈن میری زندگی کا پروگرام پوچھنے لگے۔''آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے؟''ان کا خیال درست تھا maths نہ لے کر اعلیٰ سائنس کے دروازے میں نے اپنے اوپر بند کر لیے تھے۔ ''Marianne too''انہوں نے بیٹی کو چھیڑنے کے انداز میں کہا۔لیکن ان کا زور اس پر تھا جو کچھ کرنا اس میں کسی کے مشورے یا کُہرتی سے ترقی کے زینے چڑھنے کے امکانات کا جبر نہ ہو۔

ان کی گفتگو میں ہندوستان کی ان یونیورسٹیوں کا ذکر بھی آ جاتا تھا جہاں وہ پڑھتے تھے، پڑھا چکے تھے۔ وہ، وہ تھے جنہیں تعلیم کی دنیا میں academic کہا جاتا ہے اور کچھ نہیں۔

میری۔این خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔معمولی روزمرہ کا کھانا لیکن جو میری لیے بنا تھا۔ابلے ہوئے چاول، سیم جیسے بیجوں کا سالن، تلی ہوئی چھوٹی مچھلیاں جو اکثر میری ماں بھی بناتی تھی۔۔۔لیکن مختلف طرح اور کمی پوری کرنے کے لیے ڈبل روٹی کے سلائس اور مکھن۔

یہ وہ لڑکی تھی خاموش طبیعت، قبول صورت سے بڑھ کر، کھلتی ہوئی رنگت والی، ملیائی کرسچین، جس کی مین نے دل میں سدا عزت کی تھی۔نوجوانی بلکہ نوجوانی سے کچھ پہلے کسی بھی لڑکی کے لیے یہ سمجھ لینا کہ جس کے دل میں اس نے گھر کر لیا ہے اسے بھی اس میں دلچسپی ہے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔اس دور سے سب ہی نوجوان گزرتے ہیں۔اکثر بار بار اور اس خوش فہمی کی حد کو ایک وقت آتا ہے کہ پار کر جاتے ہیں۔لیکن میرا معاملہ ان دنوں دوسرا تھا۔

وہ ذہین اور وقت نہ ضائع کرنے والی لڑکی تھی۔ میں اس کی عزت کرتا تھا اور میری دانست میں اس نے بھی محسوس کر رکھا ہوگا کہ میں اس کی عزت کرتا ہوں۔عمر کی اس محدود وژن میں ہم دونوں کے علاوہ کلاس میں تھا اور کون جس کے بارے میں، میں اور میرے خیال میں وہ سوچتی ہو!

کھانے کے بعد چائے ہوئی۔لنچ بریک ختم پر تھا۔میرا خیال تھا وہ کلاس جائے گی اور ہمارا خاموش ساتھ ہو جائے گا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔وہ ذرا دیر کے لیے اپنے کمرے میں گئی لیکن جب باہر آئی تو خلاف توقع اس کے ہاتھ میں نہ نوٹ بک تھی نہ کوئی کتاب۔۔۔قلم پنسل بھی نہیں۔

میں نے کہا: ''آپ کلاس خالی ہاتھ جائیں گی؟''

''میں تو اپنا ایک experiment پورا کرنے گئی تھی جو رہ گیا تھا، اور دوسرا جو اگلے ہفتے ہونا ہے''

میرے منہ سے صرف تعجب میں ''او'' نکلا۔

ایک بار پھر مجھے احساس ہوا واقعی کئی دن سے میں نے اُسے نہیں دیکھا تھا اور سن رہا تھا وہ انڈیا جا رہی ہے۔ میں ''وِش یو گڈ لک'' کہہ کر باہر آ گیا۔ وہ مجھے گارڈن گیٹ تک چھوڑنے آئی لیکن ساتھ کے ان چند لمحوں کو میں نے خاموشی میں گنوا دیا۔

پھر میں نے اس کی ٹوہ رکھی۔اب کہاں ہے، اب کہاں، کس کلاس میں؟ لیکن یہ دلیری ایڈولیسینس (کم عمری) کے گزر جانے کے بعد ابھری تھی جب میں کلاس کی لڑکیوں سے، جہاں بھی مل جائیں بات کرنے لگا تھا۔ان میں سے بھی ہر ایک مجھے میمون کہہ کر بات کرنے لگی تھی۔مسٹر احمد یا مسٹر میمون احمد کہہ کر مخاطب کرنے کا زمانہ ختم ہو گیا تھا اور میرے لیے وہ میگی، میرا اور زینت بن گئی تھیں۔لیکن

باقی صفحہ ۱۰۴ پر ملاحظہ کیجیے

# گھر واپسی

شموئیل احمد

(پٹنہ، بھارت)

نیئے جوگی کو مقام خاص میں بھی جٹہ ہوتا ہے۔

وہ نیا جوگی تھا۔ عالمی ہندو سنستھان کا نیا نیا ممبر....

بات بات پر دھمکی دیتا۔

''پاکستان بھیج دوں گا....''

جوگی ہریانہ کا رہنے والا تھا۔ اس نے بنارس ہندو یونورسٹی سے ہسٹری میں ایم اے کیا تھا اور آگرہ کے ایک کالج میں لکچرر تھا۔ کالج کے ایک جلسے میں اس کی ملاقات سنستھان کے سربراہ جتین کباڑیہ سے ہوئی تھی۔ کباڑیہ کو جوگی میں ایک اصلی ہندو نظر آیا۔ کباڑیہ نے اس کو سنستھان کا ممبر بنالیا۔ سنستھان میں قدم رکھتے ہی اس نے ایک کارنامہ انجام دیا کہ آگرہ میں کچھ مسلمانوں کی گھر واپسی کرادی۔

سنسد میں ہنگامہ ہو گیا کہ مسلمانوں کو ڈرا دھمکا کر ہندو بنایا گیا ہے۔ جوگی نے بیان دیا کہ سب نے اپنی مرضی سے ہندو دھرم اپنایا ہے، بلکہ یہ لوگ بہت دنوں سے۔ ایک مورتی کی مانگ کر رہے تھے کہ پوجا کر سکیں۔ جوگی کی منطق تھی کہ کوئی مارے باندھے کسی سے ہون نہیں کرا سکتا؟

جوگی کی حیثیت سنستھان کے ایک دبنگ لیڈر کی ہو گئی۔

جوگی کے جسم میں پہلے جٹہ نہیں تھا۔ جب سے سنستھان کا رکن ہوا تھا جٹہ اُگنا شروع ہو گیا تھا۔ مونچھیں کڑی ہو کر اوپر کی طرف اٹھ گئی تھیں.... مٹھیاں اس طرح بھینچی رہتیں جیسے کٹار پکڑ رکھی ہو۔ چلتا تو ہاتھ سر کے اوپر لہراتے گویا بازو نہیں تلوار ہیں جو ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ لوگ دور سے ہی سمجھ جاتے کہ جوگی آرہا ہے۔ تب کتے بھونکنا بند کر دیتے۔ ہوائیں ساکت ہو جاتیں۔۔۔ پتوں میں سرسراہٹ تھم سی جاتی....

اصل میں یہ سوچ اب زور پکڑ رہی تھی کہ ہندوستان کے مسلمان پہلے ہندو تھے جنہیں مغل دور میں جبراً مسلمان بنایا گیا۔ اب ہمارا دور ہے تو پھر سے ہندو بنا کر ان کی گھر واپسی کی جائے۔

اب ان کا دور تھا اور جوگیوں کے جٹے اُگ رہے تھے۔ بھارت سیوک سنگھ کی چاندی تھی۔ ہر جگہ کمل کے پھول کھلے تھے اور سیاں کوتوال ہو گئے تھے۔ کباڑیہ اٹھلا کر چلتا تھا۔

گذشتہ دس بارہ سالوں سے علی گڑھ میں 25 دسمبر کو گھر واپسی کی رسم منائی جاتی تھی۔ بھارت سیوک سنگھ کا دعویٰ تھا کہ ہر سال ہزار بارہ سو مسلمانوں کی گھر واپسی ہوتی ہے۔ اس سال بھی یہ رسم زور شور سے منائی جاتی لیکن سنگھ کے ضلع صدر انیل مصرا کو اچانک کشف ہوا کہ ہم ناپاک ہندوؤں کی نسل تیار کر رہے ہیں۔ اس طرح جو مسلمان سے ہندو ہو رہے ہیں ان میں مسلمانی انش تو باقی رہینگے۔ انیل مصرا نے اعلان کیا کہ علی گڑھ میں یہ رسم منانے کی اجازت اب کسی قیمت پر نہیں دی جائیگی۔ اس سے اچھا ہے کہ مسلمانوں کو پاکستان بھگا دیا جائے۔ ایسے حالات پیدا کر دیئے جائیں کہ ملیچھ سرحد پار جانے پر مجبور ہو جائیں۔

لیکن ملیچھ ہندو ہو رہے تھے تو ہندو بھی ملیچھ ہو رہے تھے اور کہیں کہیں ہندو کرشچین بھی بنائے جا رہے تھے۔ گورکھ پور کے محدّی پور ہائڈل کالونی میں ہندوؤں کو کرشچین بنانے کا معاملہ سامنے آیا تو ہندو یوتھ فورس کے رضا کار کالونی پہنچ گئے اور پادری اور نن کو پکڑ کر تھانے لے گئے۔ ان پر الزام تھا کہ پچاس ہزار نقد اور ایک گھر کا لالچ دے کر سو ہندوؤں کو کرشچین بنا چکے ہیں۔ ان کی گھر واپسی کی رسومات ادا کی گئی۔ بدھ وار کے دن گنگا جل کے چھڑکاؤ کے ساتھ منتر کا اچار، تلسی سے ارپن اور ہنومان چالیسا کا پاٹھ پڑھا کر کرشچین بنے سو ہندوں کی گھر واپسی ہوئی لیکن پادری اور نن کے خلاف کوئی ثبوت فراہم نہیں ہو سکا۔ ایسے لوازمات نہیں ملے جو تبدیلیء مذہب میں معاون ثابت ہوتے۔ پادری کے پاس سے پولیس بائبل تک برآمد نہیں کر سکی۔ کچھ کورس کی کتابیں اور کاپیاں ہی ہاتھ لگیں پولیس نے انہیں نجی مچلکے پر چھوڑ دیا اور نامعلوم کے خلاف مقدمہ درج کر لیا۔

سنستھان کو اس بات کی رنجش تھی کہ پادری لوگ وقتاً فوقتاً دلت ہندوؤں کو لالچ دے کر کرشچین بناتے رہتے ہیں۔ چند سال قبل اڑیسہ کا ایک پادری اسکول میں تعلیم کے بہانے عیسائیت کی تبلیغ کرتا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ پادری کو اس کی گاڑی سمیت نذر آتش کر دیا گیا تب واجپئی جی نے کہا تھا کہ مذہب پر بحث ہونی چاہیئے۔ وہ تبدیلیء مذہب پر پابندی کے لیئے قانون بھی بنانا چاہتے تھے لیکن کانگریس نے ساتھ نہیں دیا تھا۔ کباڑیہ کی دلیل تھی کہ ہندوؤں کی آبادی کم ہوتی جا رہی ہے اور مسلمانوں کی بڑھتی جا رہی ہے۔ سرکار یا تو پابندی لگائے یا گھر واپسی کی اجازت دے۔ کباڑیہ نے نعرہ دیا کہ جب تک قانون نہیں بن جاتا گھر واپسی کی مہم جاری رہیگی۔ تبدیلیء مذہب پر ہندو خاموش نہیں بیٹھے گا۔

لیکن ہندو پریشان ہوا جب رام پور میں بالمیکی خاندان نے اچانک مسلمان ہونے کی دھمکی دی۔ ان کے گھروں پر سرکار بلڈوزر چلا رہی تھی اور احتجاج میں وہ اسلام دھرم قبول کر رہے تھے۔ یہ معاملہ سرد بھی نہیں ہوا تھا کہ نیم پر کریلہ چڑھ گیا۔ مدھیہ پردیش کے کھنڈوا ضلع میں آنکاریشور مندر کے ڈیڑھ سو پجاریوں نے بھی مذہب اسلام کو گلے لگانے کی دھمکی دے ڈالی۔ ضلع انتظامیہ میں ہنگامہ مچ گیا۔ پجاریوں نے الزام لگایا تھا کہ کلکٹر صاحب پوجا میں بے جا دخل دیتے ہیں۔ کلکٹر نے گنگا دشمی کے میلے میں جیوتر لنگ پر باہر سے لا کر بیل پتر چڑھانے پر پابندی لگا دی تھی۔ گربھ گریہہ میں بھی آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ بس پنڈے

پجاری دھرنا پر بیٹھ گئے۔ مندر کے ٹرسٹ کو پروانہ بھیجا کہ ہمارا استحصال ہوا تو اسلام دھرم قبول کر لینگے۔ اس کی نقل چیف منسٹر کو بھی بھیجی گئی۔ عوام نے بھی ساتھ دیا ضلع انتظامیہ کو پسینہ آ گیا۔ پجاریوں کو کسی طرح منایا گیا۔ کلکٹر صاحب نے بیان دیا کہ مندر کی صفائی کے لیئے یہ قدم اٹھایا گیا تھا۔

سبحان تیری قدرت......

ہریانہ کے مرچ پور، بھگانا میں اذان کی آواز گونجنے لگی۔ بھگوا برگیڈ ریسؔ سے رہ گیا.....مکمل دیش میں کلمہ کا ورد.....؟ ۱۸ اگست کو جب پارلیمنٹ میں بھارت چھوڑو آندولن کی سالگرہ منائی جا رہی تھی تو جنتر منتر پر ہریانہ کے دلت ہندو دھرم چھوڑو کی تحریک چلا رہے تھے۔ بھگانہ گاؤں کے سو سے زیادہ دلت گھروں میں اسلام کی روشنی پھیل چکی تھی۔ بھگوا بریگیڈ نے دلتوں پر قاتلانہ حملہ کیا۔ بھگوا رہنماؤں نے خاموش رہنے کی اپیل کی۔ سیّاں جی کے کوتوال ہونے کے بعد بھگوا ادارے گھر واپسی کی تحریک ملک گیر پیمانے پر چلا رہے تھے۔ پالیسی یہی تھی کہ کوتوال صاحب خاموش رہینگے اور ادارے اپنا کام کرتے رہینگے لیکن دھرم کے نام پر قتل و غارت شروع ہونے پر بدنامی کا ڈر تھا اور سیّاں جی کو زبان کھولنی پڑتی۔ مصلحت اسی میں تھی کہ انہیں پردے کے پیچھے سے سمجھاؤ۔

اصل میں بہت دن پہلے دلتوں کا گاؤں کے جاٹوں سے تصادم ہو گیا تھا۔ دلت گاؤں کے چوک پر تیوہار منانا چاہتے تھے لیکن جاٹوں کو یہ بات بری لگی کہ دلت چوک کو اپنے تصرّف میں لائیں۔ جاٹوں نے دلتوں کو بے رحمی سے پیٹا۔ کمشنر کے دفتر کے آگے دلت دھرنے پر بیٹھ گئے۔ کمشنر نے سب کو احاطے سے باہر نکلوا دیا کہ وہ بھی جاٹ تھا۔

کچھ دنوں بعد چار دلت لڑکیوں کا گینگ ریپ ہو گیا۔ تھانے میں کوئی سانحہ درج نہیں ہو سکا کہ تھانے دار بھی اونچی ذات والا تھا۔ دلتوں نے ہندو دھرم چھوڑو کی تحریک چلائی۔ جنتر منتر پر دھرنا دے کر بیٹھ گئے کہ انصاف کرو اور ایک ایک کر کے مسلمان ہونے لگے۔ امبیڈکر کی مثال دیتے تھے کہ وہ بھی اونچی ذات والوں سے تنگ آ کر ہندو دھرم چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے۔

جوگی بھگانہ کا رہنے والا تھا۔ وہاں کی مٹّی میں پل کر جوان ہوا تھا۔ اسکو اپنے گاؤں سے محبت تھی۔ دلتوں سے بھی اس کے تعلّقات خوشگوار تھے۔ وہ جب بھی گاؤں آتا پنچائت بلاتا اور لوگوں کے مسائل سنتا اور ان کے سدّباب کے لیئے مقامی افسروں سے ملتا۔ اس طرح وہ بھگانہ میں کافی مقبول تھا وہاں لوگوں کے ساتھ گھل مل کر رہنا اس کو ہمیشہ سہانا لگا تھا۔ کباڑیہ نے جوگی کو کچھ رضا کاروں کے ساتھ بھگانہ بھیجا کہ دلتوں کو سمجھا بجھا کر راہ راست پر لائے اور ان کی گھر واپسی کرائے۔

جوگی بھگانہ پہنچا تو حیران تھا.....

ستیشوا اب عبدل کلام ہو گیا تھا، دیپکو اعمر عبداللہ اور ریتو فاطمہ بن گئی تھی۔ ویریندر ان کی رہنمائی کر رہا تھا لیکن اس نے ابھی تک اپنا نام نہیں بدلا تھا۔

گاؤں میں قریب سو گھر دلتوں کے تھے۔ سب کے سب مسلمان ہو گئے تھے ویریندر دلتوں میں سب سے پڑھا لکھا تھا۔ اس نے بنارس ہندو یونورسٹی سے انگریزی میں ایم.اے. کیا تھا.

جوگی نے دلتوں کی پنچائت بلائی۔

دلت اپنی جماعت کے ساتھ پنچائت میں حاضر ہوئے۔ سب کے سب سفید کرتہ پائے جامہ میں تھے اور سر پر کرشیہ کی سفید ٹوپی تھی۔ ان کے لباس سے عطر کی بھینی بھینی خوشبو بھی آ رہی تھی۔ سب نے سلام کیا اور باری باری سے مصافحہ کیا۔ پہلے کی طرح کسی نے پاؤں چھو کر پرنام نہیں کیا تھا اور نہ کوئی ہاتھ جوڑ کر کھڑا تھا۔ ویریندر نے ایک ہاتھ سے مصافحہ کیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں پٹّی بندھی ہوئی تھی۔ جوگی نے ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاتھ میں کیا ہوا؟..

ویریندر مسکرایا:'' آپ لوگوں کی عنایت ہے حضور...

جماعت سے کسی نے سُر ملایا'' گاؤں کی مسجد بھی توڑی۔''

''دھرم کیوں بدلا؟''

''امبیڈکر نے بھی بدلا تھا سرکار...اور آپ جانتے ہیں کیوں بدلا تھا۔''

''لیکن تم نے اپنا نام نہیں بدلا......؟ یعنی تم ابھی بھی ہندو ہو۔ جوگی مسکرایا۔

ویریندر بھی مسکرایا:'' نام سے کیا ہوتا ہے جوگی جی.....اسلام تو سینے میں ہے۔''

''جزاک اللہ!'' دیپکو ابول اٹھا۔ ایک رضا کار نے اس کو چونک کر دیکھا

جوگی لا جواب ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا آگے کیا بات کرے۔ ویریندر نے خود بات نکالی۔

''ہم اب مسلمان ہیں۔ دلت نہیں رہے۔ ہم سیّدوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔''

''تم لوگ آرکشن کے لابھ سے بچِت ہو جاؤ گے۔ دوسری سہولتیں بھی نہیں ملیں گی بلکہ تم ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھے جاؤ گے۔''

''لابھ اور ھانی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس حال میں رکھے خوش ہیں۔''

''جزاک اللہ''۔ دیپک نے پھر ٹکڑہ لگایا

جوگی محسوس کیئے بغیر نہیں رہا کہ دلتوں میں غیر معمولی تبدیلی آئی ہے۔ سفید لباس میں وہ صاف ستھرے لگ رہے تھے۔ کسی کے چہرے پر خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔

''تم اگر گھر نہیں لوٹے تو تمہیں گاؤں میں گھسنے نہیں دیا جائے گا۔''

جوگی کے لہجے میں غصّہ تھا۔
ویریندر کا بھی لہجہ بدل گیا۔''دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے۔''
کسی نے نعرہ لگایا۔
''نعرۂ تکبیر''
''اللہ ہو اکبر۔''
دلت نعرہ لگاتے ہوئے پنچائت سے اٹھ گئے۔
جوگی بیٹھا رہ گیا....رضا کار غصّے سے کھول رہے تھے۔ جوگی بھی ذلّت محسوس کر رہا تھا....دلت جوتا لگا کر چلے گئے ۔ایک ہی راستہ تھا ۔ سب کا صفایہ.....!
ایک رضا کار بولا۔''سر.... مسجد کا امام سب کو کلمہ پڑھواتا ہے''
''امام کو اٹھا لیتے ہیں سر....سالے کو کٹی کٹی کر مسجد میں پھینک دینگے''
''ابھی ایسا کچھ نہیں کرنا ہے.جو کرنا ہے کباڑیہ جی سے پوچھ کر کرنا ہے۔''
''ان کے دل میں ڈر پیدہ کرنا ضروری ہے سر.یہ شیر بن کر گھوم رہے ہیں۔''
جوگی نے کباڑیہ کو فون لگایا.کباڑیہ کا مشورہ تھا کہ وہ پہلے امام کو سمجھانے کی کوشش کرے.
جوگی دوسرے دن امام سے ملنے اس کے گھر گیا
کنڈی کھٹکھٹائی.....ایک لڑکی نے دروازہ کھولا اور اوٹ میں ہو گئی.
جوگی نے اس کی جھلک دیکھی اور جیسے سکتے میں آ گیا لڑکی اندر گئی اور امام کو بھیجا۔
امام نے جوگی کو کمرے میں بٹھایا۔
''کیسے آنا ہوا جوگی جی.''امام نے پوچھا۔
جوگی نے کوئی جواب نہیں دیا۔وہ بت بنا بیٹھا تھا.
امام اندر گیا.گلاس میں پانی اور کٹوری میں مصری کی ڈلی لے کر آیا لیکن جوگی کمرے میں نہیں تھا.اس نے باہر نکل کر دیکھا۔جوگی کا کہیں پتہ نہیں تھا .امام کو حیرت ہوئی...کہاں گیا آخر....؟ کس لیئے آیا تھا؟ امام یہ سوچ کر خوف زدہ ہوا کہ جوگی کی آمد کسی خطرے کا پیش خیمہ تو نہیں؟
جوگی سیدھا اپنے گھر آیا تھا.اس کے سینے میں جیسے تلاطم سا برپا تھا....؟ سفید برّاق چہرہ....غلافی آنکھیں....یعقوت سے تراشے سرخ ہونٹ ....ایک غریب امام کے گھر میں دبّیہ روپ.....؟
جوگی کے دل میں درد کی لہر سی اٹھ رہی تھی۔رہ رہ کر ایک جانا پہچانہ خوف سر اٹھا رہا تھا کہ اتنی خوبصورت لڑکی کب تک بچے گی.....؟ کہیں رضا کاروں کی نظر نہ پڑ جائے؟ جوگی کو پہلی بار اپنے رضا کاروں سے خوف محسوس ہوا۔اس نے انہیں یہ کہہ کر ہریانہ واپس بھیج دیا کہ وہ امام سے بات کر رہا ہے .ان کی ضرورت پڑی تو بلا لے گا۔
جوگی نے ویریندر کو بلا بھیجا.
ویریندر آیا تو جوگی چپ تھا.سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا بات کرے۔اس کو چپ دیکھ کر ویریندر نے پوچھا۔
''سب خیر تو ہے جوگی جی۔''
''گاؤں میں کسی باہر کے آدمی کو تو نہیں دیکھا؟''
''آپ کے ہی رضا کار گھومتے رہتے ہیں۔''
''وہ تو واپس چلے گئے.لیکن اور کوئی نظر آئے تو بتانا!''
''کیا بات ہے جوگی جی۔؟''ویریندر نے پوچھا.
''تم خود جانتے ہو بات کیا ہے؟''
''ہماری مانگیں تو پوری کرا دیجیے؛''
''کیسی مانگیں؟''
''جاٹ لوگ ہمیں چوک پر آنے نہیں دیتے ہیں۔ ہماری لڑکیوں کا ریپ ہوا اور کوئی کاروائی نہیں ہوئی۔''
''کاروائی ہوگی لیکن ایک بات بتاؤ۔''
''کیا؟''
''امام کے گھر ایک لڑکی دیکھی۔کون ہو سکتی ہے؟''
''امام کی بہن ہے۔''
''بہن....؟ پہلے تو نہیں دیکھا۔''
''آپ کہاں سے دیکھیں گے۔آپ گاؤں میں تو رہتے نہیں ہیں اور لڑکیاں بھی باہر نہیں نکلتی ہیں۔''
''میں نے ایسا روپ کہیں نہیں دیکھا؛''
''آپ امام کے گھر گئے تھے کیا؟''
''ہاں!''جوگی نے اثبات میں سر ہلایا.
''اس سے کیا بات کی۔؟''
''کچھ نہیں ۔ میں نے لڑکی کی ایک جھلک دیکھی بس.....پھر میں جیسے ہوش کھو بیٹھا...میری زبان گنگ ہو گئی میں گھر آ گیا.
''آپ وہاں گئے تھے کیوں؟''
''میں گیا تھا امام کو دھمکی دینے....لیکن....!
''ایسا کیا دیکھا اس میں؟''
جوگی خاموش رہا۔
''پھر چلیں گے وہاں؟''
جوگی نے اثبات میں سر ہلایا۔
ویریندر جوگی کو لے کر امام کے گھر آیا.کنڈی کھٹکھٹائی۔جوگی سوچ رہا تھا کہ اگر لڑکی نے دروازہ کھولا تو اس کی ایک جھلک دیکھنے میں کامیاب ہوگا لیکن

دروازہ امام نے کھولا اور جوگی کو دیکھ کر حیران ہوا۔

''اس دن آپ کہاں غائب ہو گئے تھے۔؟'' امام نے پوچھا۔

جوگی خاموش رہا

.امام انہیں لے کر کمرے میں آیا۔

''جوگی جی....آپ امام صاحب کو پہچان رہے ہیں؟''

''فضل الدّین۔''

''ارے واہ.....نام بھی یاد ہے۔''

''کیسے بھول سکتا ہوں؟ بچپن میں ہم کبڈّی کھیلا کرتے تھے۔''

''لیکن اب گاؤں میں وہ ماحول نہیں ہے۔اب سب ایک دوسرے کے دشمن ہیں''

اندر سے مناجات پڑھنے کی آواز آنے لگی۔

تیری ذات ہے سروری اکبری

میری بار کیوں دیر اتنی کری

جوگی پر جیسے وجد سا طاری ہونے لگا....

''یہ کس کی آواز ہے؟'' جوگی نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میری بہن مناجات پڑھ رہی ہے۔''

جوگی جیسے سحر میں مبتلا ہو رہا تھا۔مناجات کا ایک ایک لفظ اس کی روح میں اتر رہا تھا.....اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں....کھل رہی تھیں.....

مناجات کی قرائت رکی تو جوگی برجستہ بول اٹھا۔

''بہت اچھا لگ رہا تھا سننے میں...''

امام مسکرایا۔

''کیا اسے ریکارڈ کر سکتا ہوں۔؟''

''ہمارے یہاں لڑکیوں کی آوازیں اس طرح ریکارڈ نہیں کی جاتیں جوگی جی''

جوگی کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔اس کو محسوس ہوا جیسے بھری محفل سے اٹھوا دیا گیا ہو۔

''یہ بڑی بات ہے کہ آپ کو مناجات کے بول نے متاثر کیا'' امام مسکرایا۔

جوگی خاموش رہا۔

''آپ کی کیفیت دیکھ کر مجھے سورہ اعراف کی ایک آئت یاد آ رہی ہے'' امام جوگی سے مخاطب ہوا.

''وہ کیا؟'' ویریندر نے پوچھا

امام نے قران مجید کے اوراق پلٹے اور آیت کا اردو ترجمہ پڑھ کر سنایا۔

''اے نبی! لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جب کہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا'' کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟'' انہوں نے کہا'' ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں۔ہم اس پر گواہی دیتے ہیں'' یہ ہم نے اس لیئے کہا کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ'' ہم تو اس بات سے بے خبر تھے'' یا یہ نہ کہنے لگو کہ'' شرک کی ابتدا تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم بعد کو ان کی نسل سے پیدا ہوئے۔پھر کیا آپ ہمیں اس قصور میں پکڑتے ہیں جو غلط کار لوگوں نے کیا تھا'' دیکھو اس طرح ہم نشانیاں واضح طور پر پیش کرتے ہیں اور اس لیئے کرتے ہیں کہ لوگ پلٹ آئیں۔

''مطلب بھی سمجھائیے امام صاحب۔'' جوگی نے پوچھا

مطلب یہ کہ ہم آپ سب جو ابھی تک پیدا ہوئے اور آگے جو قیامت تک پیدا ہونگے یعنی پوری نسل انسانی کو اللہ تعالیٰ نے بیک وقت وجود اور شعور بخش کر اپنے سامنے حاضر کیا اور ان سے اپنی ربوبیت کی شہادت لی۔یعنی قرآن مجید یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ اللہ کی ربوبیت کا احساس انسانی فطرت میں پیوست ہے.

جوگی بہت غور سے امام کی باتیں سن رہا تھا.

امام نے مسکراتے ہوئے کہا۔'' مناجات کے بول جوگی کی روح کے اس مرکز کو چھو گئے جو ربوبیت کے اقرار کا مرکز ہے۔اس لیئے جوگی وجد میں آ گئے۔''

''سبحان اللہ!'' ویریندر برجستہ بول اٹھا.

کچھ دیر خاموشی رہی۔پھر امام نے جوگی سے پوچھا۔

''آپ یہاں آئے تھے کس لیئے؟''

''اب کیا بتاؤں امام صاحب کس لیئے آیا تھا؟'' جوگی نے ایسے لہجے میں جواب دیا جیسے اپنی آمد پر شرمندہ ہو.

''امام مسکرایا۔'' آپ شائد ان کی گھر واپسی کرانا چاہتے ہیں لیکن یہ تو اپنے گھر آ چکے۔انہیں ربوبیت کا احساس ہو گیا۔یہ اب قیامت کے دن اپنے رب کو منھ دکھا سکتے ہیں کہ میں نے شرک نہیں کی اور ایک رب کو رب جانا۔''

جوگی نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''ایک درخواست ہے۔'' جوگی بہت عاجزی سے بولا

''کیا...؟'' امام نے حیرت سے پوچھا

''مناجات تو سنا اب اس ہستی کو بھی دیکھ لیتا جس کی آواز میں اتنا اثر ہے۔''

''زرا بلوائیے...جوگی جی سے کیا پردہ؟ یہ تو بچپن کے دوست ہیں۔'' ویریندر بولا۔

امام نے لڑکی کو بلایا.

لڑکی شرمائی شرمائی سی اندر داخل ہوئی جھک کر آداب کہا اور امام کے قریب کھڑی ہو گئی وہ سفید لباس میں تھی۔

جوگی دیکھتا رہ گیا.....

''یہ جوگی جی ہیں۔اسی گاؤں کے۔۔۔ہمارے بچپن کے ساتھی۔
زراان کے لیئے چائے بنا کرلاؤ۔''لڑکی مسکراتی ہوئی اندر چلی گئی۔
لڑکی چائے لے کرآئی تو جوگی کی نگاہیں نیچی تھیں۔وہ خاموشی سے
چائے پیتا رہا.ایسا لگتا تھااس نے کوئی اہم فیصلہ کرلیا ہےاوراب پرسکون ہے.
چائے پی کروہ باہرآئے۔
ویریندر جوگی کوچھوڑنے اس کے گھر تک گیا.
''کچھ دیر بیٹھونہ۔۔۔؟''جوگی نے بہت ملتجانہ لہجے میں کہا.
جوگی اسے اپنے بیڈروم میں لے کرآیا.
''دیکھ رہا ہوں آپ کچھ پریشان ہیں۔''
''ویریندر......
ویریندرنے اسے غور سے دیکھا۔جوگی کی آنکھیں نمناک تھیں۔
''میں کیا سوچ کرآیا تھااورکیا ہوگیا''
''خدا جو کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے۔آپ گاؤں میں رہیے.اپنے
کھیت کھلیان دیکھیئے...گاؤں میں اسکول کھول دیجیے....سماج سیوا کیجیئے۔۔۔آپ
کوکمی کس بات کی ہے جوگی جی۔
''مجھے جوگی مت کہو ویرو....میں ایک ظالم انسان ہوں میں نے
بہت ہنسا کی ہے۔''
''امام صاحب سے ملتے رہیے،آپ کوسکون ملے گا''
ویریندر کے جانے کے بعد کمرے میں اچانک سناٹا پھیل گیا۔جوگی
خودکو بہت اکیلامحسوس کرنے لگا...لڑکی کی صورت نگاہوں میں گھوم گئی....سینے میں
ٹیس سی اٹھی...تکیئے کوسینے پررکھ کرزور سے دبایا۔
''ہے ایشور....کہاں جاؤں....؟ ریت کے کن سے زیادہ میرے
دکھ ہو گئے....میرے جینے کا مقصد کیا رہ گیا...؟ ااب تک ہنسا میں زندگی
گذری...آج کس دوراہے پرتو نے مجھے لاکرکھڑا کر دیا....مجھے شانتی چاہیے
پربھو...شانتی....
جوگی کی بے چینی ہر پل بڑھتی جارہی تھی.آخراس نے پھرفون کرکے
ویریندرکو بلایا۔
''ویریندر...میں ساری زندگی نفرت کی سیاست کرتا رہا..لیکن آج
محبت میں گرفتار ہو گیا ہوں....مجھے ایک پل چین نہیں ہے ویرو....میں کہاں
جاؤں....وہ موہنی صورت....وہ دیبیہ روپ....اسے بھول نہیں سکتا۔''
''امام صاحب کواپنی کیفیت بتادیجیے...شائدکوئی راستہ نکلے۔''
دونوں پھرامام کے گھر پہنچے۔امام پھرحیران ہوا۔
''زہےنصیب......میری چوکھٹ گلزارہورہی ہے۔''
امام صاحب....یہ سکون قلب کھوبیٹھے ہیں...کلمہ پڑھنا چاہتے ہیں۔''
''جزاک اللہ....یہ اللہ کی تلواربن کرآئے ہیں.یہ سیف اللہ ہیں''

''مرحبہ...کیا نام رکھا ہے......اللہ کی تلوار....جو ہمیشہ انصاف کرتی
ہے...آج تو ہمارے ہاتھ مضبوط ہو گئے۔''ویریندر کی آنکھیں خوشی سے چمک
رہی تھیں۔
جوگی اپنے آپ کو پرسکون محسوس کررہا تھا لڑکی پردے کے پیچھے سے
جھانک رہی تھی۔اندرگئی اور
مصری اور پانی لے کرآئی۔
مبارک....آپ کو نیا نام مبارک۔....!''
جوگی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ لڑکی کوکیا جواب دے۔
جوگی کا موبائل بج اٹھا.
فون کباڑیہ کا تھا.
ہیلو....جوگی۔۔۔۔؟ گھرواپسی کا کیا ہوا۔۔؟
''میں سیف اللہ بول رہا ہوں.میری گھرواپسی ہو چکی۔''
سیف اللہ نے سلسلہ منقطع کردیا.

- بقیہ -

## ''کُتے بلیوں کے پیچھے آتے ہیں''

مسلک کے پیروکاروں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا
ہے۔مگراخبار میں نادیدہ ہاتھ اورآنکھیں صرف یہی خبرآنے دیتی ہیں کہ
میلا دمناتے نوجوان کسی بات پر مشتعل ہوکردنگے فساد پہ اُترآئے اور
آگ لگادی۔اِس آگ میں اتنے لوگ جاں بحق اوراملاق کونقصان !با
قی سب گول۔۔۔
اَب جب کہ میں آپ کو یہ حال سنانے کی کوشش میں ہلکان اور
مصروف ہوں تواچانک میرے صحن میں دوبلیوں کے کودنے اور پھراُن
کے غرانے کی آواز آنے لگی ہے۔اِس رات کے سناٹے میں جب میں
اکیلی بیٹھی اپنی فائل،قلم کاغذ کے ساتھ تنہا،اس تاریکی میں بلیوں کے غُرا
نے اوررونے کی آواز کتنی بھیانک لگ رہی ہے!یوں لگ رہا ہے کہ یہ
پورا محلّہ آسیبی گھر میں بدل چکا ہے۔معاً میں سوچتی ہوں کہ ہماری
مسجدیں بھی آسیبی گھر بنادی گئی ہیں۔۔۔بےتکی سی سوچ!
گھر،آبادگھر کیسے آسیبی گھر بن جاتے ہیں؟!
آسیبی گھروں میں بلیوں کی آمدورفت بڑھ جاتی ہے!بلیاں
راج کرنے لگتی ہیں!اِک یاسیت،منحوسیت اورغلاضت پھیل جاتی ہے ہر
طرف!
اچانک گلی میں بلیوں کے غرانے کی آواز پرکُتے زورزور سے بھو
نکنے لگتے ہیں!ایسا تو ہوتا ہے جب بلیاں بڑھ جائیں توکتے پیچھے آتے ہیں!

# ''کُتے بلیوں کے پیچھے آتے ہیں''

سیمیں کرن
(فیصل آباد)

میرے گھر سے کچھ فاصلے پر بَس دو گھر چھوڑ کر یہ گھر آباد ہے، جا نے اِسے آباد کہنا بھی مناسب ہوگا یا نہیں، کچھ تو ہے اس میں، جو اس کے پاس سے گزرتے، آتے جاتے میرے تجسس کو آواز دیتا ہے۔ اُکھڑا ہوا ملگجا پینٹ جس میں وقت کی بہت سی خراشیں، لمبی ٹیڑھی میڑھی لکیروں کی صورت میں کھینچی گئی ہیں۔ یوں جیسے کِسی چہرے پر بہت سی جھریاں پڑی ہوں۔ نیلا پینٹ، کیا مضبوط لوہے کا دروازہ جس پر لوہے کا جالی دار ڈیزائن بنا ہُوا ہے۔ دروازے والی دیوار یا پھریوں کہئے وہ بیرونی دیوار میں دروازہ نصب ہے، اونچی اور بلند ہے جو گھر میں جھانکنے کی اجازت نہیں دیتی اسی دیوار میں دروازے سے ذرا پرے دیوار کی جڑ میں لگا گل چین کا درخت باہر سے گھر کا مزید گھیراؤ کرتا ہے یا پھر پردہ داری کرتا ہے۔ یہ درخت زندگی کی علامت پھر بھی نہیں جگاتا بلکہ ماحول کے اسرار میں اضافہ کرتا ہے! اسی دیوار میں ذرا آگے جا کر درخت کی شاخوں سے ڈھکا لکڑی کا بوسیدہ سفید پینٹ کیا دروازہ ہے جس کی حالت خستہ ہے دروازے سے اوپر سیمنٹ کی بنی جالیاں ہیں۔ اسی طرح کی سیمنٹ کی پینٹ اکھڑی جالیاں دیوار سے اوپر اور درخت کے عقب میں رہائشی عمارت کی بھی نظر آتی ہیں جو غالباً کمروں کے روشندان ہوں گے۔ ان پرانی طرز کے روشندانوں اور گھر کی حالت سے خستگی اور بوسیدگی ایسے ٹپکتی ہے جیسے بارش میں چھت!

ان سیمنٹ کی جالیوں کے اوپر دھوپ اور بارش سے بچنے کو سیمنٹ کے دو فٹ چوڑے شیڈ تنے ہیں جو گندگی، مٹی دُھول، پرانے اُڑتے شاپرز اور پتوں سے اٹے ہیں۔ بلیوں کی غلاظت بھی اندر ہی گڈمڈ ہے۔ جی ہاں! بلیاں اس گھر میں باہر سے جو واحد زندگی کی علامت نظر آتی ہیں وہ ہیں بلیاں، بہت سی بلیاں! اس گھر کے اردگرد دیواروں، شیڈز اور درخت پر بہت سی بلیاں نظر آتی ہیں۔ مختلف رنگ، بھوری، گرے، سفید، سیاہ بلیاں ان کے انداز میں اِک عجیب شانِ بے نیازی ہوتی ہے۔ وہ آپ کے پاس جانے سے ڈرتی نہیں ہیں، بے نیازی اور اِک تمکنت بھرے غرور سے منہ پھیر لیتی ہیں۔ یوں جیسے اِس گھر میں اصل مالک وہی ہوں!

گھر کے باہر نیلے لوہے کے دروازے کے آگے بلیوں کے دودھ پینے کو مٹی کے چھوٹے پیالے دھرے ہیں۔ دروازے کے آگے کھلا گٹر کا ڈھکن اِتنا بھرا ہُوا ہے اور گھر کی دہلیز اتنی نیچی ہے کہ شاید بلیوں کے علاوہ کوئی اور جانا گوارا بھی نہ کرے۔

یہی مٹی کے پیالے سفید دروازے کے آگے جو شاید کبھی بیٹھک کا رہا ہوگا اور اب وہاں قفل دھرا ہے اور دہلیز پہ بھی یہی پیالے دھرے ہیں! یہ پیالے آپ کو دیوار پر بھی نظر آئیں گے۔ گویا اِس مکان کے مکینوں کو اور کسی بات کی فکر ہو یا نہ ہو، اِن بلیوں کے قیام وطعام سے علاقہ ضرور ہے۔

میں جب بھی اس گھر کے قریب سے گزرتی ہوں، یہ آسیبی گھر میرے تجسس کو آواز دیتا ہے اور میرا کیا ہے۔ میں تو اِک متجسس روح ہوں، شاید زندگی کو میں نے جن اخلاقی قدروں اور اپنے زاویوں سے دیکھ کر جو تجربے کئے، اُن تجربوں نے ثابت کیا کہ میں اِک ناکام انسان ہوں مگر شاید یہ بقا کی شدید آرزو ہے کہ ناکامی کے باوجود میرے تجسس کو موت نہیں آتی، یہ بالکل اُس بچے جیسا ہے جو لوک کہانیوں میں پیٹ کا ڈھکن کھول کر سب کھایا پیا جان لیا کرتا تھا۔ اسی طرح میری متجسس آنکھ بھی آرزومند ہے کہ میں ذہنوں کے ڈھکن کھولوں، آسیبی گھروں کے دروازے پہ دستک دوں اور جان لوں کہ لوگ کیسے زندگی کیا کرتے ہیں؟! کون لوگ، کن اصولوں کے ساتھ کامیاب ٹھہرتے ہیں اور وہ کونسی کہانیاں ہوتی ہیں جو آسیبی گھروں کو جنم دیتی ہیں!

اِس گھر میں کبھی کبھار میں نے اِک ادھیڑ عمر عورت کو دیکھا کبھی داخل ہوتے ہوئے اور کبھی باہر نکلتے ہوئے۔ بات سلام دُعا سے کبھی زیادہ آگے نہیں بڑھ سکی، وجہ یہ ہے کہ متجسس آنکھ باطنی مشاہدے کی عادی ہے، گفتگو کرنے کے لئے مجھے صرف کیفیت ہی مجبور کرسکتی ہے۔ ورنہ میری زبان پہ تالے پڑے رہتے ہیں، شاید کوئی آسیبی گھر میرے اندر بھی ''آباد'' ہے۔

اِک دن میں اپنی بیٹی کے ساتھ اس کے گھر کے پاس سے گزری تو وہ دروازے میں کھڑی تھی۔ میں دور سے دیکھ کر خیر مقدمی انداز میں مسکرائی مگر اس کی نظروں میں اِک عجیب وحشت، افسردگی اور کچھ حواس باختگی تھی جو اجنبیت میں ڈھل رہی تھی۔ میں نے غور کیا تو اچھی خاصی خوبصورت رہی ہوگی۔ اپنے حال سے قطعی بے نیاز ملگجی حالت، مگر رنگت کی سرخی سفیدی اور تیکھے نقوش حال گزشتہ کی خبر دیتے تھے۔ میں نے مسکراہٹ کو چہرے سے جدا نہیں ہونے دیا کیونکہ اس سے متعلق کہانیوں کی سُن گُن تھی مجھے اور میرے پاس فی الحال اسے دینے کو اِس پُر خلوص مسکراہٹ کے کچھ بھی نہیں تھا اور شاید یہ خاموش زبان اتنا اثر کر گئی تھی کہ اس نے مجھے بغیر کسی سلام دُعا کے پوچھا: ''کیا آپ نے ایک گرے اور براؤن بلی دیکھی ہے؟'' یہ سوال اِک جھٹکا تو تھا مگر میں نے اس کو اپنے چہرے پہ آنے نہیں دیا اور سوال کے جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا:

''کیا یہ سب بلیاں آپ کی ہیں؟'' وہ اپنے اردگرد اچھلتی کودتی بلیوں کے منہ میں محبت سے خوراک کے نوالے ڈالتی ہوئی بولی:

''کہہ سکتی ہیں فی الحال تو یہی میری ہیں'' عجیب سا جملہ تھا، جس میں پاگل پن اور بے نیازی بھی تھی اور یہ نظریہ ضرورت کی دانش مندی تھی!

اسی اثنا میں دو بلیاں دھڑلے سے اس کیہ گود میں چڑھ گئیں، وہ ان پر ایس ممتا لُٹا رہی تھی جیسے اولاد پر! میں نے تسلی دی: ''بے فکر رہیے! بلیاں دور بھی نکل جائیں تو واپس آجاتی ہیں''۔ اس نے جواباً کہا: ''دُعا کیجئے گا کہ وہ واپس آجائیں''۔ میں نے اِک بار پھر تسلی دی ''وہ آجائے گی پریشان مت ہوں'' اس کے بعد اس کی مجھ میں دلچسپی ختم ہوگئی اور ہم دونوں آگے بڑھ گئے!

اَب میرے تجسس نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اپنی ملازمہ سے پوچھوں۔، وہ اس خاتون کے گھر بھی صفائی کرتی تھی، میرے استفسار پہ اُس نے جواب دیا: ''اے باجی! قسمیں اللہ دی مینوں تاں اوپا گل لگدی اے، ماواں تیاں رہندیاں، ماں پریشان، باجی ایہدی طلاق ہوگئی سی، ایہدی ماں کہندی اے، اودوں دا ایہدا دماغ اُلٹ گیا اے، پر باجی کِسے نوں کجھ نہیں ک، ہندی، بس بلیاں دے پچھے پچھے رہندی اے''۔

میرے بیٹے نے لقمہ دیا: ''مما! آپ نے دیکھا نہیں بلیاں کتنی زیادہ بڑھ گئی ہیں، دور دور سے ادھر آتی ہیں، ان کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے''۔

میں نے دِل میں سوچا کہ واقعی بلیاں تو بہت بڑھ گئیں ہیں رات کو دیواق روں پہ روتی ہیں، لان گندا کر دیتی ہیں، چھت کے کمرے کھلے رہ جائیں تو وہاں گندگی پھیلا دیتی ہیں! یہ بلیوں کی زیادتی اس محلے کو اِک بڑے آسیبی گھر میں بدل رہی ہے!

اس گھر کے سامنے بالکل ترچھے رُخ پہ مسجد ہے، مدنی مسجد کہلاتی ہے! یوں تو محلے کے کثیر لوگ یہاں پنج وقتہ نماز اور جمعہ کی نماز ادا کرتے ہیں مگر اس کی شہرت کچھ اچھی نہیں۔ یہاں ایسے افراد کا کثرت سے آنا جانا ہے جو متشدد کارروائیوں میں ملوث پائے جاتے ہیں۔ یہاں کا امام مسجد کئی بار فرقہ وارانہ بیانات اور تقاریر کرنے پہ گرفتار ہو چکا ہے۔ مگر کچھ آسیبی ہاتھ ہیں اس کے پسِ پُشت کہ وہ چند دِن بعد پھر دندناتا پھرتا ہے، ماتھے پہ محراب کا گہرا سیاہ پڑتا نشان، گہرا سانولا رنگ گندھوں تک آتے پٹے، پان سے لال دانت، آنکھ میں سرخ ڈورے، فربہ جسم کچھ لوگ بھی افواہ اُڑاتے ہیں کہ وہ پینے پلانے کا شغل بھی رکھتا ہے مگر اس بات کا کوئی بین ثبوت نہیں ہے۔ بظاہر اس پر متشدد اور فرقہ ورانہ تقاریر کے علاوہ کوئی الزام ثابت نہیں مگر اس کی ظاہری ہیبت کچھ ایسی تھی کہ اُس سے اِک خوف سا ضرور محسوس ہوتا ہے!

اُس کی اس ''شہرت'' کے باعث ایسے بہت سے لوگوں کا اُس کے پاس آنا جانا ہے جو اِس فرقہ واریت میں ایندھن کا کام کرتے ہیں! اور اسی وجہ سے وہ سعودی حکومت کی ناپسندیدہ شخصیات کی لسٹ میں ہے۔ اس مسجد میں جہاں نمازیوں میں اللہ کے آگے گڑگڑانے والوں کی کوئی کمی نہیں وہیں ایسے بھی بہت سے لوگ آتے ہیں جن کو نماز سے کوئی علاقہ نہیں، ہاں جس وقت آئے اس وقت کی ادا کر لی، مگر وہ ایسے خفیہ پروگرامز میں شد و مد اور کارِ ثواب سمجھ کر حصہ لیتے ہیں جو دوسرے فرقے کے خلاف اور اسے کافر و حرف غلط ثابت کرتے ہوں، اُن کے نزدیک یہی دینداری ٹھہرتی ہے اور خود کو سچا ثابت کرنے کے لئے نفرت کی بڑی بڑی تاویلیں و دلیلیں سب کے پاس ہیں۔ یہ سمجھے بغیر کہ محبت کی ایک دلیل سب کو کاٹ سکتی ہے!

یہاں میلاد شریف کے دِنوں میں اونچی اُونچی بےسُری آوازوں میں عجیب و غیریب خلقت کے لوگ لاؤڈ سپیکروں میں اپنی جانب سے کلام پڑھتے ہیں جسے وہ نعت سمجھتے ہیں!

''گج وج کے میلا د منا نا اے
کوئی سڑدا اے تے سڑیا کرے''

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس آسیبی گھر اور اس مسجد کے بالکل سامنے چھوٹی سڑک کراس کر کے دوسرے مسلک کی مسجد ہے، نہ صرف مسجد بلکہ ملحقہ مدرسہ بھی ہے، مسلکی سیاست یہاں پر بھی عروج پہ ہے بلکہ مدرسہ کے بارے میں بھی سُن رکھا ہے کہ اِک دوبار چھاپہ پڑ چکا ہے۔ مگر اس کے پیچھے جو آسیبی ہاتھ ہیں وہ بڑے مقدس دستانے پہن کر رکھتے ہیں!

اِن دونوں مقدس اورپ اک گھروں سے وابستہ یہ لوگ اکثر مسلک کو بنیاد بنا کر سر پھٹول کرتے رہتے ہیں۔ یہ تشدد اور قتل و غارت ربیع الاول میں بڑھ جاتی ہے۔ مدنی مسجد کے کارندے گھر گھر چندہ جمع کر کے، بجلی کے کنڈے واپڈا کی تاروں پہ لگا ساری گلی کو دلہن بنا دیتے ہیں اور جو لوگ اپنے گھروں کو آرائش سے خالی رکھتے ہیں یہ لونڈے بہاڑے اونچی آواز میں کہہ کر گزرتے ہیں: ''دیکھو یہ لعنتی کافر کا گھر ہے'' اور اسی شرارت میں دوسری مسجد جو اِن پُر بہار ایام میں اضافی بتیاں جو عام دِنوں میں بھی جلتی ہیں اُن کو بھی گُل کر دیتی ہے۔ یہ لوگ اس کے داہنے باہنے گھروں کو اس طرح سجاتے ہیں کہ مسجد کے دائیں بائیں بھی آرائشی جھنڈیاں اور لائٹیں آ گرتی ہیں جو فساد کا باعث بن جاتی ہیں! دونوں طرف لاؤڈ سپیکروں پہ اِک دوسرے کو ہدف بنا کر لگا لگا کر ایسی حدیثیں اور تفسیریں بیان کی جاتی ہیں جیسے ساس بہو آپسی جنگ میں طعنہ زنی کرتی ہیں!

اور ایک دفعہ تو حد ہی ہوگئی، مدنی مسجد کے مخالفین نے محلے کے پارک میں میلاد شریف سے پہلے اِک اجتماع کر ڈالا اور تمام مدعتوں اور مشرکین کو دوزخ کی وعید سُنائی اسی رات کوئی آسیبی ہاتھ اُس مسجد کے باہر لکھ گیا ''یہ کافروں کی مسجد ہے'' اس نے فسادات کی چنگاری پہ پٹرول ڈال دیا اور اس جھگڑے کے نتیجے میں چار افراد کی جان چلی گئی، چھ افراد زخمی ہوئے اور املاک کو نقصان پہنچا جس میں کئی لوگوں کے عمر بھر کا اثاثہ جل کر راکھ ہُوا۔ اخبارات میں دونوں طرف کے علما نے دھواں دار بیانات دیئے۔ آل علما مفاہمتی کونسل نے دونوں فریقین کو مفاہمت کا درس دیا۔ اُس وقت کے بعد سے اِک سرد جنگ کا عالم ہے جیسے امریکہ وروس میں تھا۔

فسادات اور جھگڑے اب بھی ہوتے ہیں مگر وہ براہِ راست نہیں ہوتے، بالواسطہ رستہ اختیار کرتے ہیں جو فریق بھی پہل کرتا ہے۔ وہ دوسرے

باقی صفحہ ۹۷ پر ملاحظہ کیجیے

# ہمیں دعاؤں میں یاد رکھیے

گلزار جاوید
(راولپنڈی)

''ہیلو''
''ہائے''
''ہاؤ آر یو''
''فائن''
''موسم کیسا ہے؟''
''نشیلا''
''تمہاری طرف''
''رسیلا''
''یہ گفتگو زیادہ بولڈ نہیں''
''سنائیے کیا حال ہے، آپ کی ہابیز کیا ہیں''
''یہ ایک دم بات کا رُخ کیوں موڑ دیا''
''آپ نے کہا اس لیئے''
''میرا مطلب یہ تھوڑی تھا''
''تو پھر اپنا مطلب بتادو''
''میں کوئی مطلبی ہوں''
''وہ تو میں بھی نہیں''
''اچھا تمہارا نام کیا ہے''
''میرا نام۔۔۔ایس کہہ لو''
''ایس کا مطلب''
''جو تم نکالو''
''مشکل کام ہے''
''کوشش میں کیا حرج ہے''
''اچھا تمہارا نام کیا ہے؟''
''میں۔۔۔مجھے۔۔۔آر کہہ لو''
''آر فار۔۔۔''
''اس کا مطلب بھی تمہیں خود ہی نکالنا ہوگا''
''بات مشکل سے آگے بڑھے گی''
''نہیں نہیں تم اپنی عمر بتا کے بات آگے بڑھاؤ''
''میری عمر۔۔۔اوں۔۔۔آں۔۔۔دیوانہ بنانے کی، اور تمہاری''
''میری۔۔۔دیوانہ بننے کی''
''او۔۔۔آئی سی۔۔۔کب سے ہے سلسلہ''
''بس ابھی تازہ تازہ شروع ہوا ہے''
''ویری فنی۔۔۔''
''تمہاری ہابیز کیا ہیں؟''
''میری ہابیز۔۔۔سب کچھ آج ہی پوچھ لو گے کل مرنے کا پروگرام ہے کیا؟''
''وہ تو آج ہی مر چکا ہوں، اب تو آخری رسوم باقی ہیں''
''نہیں بھئی نہیں۔۔۔اِٹس ٹو فاسٹ''
''تم بتادو کیسا چلا جائے''
''ابھی نہیں''
''پھر کب''
''پھر۔۔۔اوں۔۔۔آں۔۔۔کل''
''کل کیوں؟''
''کچھ نیا سوچیں گے، کچھ نیا کریں گے''
''ناٹ اے بیڈ آئیڈیا۔۔۔سی یو ٹو مارو''

☆

''بڑی دیر کردی آنے میں''
''انتظار کا مزہ اچھا نہیں تھا''
''تو یہ بات ہے''
''ہاں۔۔۔آں۔۔۔کہہ سکتے ہیں''
''سناؤ کچھ نیا کیا''
''ایز یوژول نہیں اور تم نے''
''میں نے۔۔۔اوں۔۔۔میں نے بہت کچھ سوچنے کی کوشش کی''
''صرف سوچنے کی''
''سمجھنے کی بھی''
''نتیجہ''
''صفر''
''وہاٹ اے فنی جوک''
''دِس از ناٹ جوک۔۔۔آئی ایم سیریس''
''سیریس مینز؟''
''سیرس مینز سیریس''
''یو آر اے ناٹی۔۔۔''

## ''چہار سُو''

''گاڈ پرامس میں سیریس ہوں''
''اتنی جلدی''
''ساری رات تمہارے سپنے آتے رہے''
''کیا دیکھا؟''
''ایک معصوم سا، بھولا بھالا سا سایہ میرے ساتھ ساتھ چلتا رہا''
''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ خیالی پلاؤ پکائے گئے''
''جب تک ون سائیڈ ڈ ہوگا تو خیالی ہی ہوگا نا''
''تمہاری ایکسپکٹیشن کیا ہیں؟''
''مسٹ بی پازیٹو''
''اتنا کانفیڈنس''
''کبھی کبھی ہوتا ہے''
''اگر جواب ایکسپکٹیشن کے خلاف ہوا''
''تو۔۔۔تو۔۔۔سمندر۔۔۔نہیں نہیں۔۔۔بہت دُور ہے دریا میں چھلانگ لگانی پڑے گی''
''ٹمپریچر دیکھا ہے''
''ہائے۔۔۔درد کے ماروں کو ان چیزوں کی خبر کہاں؟''
''سو رومانٹک''
''پھر۔۔۔''
''پھر کیا؟''
''کچھ کہونا''
''کیا کہوں؟''
''چلتی ہے کیا نو سے بارہ''
''اتنا چیپ بننا بھی ٹھیک نہیں''
''چلو پھر بتادو کتنا ٹھیک ہے''
''میرے خیال میں فی الحال گڈ بائے ٹھیک رہے گا، ٹیک کیئر، وِل میٹ ٹو مارو سیم ٹائم''

☆

''کل تو بھئی خوب جھنڈی کرائی''
''یہ ٹپوری لینگوئج کہاں سے سیکھی''
''دل والوں کو سب کچھ پہلے سے آتا ہے''
''سب کچھ کا مطلب؟''
''سب کچھ۔۔۔''
''اس کا مطلب ہے آج بات چیت کا موڈ نہیں''
''یہ تم نے کیسے اندازہ لگایا؟''
''بات چیت اس طرح ہوتی ہے''
''پھر کس طرح ہوتی ہے''
''موسم کی بات کرو، پھولوں کی بات کرو، خوشبو کی بات کرو، سُر سنگیت کی بات کرو، لیلیٰ مجنوں، سوہنی مہیوال، ہیر رانجھا، رومیو جیولٹ کی بات کرو''
''ہائے۔۔۔ظالم مار ڈالا''
''تمہیں ان میں کون پسند ہے؟''
''سارے کے سارے''
''پیشہ ور لگتے ہو''
''ہاں۔۔۔ہاں ٹھیک کہتی ہو وہ شعر نہیں سُنا تم نے''

کروں گا کیا جو محبت میں ہوگیا ناکام
مجھے تو کوئی کام بھی نہیں آتا

''اب تو تمہارے پیشہ ور ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہا''
''عاشق ہمیشہ مطعون ٹھہرائے گئے ہیں''
''مطلب؟''
''مطلب۔۔۔مطلب۔۔۔الزام''
''یہ الزام تو نہیں ہے''
''پھر کیا ہے؟''
''پھر۔۔۔پھر۔۔۔جو چاہے نام دے لو''
''اگر میں پیار کہوں''
''ڈائریکٹ''
''چلو۔۔۔پ۔ی۔ا۔ر۔۔۔کہہ لیتے ہیں''
''بات تو ایک ہی ہوئی نا''
''تمہارے خیال میں کتنی ہونی چاہئیں''
''کیا''
''باتیں اور کیا؟''
''شرم نہیں آتی''
''آتی ہے بھئی بہت زور سے آتی ہے''
''پھر یہ باتیں''

رنگ کی جب گفتگو ہونے لگی
آپ سے تم اور تم سے تُو ہونے لگی

''شاعر ہو گیا''
''بن جاؤں گا بلکہ بن چکا ہوں''
''اچھا کوی صاحب آپ شاعری کہو میں چلی''

☆

''آج ایک بات طے ہونی چاہیے ہم میں سے کوئی بات ادھوری چھوڑ کر نہیں جائے گا''

''یہ شرط کیوں؟''
''بھئی جلتی آگ کو درمیان میں چھوڑ جانا کہاں کا انصاف ہے''
''کون سی آگ''
''وہ جو دل میں لگی ہے، نہیں نہیں دماغ میں، جگر میں، پسلی میں، گھٹنے میں، کمر میں، کہاں کہاں بتلاؤں؟''
''تمہاری باتیں بہت مزے کی ہوتی ہیں''
''اور میں؟''
''تم۔۔۔شاید۔۔۔تم بھی''
''تو پھر ہو جائے''
''کیا؟''
''فلائنگ۔۔۔''
''بے شرم''
''بے شرمی کی کیا بات ہے؟''
''دوست ہو دوست ہی رہو''
''بھئی واہ واہ، کیا کہنے، قسم پیدا کرنے والے کی مزہ آ گیا ساری رات روئے، ایک نی مرا، مرا تو صبح چار بجے اُٹھ کر بھاگ گیا''
''مطلب''
''مطلب یہ کہ پوری رام کہانی ختم ہوئی اور آپ کو یہ نہیں پتہ چلا کہ سیتا عورت تھی یا مرد؟''
''فضول باتیں چھوڑ و آج جلدی جانا ہے''
''کیوں''
''کل بتلاؤ گی''

☆

''کل کاہے کی جلدی تھی تمہیں؟''
''میری برتھ ڈے تھی کل''
''باپ رے۔۔۔کل تمہاری برتھ ڈے تھی اور آج بتلا رہی ہو''
''ہاں جی۔۔۔''
''کوئی اپنوں سے ایسا سلوک بھی کرتا ہے؟''
''اپنے۔۔۔''
''ہاں جی اپنے۔۔۔''
''بڑی خوش فہمی ہے۔۔۔''
''آپ کی دعا چاہیے''
''پتا ہے میں نے کل تمہیں کیوں نہیں بتایا؟''
''میں انتریامی نہیں ہوں''
''اگر میں آپ جناب کو کل بتلا دیتی تو مفت کے نخرے کون اٹھاتا؟''
''ہائے۔۔۔''

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

''شاعری اچھی بولتے ہو''
''شاعری بولی نہیں پڑھی جاتی ہے''
''پڑھتے تو زبان سے ہی ہیں نا، بات تو ایک ہی ہوئی''
''جو مزاجِ یار میں آئے''
''یار کس کو کہہ رہے ہو؟''
''جناب میں نہیں شاعر نے کہا ہے''
''باتیں بنانا کوئی تم سے سیکھے''
''اور اُلو بنانا۔۔۔''

☆

''کل تم نے پھر ایگریمنٹ کی خلاف ورزی کی''
''کون سا ایگریمنٹ؟''
''بن بتائے جانے کا''
''محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے''
''اوئے میں مر جاواں۔۔۔تمہیں بھی شاعری آنے لگی، اس کا مطلب ہے تیر نشانے پر بیٹھ گیا''
''زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں''

مَے سے غرض نشاط کس رو سیاہ کو ہے
اک گونا بے خودی مجھے دن رات چاہیے

''مطلب بھی سمجھا دو''
''بہت سادہ، میری جان۔۔۔بہت سادہ۔۔۔شاعر کہتا ہے کہ میں شراب نشے کے لیے نہیں بے خود رہنے کے لیے پیتا ہوں''
''اور تم؟''
''میں جانثار رہنے کے لیے''
''باپ رے۔۔۔یہ تو جیولٹ کی اولاد لگتا ہے''

☆

''کبھی کبھی مجھے ڈر لگتا ہے، جس طرح تم درمیان میں ساتھ چھوڑ دیتی ہو خاص موقع پر ایسا ہو گیا تو کیا ہوگا؟''
''خاص موقع۔۔۔مطلب۔۔۔؟''

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

''یہ میؔر صاحب کون ہیں؟''

''شاعر''
''کہاں ہوتے ہیں؟''
''جہنم میں''
''یُو مِین نرکھ؟''
''یوآر رائٹ''
''بٹ وائی''
''اس لیے میری جان کہ دوزخ کی بھٹی کو گرم رکھنے کا ٹھیکہ اُردو شاعروں نے لیا ہوا ہے''
اب اس کا مطلب نہ پوچھ لینا۔۔۔!
''چلو خود ہی بتادو''

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

''اوئے۔۔۔ہیلو۔۔۔زمین پر ہی ہونا۔۔۔!''
''شاید اب نہ رہوں''
''پَر لگ گئے ہیں کیا؟''
''لگنے والے ہیں''
''مشکل باتیں کرتے ہو''
''تم سے ملنے کی پلاننگ کر رہا ہوں''
''وہ کیسے؟''
''ویزا اپلائی کیا ہے''
''نانانا۔۔۔ایسا ظلم مت ڈھانا۔۔۔میں منہ دکھانے کے لائق نہ رہوں گی''
''اس کے بِنا کوئی چارہ نہیں۔۔۔!''
''ہیلو۔۔۔یہ اچانک تمہیں کیا ہوگیا۔۔۔واپس آ جاؤ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا''
''پھر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں''
''صبر''
''کہنا آسان ہے۔۔۔!''

☆

''کل کی وعدہ خلافی کا کوئی جواب ہے تمہارے پاس؟''
''تم اتنے سینٹی مینٹل ہو جاتے ہو کہ خود پر قابو رکھنا مشکل ہو جاتا ہے، جانتے ہو! کل رات مجھ پر کیا گزری؟''
''ہاں''
''وہ کیسے۔۔۔؟''
''مجھ پر بھی وہی کچھ گزری ہے جو تم پر بیتی ہے''
''تو پھر کنٹرول کرونا''

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

''یہ غالب کون ہے؟''

پوچھتے ہیں کہ غالب کون ہے
تم ہی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

''میری ماں، جو مرزا غالب کو نہیں جانتا اسے پڑھا لکھا کہلانا تو کجا زندہ رہنے کا حق بھی نہیں، یہ عشق محبت وغیرہ سب اُسی کی دین ہے۔غالب ایک انسان کا نام نہیں ایک پورے دَور اور ادارے کا نام ہے، وہ اردو ادب کا ہومر، کیٹس، شیلے اور شیکسپیئر ہی نہیں بلکہ باوا آدم ہے، پتا ہے مشہور فلم ساز، ہدایت کار، اداکار راج کپور نے ایک بڑے سیٹھ کو اپنے دفتر سے صرف اس لیے نکال دیا تھا کہ وہ غالب کو نہیں جانتا تھا''
''سوری۔۔۔سوری۔۔۔سوری۔۔۔یاد آ گیا، گلزار والے مرزا غالب''
''شکر ہے خدا کا یہاں تک تو آئے، یہاں تک تو پہنچے''
''اور یہ تم نے ماں کس کو کہا تھا؟''
''تمہیں''
''میں تمہیں ماں لگتی ہوں''
''میرے بچوں کی''
''شٹ اَپ، جسٹ شٹ اَپ۔۔۔''
''میرا مطلب ہے ہونے والے بچوں کی''
''تم ایسے نہیں مانو گے۔۔۔!''

☆

''تو پھر۔۔۔پروگرام فائنل ہے''
''ایک بار پھر سوچ لو''
''پنجابی میں کہتے ہیں''
''سوچی پیا تے بندہ گیا''
''اگر کچھ ہو گیا تو۔۔۔؟''
''اس کے بارے بھی شاعر کہہ گیا ہے''

ارادے باندھتا ہوں توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے

☆

''دن تو تم نے بتلایا نہیں''
''کل کیسا رہے گا؟''
''اِٹس ٹو ارلی۔۔!''

''پھر تم بتاؤ۔۔۔''
''سوچ کر بتاؤ گی''
''آگے ہی بہت دیر ہو چکی ہے''
''وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔پھر بھی مائنڈ سیٹ کے لیے کچھ ٹائم تو چاہیے''
''کتنا۔۔۔''
''کل بتلاؤں گی''

☆

''پھر کیا فیصلہ کیا؟''
''تم اتنے ہری میں کیوں ہو؟''
''اومیم صاحب! کہیں میں غلط جگہ ٹوک تو نہیں کر رہا؟''
''اب ایسی بھی بات نہیں''
''ہمیں جلد کوئی فیصلہ کرنا ہوگا''
''ماما۔۔۔پاپا۔۔۔کو دیکھ کر ڈر لگتا ہے''
''کس بات سے؟''
''کچھ ہو گیا تو۔۔۔!''
''ارے یار۔۔۔! کچھ نہیں ہوگا تم ایک دفعہ ہمت تو کرو''
''میں جب بھی سریو کی شکل دیکھتی ہوں میرا من ڈولنے لگتا ہے''
''کی نا۔۔۔! عورتوں والی بات!''
''عورت ہوگی تمہاری ماں، تمہاری بہن''
''یار۔۔۔گالیاں تو نہ دو''
''تم بات ہی ایسی کرتے ہو''
''اچھا چلو سیریس ہو جاؤ''
''ایک موقع اور دو۔۔۔کل بتلاؤ گی''

☆

''تو پھر میں فائنل سمجھوں؟''
''ہوں۔۔۔''
''ہوں کا مطلب؟''
''ہاں۔۔۔اور کیا؟''
''تو پھر کل کیسا رہے گا؟''
''کل۔۔۔! کل نہیں۔۔۔ڈے آفٹر ٹومارو''
''اوکے۔۔۔ایز یو لائیک''
''تم خوش تو ہو نا۔۔۔''
''بہت زیادہ''
''ٹائم کیا ہوگا؟''
''سیم ٹائم۔۔۔شارپ''

''میں تمہیں پہچانوں گی کیسے؟''
''سفید ڈریس پر سرخ ٹاپ میں اکیلا نظر آؤں گا''
''جو میں نے کہا تھا اُس کا کیا بنا؟''
''ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔مجھے یاد ہے''
''مجھے بھی یاد ہے''
''گھڑی کی سوئیاں ملتے ہی ایک ساتھ دوڑ لگانی ہے''
''کچھ ہو گیا تو؟''
''ڈرو نہیں، وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا''
''محبت کے متوالے ہمیشہ انجام سے بے پروا ہو کر نیا باب رقم کرتے رہے ہیں''
''اوکے۔۔۔ٹیک کیئر۔۔۔ملتے ہیں کل''
''اپنی پہچان تو بتا دو''
''سفید ڈریس پر سُرخ ٹاپ''

☆

''آج کے دن بھی تمام ورکنگ ڈیز کی طرح بارڈر پر گہما گہمی نظر آ رہی ہے۔کچھ لوگ ہاتھ میں سفری کاغذات تھامے اپنا ہینڈ بیگ یا چھوٹا اٹیچی گھسیٹتے ہوئے کھڑکی کی جانب رواں ہیں۔کچھ قلیوں کے سروں اور پیٹھ پر لدے اپنے سامان کی نگرانی کرتے ہوئے اپنوں سے ملنے کی آس میں باچھوں کو خشک کرتے ہوئے آگے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔کسی کو فکر اگلے شہر، اگلے سفر کی ہے کسی کو اپنوں سے ملنے اور جذبات واحساس کے بے قابو ہونے کا ڈر ہے۔ایسے میں اچانک بارڈر کی دونوں جانب سے ایک نوجوان لڑکا اور نوجوان لڑکی سفید لباس پر سرخ ٹاپ پہنے ہوئے ایک دوسرے کی جانب ایس اور آر کی آواز لگاتے ہوئے سوگز کے نوگو ایریا میں ایک دوسرے کی جانب دیوانہ وار دوڑ پڑتے ہیں۔ دونوں طرف کے سرحدی محافظ اس غیر متوقع صورت حال سے کچھ دیر کے لیے تو بھونچکا ہو گئے پھر آناً فاناً دونوں طرف سے تیز گولیوں کی سنسناہٹ نے دونوجوان لاشے زمین پر ڈھیر کر دیے''

وہ لاشے ابھی تک بے حس وحرکت نہ ہوئے تھے۔دونوں کی پوری کوشش تھی کہ وہ اپنی مٹھی میں دبا سفید گلاب ایک دوسرے کو پیش کرسکیں جو تازہ خون کی لالی سے تھوڑا سرخ اور تھوڑا مٹیالا ہو گیا تھا۔

لاشے آہستہ آہستہ بے حس وحرکت ہو گئے ہیں مگر اُن کی مٹھی میں دبے گلاب تیز ہوا کی قوت سے ایک دوسرے کی جانب محوِ سفر ہیں اور فضا میں پیرزادہ قاسم سوزخوانی کر رہے ہیں۔

بلا سے یہ راہِ شوق میری نہ ہو سکی پر تمہاری خاطر
مثالِ نقشِ قدم بچھا ہوں، مجھے دعاؤں میں یاد رکھیے

☆

انشائیہ

# ادب دادطلب

## ایم رحمان

(دہلی، بھارت)

**مولوی** صاحب نے جیوں ہی نقادوں کے منچ پر قرآنی آیت کا حوالہ دیا کہ: ''انصاف کے ساتھ ٹھیک ٹھیک تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو۔'' (ق)
آستانۂ ادب میں منعقد سیمینار میں سکوت چھا گیا—

چوں کہ مولوی صاحب بھی ادبی دنیا میں خاصے معروف تھے— موٹی موٹی کتابیں ان کے پاس اس لیے آتی تھیں کہ وہ ایک باوقار دینی عالم کے ساتھ سچے محقق بھی تھے۔ ملک ہی کیا برصغیر میں ان کی منفرد شناخت تھی۔ اکثر کتابوں کو بھیجنے والے اپنی ذمہ داری ادا کر کے مطمئن ہو جاتے کہ ان کی تخلیق پر دیانت دارانہ رائے دی جائے گی—

سیمینار کا موضوع تھا— ''عصر حاضر میں ادب اور ادبی رویہ''— کئی معروف مقالہ نگار مدعو تھے۔ ایک اچھی خاصی بھیڑ دیکھنے کو مل رہی تھی۔ دن کے دس بجے پروگرام کا آغاز ہوا۔ یہاں مہمان خصوصی کے علاوہ بڑی ناک رکھنے والے نقاد بھی موجود تھے جو زندگی بھر دوسروں کی عمدہ تحریروں پر پڑھ بیٹا بسم اللہ کہہ کر کارآمد کتابوں کا پوسٹ مارٹم کرنا فرض عین سمجھتے تھے۔

بڑے پروفیسروں کی اپنی لابی تھی— جنہیں نظامت کی روایت کو برقرار رکھنے کے لیے بمبئی نگری سے بلایا گیا تھا— بلاشبہ ان میں کئی منجھے اناؤنسر بھی تھے، وہ ڈاکٹر تھے۔ ادب پر علاج کی جانکاری بھی تھی کہ ادب کب بیمار ہو جائے اور اس کے لیے ایمرجنسی نافذ ہو پھر وہ اپنی قابلیت کا مظاہرہ کرنے میں پیش پیش کہلانے کے لیے امام جانے جائیں— پھر تو انہوں نے پی ایچ ڈی کی ہے اور اس کا استعمال مشاعروں، سیمیناروں اور ادبی جلسوں میں کھلے عام کریں گے—

ایک پروفیسر صاحب کا نام پکارا گیا— جنہوں نے دوٹوک الفاظ میں کہا—

''ادب وہ ہے جو سماج کو زندگی کی راہ بتائے۔''

ایک دوسرے پروفیسر صاحب بھی اسٹیج پر موجود تھے۔ انہوں نے ٹوک دیا—

''ادب وہ ہے جو جاہلوں کو کتاب لکھنے پر اُکسائے اور نقاد کے لیے مواقع پیدا کرے۔'' اس طرح نقاد کی ادبی روٹیاں تندور سے سینکی ہوئی نکلتی ہیں۔ اس طرح کئی حضرات اپنی اپنی سوچ پر خود کو ذہنی طور پر خود کو داد دے رہے تھے۔

کسی نے پچھلی سیٹ سے آواز دی— مولوی صاحب 'ادبی رویہ' پر ایک مقالہ اور پڑھ ڈالیے۔ سنجیدگی سے پھر آیت دہرا کر ترجمہ دوبارہ پڑھا۔

''انصاف کے ساتھ ٹھیک ٹھیک تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو'' (ق)

ایک پروفیسر صاحب نے مولوی موصوف کی زبان پکڑنی چاہی تو وہ اُن سے اُلجھ پڑے۔

''میاں یہ آپ کی کتاب نہیں ہے، جسے جب چاہا کسی ادارہ کے مالی تعاون سے شائع کرا لیا اور دو چار ہم عصروں سے کتاب کے متعلق رائے لے کر نازاں ہو گئے—؟''

میاں! یہ قرآن کا فرمان ہے۔ اجلاس میں بیٹھے حقیقت پسند تلملا اٹھے۔

''مولوی صاحب! آپ اپنے موضوع پر قائم رہیں۔ دیکھتے ہیں کہ یہ ادب نما بے ادب لوگ کیسے اجلاس میں شر پھیلاتے ہیں۔''

شور وغل قدرے تھا تو پھر مولوی صاحب کا مقالہ شروع ہوا—

''ہر چیز اپنے سیاق وسباق میں دیکھی جاتی ہے۔ جب ایسا ہو تبھی اس کے متعلق صحیح رائے قائم ہوتی ہے اور فیصلہ درست ہوتا ہے۔ ہم ادب کو زندگی کے دوسرے معاملات سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ زندگی کو خانوں میں بانٹ کر دیکھنے کا رجحان مغرب کی پروردہ ہے جو سارے فساد کی جڑ ہے—

مختصراً یہ کہ ادبی تنقید کی تکمیل ایسی تنقید سے ہونی چاہیے جس کی بنیاد معین اخلاقی و دیانت داری کے زاویۂ نظر پر قائم ہو''—

یہ سننا تھا کہ نوجوان ڈاکٹروں کی سمجھدار ایک ٹیم نے 'مولوی صاحب! زندہ باد' کا نعرہ بلند کیا اور داد وتحسین کی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

مولوی صاحب نے فقرہ چست کیا— سچ اور جھوٹ کی کسوٹی پر بغیر پرکھے ہم بال کی کھال نکالنے کی حماقت نہیں کر سکتے ہیں؟ اس پر زوردار قہقہہ بلند ہوا جس سے انہیں مزید حوصلہ مل گیا۔

''اچھا کچھ اور سنتے جایئے— ادب کی عظمت محض ادبی معیار سے متعین نہیں کی جا سکتی۔ حالانکہ یہ بات بھی ذہن نشیں رکھنی چاہئے کہ اس بات کا تعین کہ 'کوئی چیز ادب ہے یا نہیں' صرف ادبی معیار ہی سے کیا جا سکتا ہے۔''

اخیر میں مولوی صاحب نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا—

''میاں! یہ میرے جملے کا کمال نہیں تھا بلکہ ایک سچے، ایماندار نقاد ٹی ایس ایلیوٹ (T.S. Elliot) کو پڑھ پڑھ کر جو بال میں نے سفید کیے ہیں اُسی کا فیض تھا۔ مجھے ہرگز شوق نہیں کہ میں نقاد جانا جاؤں—

میں تو مدرسے میں ہی خوش ہوں— آپ کے لیبل کا بھی محتاج نہیں—''

وہ اپنی کرسی پر آ بیٹھے۔ دیر تلک تالیاں بجتی رہیں۔ اب پتا نہیں یہ اُن کی حمایت میں تھیں یا مخالفت میں—!

# خوش باش شہزادہ

## (آسکروائلڈ)

ترجمہ: فیروز عالم

(امریکہ)

**آسکروائلڈ** (۱۸۵۶ء۔۱۹۰۰) آئرلینڈ میں پیدا ہوا تھا مگر اس نے زیادہ عمر لندن میں گذاری۔اپنی خوش لباسی اوراچھے اخلاق سے وہ جلد لندن کی اعلیٰ سوسائیٹی کا حصہ بن گیا شروع میں اس نے شاعری کی مگر جب اسکا پہلا ناول شائع ہوا تو وہ کچھ پہچانا جانے لگا مگر جب اس کے اسٹیج ڈرامے مقبول ہوئے تو وہ شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگا۔مگراسی دوران اس پر ایک سخت اخلاقی جرم کے سلسلے میں دوسال کی جیل ہوگئی جس کے بعد وہ سخت تنزلی کا شکار ہوااور آخرکار نہایت بدحالی اورغربت کے عالم میں پیرس میں انتقال کر گیا۔

☆

دارالحکومت کے مرکزی چوک میں ایک بہت اونچے مینار پر شہزادے کا مجسمہ نصب تھا۔اس ملک کی تاریخ میں اس کی حکومت کا دورسب سے سنہری دور تھا اسی لئے اسے یہ اعزاز بخشا گیا تھا۔اسکے جسم کے چاروں طرف سونے کی مہین اور باریک پتریوں کا جال بنا گیا تھا،اسکی آنکھوں میں زمرد کے ہیرے جڑے ہو ئے تھے حتیٰ کہ اسکی تلوار کے ہتھے پر بھی ایک بڑا سرخ یاقوت جگمگارہا تھا۔صبح وشام اس کے اطراف سے گذرنے والے نہ صرف اسکو یادکر کے دل ہی دل میں اس کو تہنیت کے ہار پہناتے تھے بلکہ اس مجسے کی خوبصورتی پر بھی وہ پھولے نہ سماتے تھے۔وہ یہ کہتے نہ تھکتے تھے کہ یہ اسی قابل تھا کہ اس پر کڑوڑوں روپے خرچ کر کے ایسا ہی لاجواب مجسمہ تعمیر کیا جاتا جس کو دیکھ کرآنکھیں خیرہ ہوجائیں۔مائیں اپنے ننھے بچوں کا ہاتھ تھامے جب اس کے پاس سے گذرتیں تو ان سے کہتیں تم بھی ایسے ہی بننے کی کوشش کرنا۔کوئی کہتا یہ کس قدرخوش لگتا ہے،اسکی آنکھوں کی چمک اوراسکے ہونٹوں کی دائمی مسکراہٹ بتاتی ہے کہ وہ کس قدرخوش اور مطمئین ہے۔

ایک رات ایک فاختہ جواپنے غول کے ساتھ گرم ممالک کی جانب پرواز کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گئی اس شہر سے گذری۔یہ ان پرندوں کا معمول تھا کہ سردیوں میں یہ جنوب کی طرف نقل مکانی کرتے تھے۔اس دفعہ بھی انکاارادہ مصر میں دریائے نیل کے کنارے لگے درختوں کے جھنڈ میں بسیرا کر نے کا تھا مگر یہ فاختہ ان سے بچھڑ گئی تھی اوراب رات ہونے والی تھی۔اس نے سوچا یہیں کہیں رات کو بسیرا کرلیا جائے اور دن کی روشنی میں پھر سے منزل کی جانب اڑان کی جائے۔اڑتے اڑتے وہ اسی شہر میں پہنچ گئی تھی۔اس نے بلندی سے شہر کا چکر لگایا اس کی نظر بھی اس مجسمہ پر پڑی۔اس کا دل اس مجسمہ کی خوبصورتی سے بہت متاثر ہوا۔اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسی مجسمہ کے پاس رات گذارے گی۔اس نے غوطہ لگایا اور مجسمے کے قدموں کے درمیان جو تھوڑی سی جگہ تھی اس میں پرسمیٹ کر بیٹھ گئی۔اسے محسوس ہوا کہ اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہوسکتی تھی۔یہاں تازہ ہوا تھی،ایک خوبصورت نظارہ تھا اوراچھی خاصی گرمائی تھی۔وہ اپنی قسمت پر ناز کرنے لگی۔اب رات ہوچکی تھی اس نے سونے کی تیاری کی اور ابھی اس نے اپنا سر پروں میں چھپایا ہی تھا کے پانی کا ایک قطرہ اس پر گرا۔اس نے سوچا،اف بارش پڑنے لگی،یہ جگہ تو بہت ہی غیر محفوظ ہے اور مجھے بارش سے نہیں بچاسکتی،ایسے قیمتی مجسمے اوراس شان وشوکت کا کیا فائدہ جو کسی کو بارش سے نہیں بچاسکے،مجھے یقیناً کسی چمنی کی تلاش کرنی چاہیے۔ابھی اس نے اڑنے کی تیاری کی ہی تھی کہ اس پر دوسرا اور تیسرا قطرہ گرا۔اس نے اوپر دیکھا،لیکن یہ کیا!! آسمان تو صاف تھا،مگر اسے نظر آیا کہ شہزادے کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں اور یہ بارش نہیں بالکہ اس کے آنسو تھے۔فاختہ حیران ہوگئی اس نے پوچھا تم کون ہو۔شہزادے نے کہا لوگ مجھے''خوش باش شہزادہ'' کہتے ہیں۔اگر تم خوش باش شہزادے ہو تو تم رو کیوں رہے ہو،تمہارے آنسوؤں نے تو مجھے بھگو دیا ہے۔شہزادے نے کہا''جب میں نوجوان تھا مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ آنسو کسے کہتے ہیں،میں ایک بڑے محل میں رہتا تھا جہاں غموں کا داخلہ منوع تھا۔میں پھولوں کلیوں اورشفاف نہروں والے باغوں میں گھومتا تھا اور سال کے آخیر پر مرمریں فرش اور ست رنگے فانوسوں کی جگمگاتی روشنیوں میں رقص کرتا تھا۔مجھے سب خوش نصیب اور''ہمیشہ خوش شہزادہ'' کہتے تھے۔مگراب میرے مرنے کے بعد مجھے شہر کے سب سے اونچے مینار پر کھڑا کر دیا گیا ہے جہاں سے میں سب کچھ دیکھ سکتا ہوں،وہ کچھ بھی جو میں محل میں رہتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔اب میں دیکھ سکتا ہوں کہ میرے شہر میں کس قدر دکھ،کس قدر کس مپرسی اور کس قدرافلاس ہے اور ایک طبقہ کس قدر اذیت میں زندگی گذاررہا ہے۔اوراگر چہ اس مجسمے میں نصب میرادل ایک سخت دھات،شاید فولاد سے بنایا گیا ہے مگر اسکی روح ویسی ہی نرم ہے جیسی اس وقت تھی جب میں زندہ تھا۔اب میں سوائے رونے کے کچھ نہیں کرسکتا''

شہزادہ بولتا چلا گیا''یہاں سے کچھ دور ایک گلی میں ایک شکستہ مکان ہے،اسکی ایک کھڑکی کھلی ہے اور میں اس سے دیکھ سکتا ہوں کہ چراغ کی مدھم روشنی میں ایک عورت بیٹھی ہے اس کا چہرہ اترا ہوا ہے،اسکی آنکھیں تھکن سے اپنی چمک کھو چکی ہیں۔اسکی انگلیاں سوئیوں کے ننھے ننھے زخموں سے سرخ ہیں کیونکہ وہ سلائی سے اپنا پیٹ بھرتی ہے۔وہ ایک زربفت کے لباس پر خوبصورت ستارے ٹانک رہی ہے جوملکہ کی خاص کنیز کے لئے ہے تاکہ کل کے شاہی محفل رقص میں وہ ملکہ کا ساتھ دے سکے۔اس نیم تاریک کمرے کے ایک کونے میں اسکا ننھا بچہ بخار میں مبتلا ہے اور کتنی دیر سے موسمی کا عرق مانگ رہا ہے مگر اس کے پاس اس کے لئے کوئی رقم نہیں۔اے میری پیاری فاختہ،ایک میری پیاری فاختہ کیا تو اپنی چونچ

سے یہ سرخ یاقوت جو میری تلوار میں جڑا ہے،نوچ کر اسے نہیں پہنچاسکتی۔میرے پیر تو سنگ مرمر اور گارے میں قید ہیں میں کچھ کرنے کے قابل نہیں۔'' یہ سن کر فاختہ کہنے لگی مگر مجھے تو اپنے ساتھیوں کے پاس جانا ہے جو یقیناً نیل کے گرم پانیوں کے اوپر ادھر ادھر پرواز کر رہے ہونگے، پھر وہ میرا انتظار بھی کر رہے ہونگے۔اس پر شہزادہ خوش آمدی لہجے میں بولا ننھی فاختہ کیا تو میرا یہ کام نہیں کریگی۔بس ایک رات کی بات ہے۔کیا تیرا دل اس عورت کے لئے نہیں دکھ رہا، پیاری فاختہ بس ایک کام، یہی کام'' فاختہ کہنے لگی مگر یہاں بہت سردی بھی ہے، میں یہاں سے جلد گرم علاقے کی طرف پرواز کر جانا چاہتی ہوں۔شہزادے نے پھر درخواست کی کیا تیرا دل اس ننھے بچے کی پیاس دیکھ کر بھی نہیں پسیجتا۔اب فاختہ کو بھی اس بچے پر ترس آیا کہنے لگی۔''اچھا،سردی تو ہے مگر ایک ہی رات کی بات ہے چلو میں تمہارا یہ کام کر دیتی ہوں'' یہ کہہ کر فاختہ نے اپنی چونچ سے یاقوت نکالا اور شہر کی جانب اڑ گئی۔وہ شہر کے سب سے بڑے کلیسا پر سے گذری جہاں ہر مینار پر سونے میں لپٹے فرشتوں کے مجسمے نصب تھے،اس کے بعد اسے موسیقی کی آواز اور روشنیوں نے چونکا دیا اس نے نیچے دیکھا، وہ شاہی محل پر پرواز کر رہی تھی جہاں رقص ہو رہا تھا۔پھر محل کی ایک بالکنی سے ایک نوجوان لڑکی نکلی اس کے ساتھ ایک سجیلا نوجوان بھی تھا۔وہ اپنے ساتھی سے کہنے لگی:

''میں نے کل کے گرینڈ بال کے لئے اپنے لباس پر ستارے ٹنک وائے ہیں، مگر یہ کمبخت سلائی کرنے والیاں بہت ہی کام چور اور کاہل ہوتی ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اسے تیار نہ کر سکے۔فاختہ نے یہ سن کر اپنا مہنہ موڑا اور پرواز میں مصروف رہی۔اس کے بعد وہ شہر کے درمیان دریا پر سے گذری جسکے پل پر جگہ جگہ نیلگوں روشنیاں بکھیرتے لیمپ استادہ تھے۔

آخر کار وہ شہر کے افلاس زدہ محلے کے اوپر آئی جہاں اسے وہ گھر نظر آ گیا وہ کھڑکی میں سے اندر داخل ہوئی، ماں تھکن سے چور ہو کر سو گئی تھی مگر بچہ بخار سے بچین تھا اسکا چہرہ تمتما رہا تھا۔فاختہ نے ہیرا ماں کے سلائی کے بقچے کے پاس رکھا پھر بچے کے چہرے کے قریب کافی دیر اپنے پر پھڑ پھڑائے، وہ جیسے اسے پنکھا جھل رہی تھی، بچے نے غفلت میں سوچا اوہ یہ کون ہے جو مجھے ٹھنڈی ہوا سے پنکھا جھل رہا ہے اور دوبارہ غفلت میں چلا گیا۔اس کے بعد فاختہ واپس آئی اور شہزادے کو اپنا حال سنایا۔پھر کہنے لگی مجھے حیرت ہے کہ اب بھی کافی سردی ہے مگر اس کام کے بعد مجھ میں عجب سی گرمائی آ گئی ہے۔شہزادے نے کہا اس لئے کہ تم نے ایک نیک کام کیا ہے۔ اچھے کام سے انسان کے اندر ایک خاص حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔

جب صبح ہوئی تو فاختہ نے دھوپ کا مزہ لوتا،اس نے شہر کی بھی خوب خوب تفریح کی، کبھی کلیسا کے چونچ دار میناروں پر بیٹھی، کبھی دریا کے پانی میں غوطے لگا لگا کر پروں کو جھٹکے دئے، جب سورج غروب ہونے لگا تو وہ واپس شہزادے کو الوداع کہنے پہنچی کیونکہ آج وہ مصر کی جانب پرواز کرنے والی تھی۔وہ شہزادے سے کہنے لگی'' کیا تمہارا مصر میں کچھ کام ہے یا تم اہل مصر کو کوئی پیغام دینا چاہتے ہو،اس لئے کہ میں اب روانہ ہونے ہی والی ہوں'' اس پر شہزادے نے کہا پیاری پیاری فاختہ کیا تم ایک رات اور نہیں ٹھہر سکتیں؟؟ میری پیاری چڑیا میری بات مان لو۔۔ایک رات اور، بس ایک رات'' وہ کہنے لگی'' مگر میرا مصر میں انتظار ہو رہا ہے۔میرے ساتھی بیقرار ہیں۔وہاں خوبصورت نظارے ہیں اور دریائے نیل کا گرم اور صحت بخش پانی۔۔!!'' ''مگر پیاری فاختہ بس ایک رات اور۔۔'' فاختہ دل کی نرم تھی، اس نے دیکھا کہ شہزادے کی آنکھیں نم تھیں، اس نے پوچھا مگر کیوں؟؟ شہزادہ کہنے لگا میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک بوسیدہ گھر کی دو چھتی میں ایک غریب نوجوان لڑکا بیٹھا کسی کتاب پر جھکا ہے مگر اس کے لیمپ کا تیل بس اب ختم ہی ہوا چاہتا ہے۔روشنی اس قدر مدھم ہے کہ اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے۔پھر سردی سے وہ بار بار جھر جھری لیتا ہے اس لئے کہ نہ تو اس گھر میں کوئی آتشدان ہے نہ ہی انکے پاس جلانے کی لکڑیاں، شہر کے ایک بڑے ادارے نے اسکا ناول شائع کرنے کا وعدہ کیا ہے مگر مجھے یقین ہے ان حالات میں وہ یہ ناول پورا کرنے سے پہلے ہی مر جائیگا۔'' یہ سن کر فاختہ بھی اداس ہو گئی وہ کہنے لگی اچھا، تو تم یہ چاہتے ہو کہ میں اسے بھی یاقوت دے آؤں'' اس پر شہزادہ کہنے لگا مگر میرے پاس دوسرا یاقوت نہیں ہے۔تم ایسا کرو میری آنکھ سے یہ زمرد نوچ کر اسے دے آؤ۔وہ اسے بیچ کر جلانے کی لکڑیاں اور لیمپ کا تیل لے آئیگا اور اپنا ناول مکمل کر لیگا'' اس پر فاختہ خود رونے لگی، نہیں نہیں میں ایسا نہیں کر سکتی۔شہزادہ ملول ہو کر کہنے لگا پیاری فاختہ ایسا ہی کرو، میں تمہاری خوشامد کرتا ہوں، ایسا ہی کرو۔فاختہ نے اسکی آنکھ سے زمرد نوچا اور اڑتی ہوئی اس لڑکے کے گھر پہنچی۔داخلہ آسان تھا کیونکہ اسکی چھت میں ایک سوراخ تھا۔وہ لڑکا دونوں ہاتھوں میں مہنہ چھپائے بیٹھا تھا اور اس پر کچھ غنودگی بھی طاری ہو گئی تھی، فاختہ نے نہایت چپکے سے اس کی کتاب کے اوپر ہیرا رکھا اور آہستگی سے واپس اڑ آئی۔لڑکے نے کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں تو بہت خوش ہوا۔اس نے سوچا یقیناً اس شہر میں میرے کچھ سراہنے والے بھی ہیں، اب میں اپنا ناول مکمل کر لونگا۔

فاختہ وہاں سے اڑتی ہوئی سمندر کے کنارے آئی جہاں بندر گاہ میں کئی جہاز پانی میں ہلکورے لے رہے تھے۔وہ مسرور ہو کر کچھ دیر بادبان کی نوک پر بیٹھ کر ین ہلکوروں کا مزہ لینے لگی۔درنوں مزدور سامان اتارنے میں مصروف تھے۔ اس نے خوشی سے سرشار ہو کر چیخ چیخ کر سب کو بتایا کہ میں آج اس سرد علاقے سے مصر کے گرم ریگستانوں کی جانب پرواز کروں گی۔مگر اسے یہ دیکھ کر کچھ مایوسی ہوئی کہ ان مزدوروں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور وہ اپنے کام میں مصروف رہے۔کچھ دیر بعد وہ اڑ کر اپنے مستقر پر واپس پہنچی اور شہزادے سے کہنے لگی'' شہزادے میں میں تمہیں الوداع کہنے آئی ہوں اس لئے کہ میں آج رات ہی یہاں سے پرواز کر لوں'' شہزادے نے کہا'' اے ننھی چڑیا کیا تو کچھ اور دیر میرے ساتھ نہیں رہ سکتی؟'' اس پر فاختہ بولی'' اے میرے پیارے شہزادے یہاں اب پہلے ہی کافی سردی ہو چکی ہے اور کنون جانے کہ کب برف پڑنی شروع ہا جائے۔ تم جانتے ہی ہو ہم یہ سردیاں نہیں سہہ سکتے اس لئے جلد سے جلد اس موسم میں گرم

علاقوں کو ہجرت کر جاتے ہیں۔تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس وقت جب یہاں سردی میں لوگ ٹھٹھر رہے ہیں دریائے نیل کے ساحل پر نرم اور گرم ریت میں مگر مچھ کاہلی سے لیٹے دھوپ سینک رہے ہونگے۔تیز دھوپ میں کھجور کے درختوں پر میٹھی کھجوریں پک رہی ہونگی۔نہیں میں یہاں اب نہیں ٹھہر سکتی۔میرے ساتھی وہاں فرعون کے مقبروں کے کونوں کھدروں میں اپنے گھونسلے بنا رہے ہونگے اور وہ میری یاد میں بیقرار ہونگے۔میرے اچھے شہزادے میں اب مزید نہیں ٹھہر سکتی۔ مگر تم ایک بہت ہی نیک دل اور نرم طبیعت ہو، میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گی۔بلکہ جب موسم گرما میں واپس اس طرف سے گذروں گی تو تمہارے لئے دو ہیرے، ایک یاقوت جو سرخ گلابوں سے زیادہ سرخ اور ایک زمرد جو گہرے سمندروں کی طرح سبزی مائل نیلا ہوگا لاؤں گی۔۔مگر اب میں نہیں رک سکتی''

شہزادہ کہنے لگا ''اچھا جیسی تمہاری مرضی، مگر یہاں سے کچھ دور ایک چوک میں ایک غریب لڑکی ماچس کی ڈبیاں بیچ رہی ہے۔بس یہی اسکے معاش کا ذریعہ ہے۔مگر ابھی کچھ دیر پہلے اس کی ڈبیوں کا پورا تھیلا گٹر میں گر گیا اور تیلیاں گیلی ہو گئیں۔وہ ایک کونے میں بیٹھی رو رہی ہے، اتنی سردی میں نہ اسکے پیروں میں جوتے ہیں نہ ہی اسکے سر پر کوئی ٹوپی ہے۔وہ گھر جانے کی ہمت نہیں کر رہی کیوں کہ اسکا باپ بہت ظالم ہے اور وہ اسکو بری طرح پیٹے گا۔تم میری دوسری آنکھ سے بھی از مرد نوچ لو اور اس کو دے آؤ اس سے اسکی بڑی مدد ہو جائیگی''اس پر فاختہ کی اپنی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ کہنے لگی، ٹھیک ہے میں آج رات اور تمہارے پاس رک جاتی ہوں مگر میں تمہاری دوسری آنکھ سے ہیرا نہیں نوچ سکتی، ہر گز نہیں کیونکہ پھر تو تم بالکل اندھے ہو جاؤ گے۔'' شہزادے نے کہا'' مجھے آج رات تمہاری ضرورت صرف اسی وجہ سے ہے۔میری بات مانو اور وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں'' فاختہ نے اسکی آنکھ سے ہیرا نوچا اور اڑتی ہوئی گئی اور ہیرے کو لڑکی کے ہتھیلی میں رکھ کر پھر سے اڑ گئی۔لڑکی نے خوشی سے اس چمکتے ہوئے شیشے کے سبز ٹکڑے کو دیکھا اور خوشی خوشی گھر بھاگ گی۔

مگر جب فاکتہ واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ شہزادہ اب اندھا ہو چکا ہے۔اس کے دل میں درد کی لہر اٹھی کہ اس نے نیکی کے لئے اپنی بینائی قربان کر دی۔فاختہ اس کے کندھے پر بیٹھ گئی اور اس سے کہنے لگی کہ اچھی شہزادے اب تم اندھے ہو چکے ہو، تمہیں کسی کی ضرورت ہوگی اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں کہیں نہیں جاؤنگی اور ہمیشہ ہی تمہارے ساتھ رہونگی۔مگر شہزادہ کہنے لگا نہیں نہیں تمہیں ضرور گرم علاقوں طرف اڑ جانا چاہئے، یہ موسم تمہارے لئے نہیں ہے میں التجا کرتا ہوں کہ گرم علاقوں کی طرف چلی جاؤ۔فاختہ کہنے لگی نہیں میں اب تمہارے پاس رہوں گی چاہے کچھ بھی ہو جائے اور وہ اس رات اس کے پیروں میں سو گئی۔

پھر ہر دن سردی بڑھتی گئی حتیٰ کہ نالیوں میں بہتا پانی جم نے لگا۔ فاختہ جب اڑان بھر کر واپس آتی تو شہزادے کو بتاتی کہ جہاں شہر میں امراء رنگ رلیوں میں مصروف ہیں وہاں ایسے محلے بھی ہیں جہاں بچے بھوک سے بلکتے ہیں اور بیمار دواؤں کو ترستے ہیں۔شہزادے کے پاس اب کوئی ہیرے نہ تھے مگر اس نے فاختہ سے کہا کہ میرے جسم پر جو سونے کے تاروں کا بنا ہوا جال ہے تم اسے نوچ نوچ کر ان غریبوں میں بانٹ دو۔فاختہ نے ایسا ہی کیا۔اب اس مجسمہ کی خوبصورتی ختم ہو چکی تھی، نہ تلوار کے دستے پر سرخ یاقوت، نہ ہی آنکھوں میں چمکتے زمرد کے ٹکڑے اور نہ ہی جسم پر جھلملاتا سونے کے تاروں کا لباس۔ادھر فاختہ بوڑھی اور کمزور ہو چکی تھی اور سردی نے اس پر زبردست اثر کیا تھا وہ اس قدر کمزور ہو گئی تھی اب اس سے اڑا بھی نہیں جاتا تھا۔وہ بس مجسمے کے قدموں میں پڑی رہتی تھی۔اسے معلوم تھا کہ وہ اب زیادہ دن نہیں زندہ رہ سکتی۔اس نیں بڑی ہمت کر کے ایک اور اڑان بھری اور شہزادے کے کندھے پر بیٹھ گئی اس نے شہزادے سے کہا''الوداع میرے دوست، میرے پیارے شہزادے۔۔'' شہزادے نے کہا ''الوداع میری پیاری۔تم واقعی تم میرے ساتھ بہت عرصے ٹھہریں، اب تمہیں مصر چلے جانا چاہئے'' فاختہ کہنے لگی''مگر میں مصر نہیں جا رہی۔۔میں اب موت کی وادی کی جانب جا رہی ہوں۔موت جو ابدی سکون لیکر آتی ہے'' یہ کہا اور کچھ ہی لمحوں بعد وہ ٹھٹھر کر اس کے پیروں میں گر گئی۔

شہریوں نے دیکھا کہ یہ مجسمہ بدشکل ہو چکا ہے اور انکے شہر کی خوبصورتی پر دھبہ ہے تو انہوں نے اسے گرا دیا، ملبے کو پگھلا دیا گیا۔اگرچہ سب کچھ جل کر خاک ہو گیا مگر اسکا دل جو کسی سخت فولادی دھات کا تھا نہ جل سکا۔شہر کے میئر نے کہا یہ کم بخت بھٹی میں بھی نہیں پگھل سکا اسے اب کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دو۔وہیں چڑیا کا مردہ جسم بھی پڑا تھا۔اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فرشتے کو حکم دیا کہ فلاں شہر میں کوڑے کے ایک ڈھیر پر دو بہت ہی نایاب اور انمول چیزیں پڑی ہیں تم وہ میرے لئے لے آؤ کیونکہ وہ مجھے بہت مرغوب ہیں۔ فرشتہ اڑا اور جب اس نے واپس آ کر فاختہ کا مردہ جسم اور شہزادے کا دل اللہ کے حضور پیش کیا تو اللہ تعالیٰ نے خوش ہو کر کہا'' تم بالکل صحیح چیزیں لائے ہو، میرا اشارہ انہی کی طرف تھا کیونکہ مجھے یہ بہت محبوب ہیں۔

## ''نایاب ہیرے''

حال ہی میں سائنس دانوں نے ڈھائی ہزار نادر پتھروں کی دریافت کا دعویٰ کیا ہے۔اس میں چار نادر ہیرے FINGERITE, AMICITE, NAVADAITE اور LCHNUSAITE اتنے نایاب ہیں کہ وہ صرف پانچ یا چھ مقام پر ہی دستیاب ہیں۔ان پتھروں کی دریافت سے جہاں ہیرے، یاقوت اور زمرد وغیرہ کی اہمیت کم ہوگی وہیں محبت کے متوالوں کو نادر و نایاب پیش کش کے مواقع بھی میسر ہو جائیں گے۔ان پتھروں کی دریافت سے بجلی اور بیٹری کی صنعت میں انقلاب برپا ہونے کی پیشگوئی کی جا رہی ہے۔

# زہریلا انسان

(ناول کا ایک باب)

**تابش خانزادہ** (نیویارک)

**میں** نے ہوش کی آنکھیں ایک جھونپڑی میں کھولیں۔ ہماری جھونپڑی سجنی خلی کے گاؤں سے چند میل شمال میں سُندر بن کے جنگلوں کی ابتداء میں واقع تھی۔ سجنی خلی کا گاؤں پاہیرالہ کے قصبے کے قریب ہے۔ یہ جگہ گوسابہ سے پندرہ میل دُور ہے۔ یہاں سے سونا خلی بھی تقریباً اُتنی ہی دُوری پر واقع ہے۔ سونا خلی سے کانِنگ کا فاصلہ بھی تیس میل کا ہے جہاں ہندوستان کی ریل کا آخری اسٹیشن ہے۔ جہاں سے کلکتہ اسّی میل کے فاصلے پر ہے۔ ہاں تو میں اپنی جھونپڑی کی بات کر رہا تھا۔ ہماری جھونپڑی سجنی خلی کے گاؤں سے چند میل شمال میں سُندر بن کے جنگلوں کی ابتداء میں ایک بڑی سی چٹان پر برگد کے ایک بڑے درخت کا مرکز مان کر ایک دائرے کی صورت میں تھی۔ اس کے باوجود کہ کئی سو سالہ برگد کا یہ درخت جھونپڑی پر ہمیشہ سایہ فگن رہتا تھا، جھونپڑی کی چھت بانس کی شاخوں کو بُن کر بنائی گئی تھی۔ اس بُنے ہوئے بانس کو اوپر سے جنگلی جانوروں کی کھالیں سی کر ایسے ڈھانکا گیا تھا کہ مون سون کے دل ہلا دینے والے جھکّڑ بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ پاتے تھے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ تیز سے تیز ترین بارش یا طوفان میں ہماری جھونپڑی کی چھت کبھی ٹپکی ہو۔ جھونپڑی کی دیواریں موٹے بانس کے ڈنڈوں کو زمین میں تین تین فٹ کے فاصلے پر گاڑ کر بنائی گئی تھیں اور تین فٹ کا درمیانی فاصلہ بانس کی تپلی تپلی ٹہنیوں کو بُن کر بنائے گئے تختوں سے پُر کیا گیا تھا۔ جھونپڑی کی اندرونی دیواروں کو چھت کی طرح جنگلی جانوروں کی کھالیں بلا ترتیب سی کر موسم کی سختی سے بچایا گیا تھا۔

جھونپڑی کے چاروں طرف چھ فٹ چوڑے پتھروں کو ترتیب سے رکھ کر ایک پگڈنڈی بنائی گئی تھی۔ اس پگڈنڈی کے درمیان دو فٹ چوڑی گھوڑے کی نال کی شکل کی کیاری تھی جس میں رات کی رانی اُگائی گئی تھی۔ جھونپڑی کے دو دروازے تھے۔ آگے والا دروازہ مشرق کی طرف کھلتا تھا اس دروازے پر جنگلی انگور کی ایک بیل تھی۔ یہ بیل انگور کے موسم میں پیلے پیلے انگوروں کے گچھوں سے لدی رہتی تھی۔ جھونپڑی میں آتے جاتے بیل سے انگور توڑ توڑ کر کھانا میرا روزانہ کا ایک بڑا مشغلہ ہوتا تھا۔ جھونپڑی کے شمال میں ایک قدرتی جھرنا تھا جس کا پانی چٹان سے پچھلی جانب گرتا تھا اور ایک ندی کی صورت میں قریبی جھیل میں مدغم ہو جاتا تھا۔ جھرنے کے پاس جنگلی بیری کا درخت تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ بیری کے اس درخت پر ایک بھی کانٹا نہیں تھا۔ اس درخت پر کالے کالے لیکن شہد کی طرح میٹھے بیر لگتے تھے۔ بیروں کی خاطر میں اس درخت پر کسی بندر کی طرح چڑھ جاتا تھا۔ اسی بیری کے پاس کی ڈھلان ہمارے لیے بیت الخلاء کے طور پر بھی استعمال ہوتی تھی۔ جھونپڑی کے جنوب میں شہتوت، انجیر، اخروٹ اور دوسرے جنگلی پھلوں کے درخت اور بیلیں تھیں۔ یہ پھل ہمارے لیے سال بھر کی خوراک کا ایک مستقل ذریعہ تھے۔ سال کے بارہ ماہ کسی نہ کسی درخت یا بیل پر پھل لگے رہتے تھے۔ جنگلی سبزیاں بھی اِسی جگہ اُگی ہوئیں تھیں۔ جھونپڑی کے پیچھے کا دروازہ مغربی سمت کھلتا تھا جس کے آگے ایک بڑی چٹان تھی اور یہ جگہ ہماری سانپوں کی تجربہ گاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔

جھونپڑی کے مشرقی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی داہنی سمت دو مٹکے رکھے تھے۔ ایک میں پانی ہوتا تھا اور دوسرے میں ہمارے کپڑے۔ پانی کے مٹکے کے منہ پر مٹّی کا ایک پیالہ اُلٹا دھرا ہوتا تھا۔ یہ پیالہ گھڑے سے پانی نکال کر پینے کے علاوہ گھڑے کا منہ ڈھکنے کے کام بھی آتا تھا۔ گھڑوں سے پَرے بانس کی بنی ہوئی ایک ٹوکری پڑی رہتی تھی جس میں ہمارے کھانے کے لیے موسم کے مطابق تازہ پھل اور سبزیاں رکھی رہتی تھیں۔ ٹوکری کے بعد ایک تخت پوش تھا جس پر جانوروں کی کھال کا بنا ہوا بستر پڑا ہوتا تھا جس پر مَیں سوتا تھا۔ میرے بستر کے آگے ایک بڑا سا سوراخ تھا۔ اس سوراخ میں کالی رہتی ہے۔ سوراخ کے دہانے پر مٹی کا ایک دودھ سے بھرا ہوا پیالہ پڑا ہوتا تھا۔ کالی اس پیالے میں دودھ پیتی تھی۔ کالی ہماری پالتو شیش ناگن (Queen Cobra) تھی جو ہمیشہ آزاد رہتی ہے۔ اپنی مرضی سے آتی اور اپنی مرضی سے جاتی ہے۔ ہم اسے کبھی کسی پٹاری میں بند کر کے نہیں رکھتے تھے۔

برگد کے تنے کے پاس ہی ایک اور تخت پوش تھا جس پر جانوروں کی کھال کا بنا ہوا بستر پڑا ہوتا تھا۔ اس بستر پر میرے باپو سوتے تھے۔ پاس ہی ایک قطار میں تین مٹکے رکھے رہتے تھے۔ ان مٹکوں میں باپو دارو یعنی شراب بناتے تھے۔ ایک مٹکے میں شراب بن رہی ہوتی تھی، دوسرے میں کشید ہو رہی ہوتی تھی اور تیسرا مٹکا شراب سے بھرا ہوتا تھا۔ مریض باپو کے لیے گنّے کے موسم میں گڑ لایا کرتے تھے۔ باپو ایک مٹکے میں خمیر، گڑ اور پانی ڈال کر مٹکے کا منہ چمڑے سے بند کر دیتے تھے۔ یہ مٹکا چھ ماہ بعد جب کھولا جاتا تو دارو کی بھینی بھینی خوشبو جھونپڑی میں ہر طرف پھیلی ہوتی تھی۔ شراب باپو کو بہت پسند تھی وہ دن میں ایک دو کٹورے شراب ضرور پیتے تھے۔ ابتداء میں مجھے صرف بیمار ہونے پر شراب ملتی تھی۔ پھر سونے سے پہلے مجھے شراب پینے کی اجازت ملی۔ آٹھ سال کی عمر سے سردیوں کے دنوں میں چند گھونٹ پینے کی اجازت ملی۔ مجھے شراب سرور ضرور دیتی تھی نشہ کبھی نہ دیتی تھی۔ باپو کا کہنا تھا کہ شراب کم ظرف کو نشہ دیتی ہے اور صاحبِ ظرف کو سرور۔ باپو ہمیشہ آہستہ آہستہ چھوٹی چھوٹی چسکیاں لے کر شراب پیتے اور ایک کٹورے کو ایک دو گھنٹوں میں ختم کرتے تھے۔

برگد کے تنے کے پیچھے جھونپڑی کا مغربی حصہ باپو کے دواخانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہاں برگد کے تنے کی جانب انواع واقسام کے شیشے کے کئی جار رکھے ہوئے تھے۔ ہر جار کے اوپر علاقے کے ایک سانپ کا نام لکھا تھا اور جار کے اندر اُسی سانپ کا زہر تھا اور زہر میں ببول کے کانٹے جو سانپ کے زہر میں ہر وقت بجھتے رہتے تھے۔ ایک جار میں پانی تھا جس کے اندر کالے کالے، گول گول کسی کنچے کی جسامت کے سانپ کے منکے پڑے ہوئے تھے۔ قریب رکھے ہوئے ایک اور جار میں خشک منکے رکھے رہتے تھے۔ جھونپڑی کے مغربی جانب دروازے کے ساتھ کی دیوار کی جانب ایک بستر نما تخت پوش بچھا تھا جس پر سانپ کاٹے کا علاج کے لیے آنے والے مریض لیٹتے تھے۔ ایک چوکی تخت پوش کے پاس رکھی ہوئی تھی اور ایک چوکی تخت پوش کی دوسری سمت۔ جس پر باپو یا مریض کے لواحقین بیٹھا کرتے تھے۔ برگد کے درخت کے دائیں ہاتھ پر بھی مریض کے لواحقین کے بیٹھنے کے لیے کئی اور چوکیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ہماری جھونپڑی میں چولہا نہیں تھا اور نہ ہی ہمیں کبھی آگ جلانے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی کیونکہ جنگلی پھل اور سبزیاں ہماری مستقل غذا تھیں۔ کھانے کے لیے کبھی کبھار شہد بھی مل جاتا تھا۔ جنگلی ہرن اور بکریوں کا دودھ اور پاس کے جھرنے کا پانی پیتے تھے اور یہ ساری نعمتیں سال کے بارہ ماہ کسی نہ کسی شکل میں ہمیں میسّر رہتی تھیں۔ یہ جھونپڑی ہمارا کُل سرمایہ تھی۔

اس سے پہلے کہ میں آپ سے اپنے باپو کا ذکر کروں، میں اپنا تعارف کرواتا جاؤں۔ نام رامو ہے اور میری عمر چھ سال۔ معلوم نہیں یہ رام کا مخفف ہے یا رحیم کا۔ مجھے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ میں نے دیکھا ہے کہ مذاہب کے ماننے والے اپنے مذہب کو آڑ بنا کر ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں جبکہ میں نے انسانوں سے محبت کرنا سیکھا ہے۔ میں نے اپنی آنکھیں اس جھونپڑی میں باپو اور کالی کے درمیان کھولیں۔ مجھے اس بات کا علم بھی نہیں کہ باپو سے میرا کوئی خونی رشتہ بھی ہے یا نہیں۔ ویسے ظاہری شکل وصورت سے ہمارا تعلق خونی معلوم نہیں پڑتا۔ میری رنگت گوری اور آنکھیں سبز اور میرے سر کے بال بھورے اور گھنگریالے ہیں۔ جبکہ باپو گہرے جامنی رنگ پر سیاہ آنکھیں اور کالے بالوں والے ہیں۔ میں نے کبھی باپو سے یہ سب کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی اس لیے کہ میں باپو کو اپنا سب کچھ سمجھتا ہوں اور وہ مجھے۔ جب میں بیمار پڑتا ہوں تو باپو اپنی ساری توانائی میری دیکھ بھال میں صرف کرتے ہیں۔ مجھے جڑی بوٹیاں گھوٹ گھوٹ کر پلاتے ہیں۔ میرے سرہانے بیٹھ کر میرا سر دباتے ہیں اور اُس وقت تک چین سے نہ بیٹھتے ہیں اور نہ ہی سوتے ہیں جب میں روبصحت نہیں ہو جاتا۔ میری بیماری کے دِنوں میں کالی تو جیسے مجھ سے چپک کر رہ جاتی۔ اس کا کھانا پینا اور اپنی غار میں جانا بند ہو جاتا ہے بس میرے ساتھ لیٹی اپنی زبان سے میرے چہرے کو چاٹتی رہتی ہے اور میرے ٹھیک ہوتے ہی اس کی توانائی بھی لوٹ آتی ہے۔

اب میں آپ کو اپنے باپو کے بارے میں کچھ بتاتا ہوں۔ میں انہیں باپو کہتا تھا جبکہ باقی لوگ انہیں شان جی کہتے تھے۔ معلوم نہیں شان جی باپو کا نام تھا یا ان کی کنیت تھی اور اگر شان اُن کا نام نہیں تھا تو پھر باپو کا نام بھی مجھے ابھی تک معلوم نہیں تھا۔ ویسے شان سندر بن میں بنوں بی بی کے ایسے جوگی کو کہتے ہیں جن کی ہیبت سے سانپ، مگرمچھ، شیر اور دوسری جنگلی بلائیں ڈرتی ہیں۔ جس وقت میری عمر چھ سال کی تھی باپو کی عمر ساٹھ سال کی ہوگی۔ ان کا قد لانبا اور جسم پتلا تھا۔ کم بولنے کی عادت نے باپو کی شخصیت کو باوقار بنا دیا تھا۔ لوگ باپو کی اس عادت کو پراسراریت کا نام بھی دیتے تھے۔ وہ اپنے مخاطب کو خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا ہمیشہ دھیمے لہجے سے آپ کہہ کر بات کا آغاز کرتے۔ مجھے آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ باپو کی مادری زبان کونسی تھی۔ وہ ہندی بڑی شستہ بولتے تھے۔ ان کی بنگالی بھی اہلِ زبان سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ وہ اردو کسی لکھنوی سے کم نہیں بولتے تھے۔ باپو مجھ سے بھی کئی زبانوں میں بات کرتے تھے اس لیے میں بھی یہ ساری زبانیں کسی اہلِ زبان کی طرح بولتا تھا۔ باپو کو میں نے ایک آدھ بار ٹوٹی پھوٹی انگریزی زبان میں بات کرتے ہوئے بھی سنا تھا۔

باپو کے رعب دار چہرے پر گہری مقناطیسی آنکھیں اُن کی شخصیت کو باوقار بناتی تھیں۔ اُن سے آنکھیں ملا کر بات کرنا کسی کے لیے اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ اُن کی آنکھوں کی مقناطیسیت کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ ہر شب بلاناغہ سونے سے پہلے کالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھنٹوں مراقبہ کرتے تھے اور یہ مراقبہ اُس وقت تک جاری رہتا تھا جب تک کالی اپنا سر جھکا کر باپو کی گود میں نہ رکھ دیتی۔ مراقبے کے دوران باپو کی آنکھیں کسی ہیرے کی طرح دمک رہی ہوتیں تھیں۔ مراقبے کے بعد باپو جھونپڑی کے عقب میں سانپ کا زہر ملا پانی ایک لوٹے میں رات کی رانی کے نیچے رکھنے کے بعد آ کر سو جاتے تھے۔ صبح تڑکے اُٹھ کر سب سے پہلے اپنے جسم پر مرے ہوئے حشرات الارض جھاڑتے۔ جی ہاں، باپو کا خون سانپوں کے زہر کی وجہ سے اتنا زہریلا ہو چکا تھا کہ انہیں کاٹنے والے کیڑے اور دوسرے حشرات الارض کاٹنے کے دوران ہی مر جاتے تھے۔ اپنے جسم پر مرے ہوئے حشرات الارض جھاڑنے کے بعد وہ جھرنے پر جا کر نہاتے تھے جہاں وہ اپنے سر اور چہرے کے بال بھی اُسترے سے صاف کرتے۔ نہانے کے بعد وہ دودھ والا برتن لے کر جھونپڑی کے باہر بیٹھ کر بند آنکھوں کا مراقبہ کرتے تھے۔ وہ آنکھیں اُس وقت تک نہیں کھولتے تھے جب تک کوئی جنگلی بکری یا ہرنی قریب آ کر اُن کو اپنی موجودگی کا احساس نہیں دلاتی تھی۔ وہ اپنی آنکھیں کھولتے۔ آنے والے جانور کو سہلا کر اُس کا استقبال کرتے اور اُس کا دودھ دوہتے۔ جانور اپنا دودھ دے کر ایک بار پھر جنگل کی راہ لیتے۔ برتن میں دودھ لے کر باپو جھونپڑی میں داخل ہوتے۔ مجھے اُٹھنے کا کہہ کر کالی کے پیالے میں دودھ ڈالتے۔ میں جلدی سے اُٹھ کر باہر جھرنے پر منہ دھو کر جھونپڑی میں آتا اور باپو کے ساتھ مل کر بقیہ دودھ کا ناشتہ کرتا۔

ناشتے کے بعد میں اور باپو جھونپڑی کے دواخانے والے حصے میں آتے۔ جہاں باپو سانپوں کے زہر میں بجھے ہوئے کانٹے میرے ہاتھ کی پشت پر چبھوتے اور اُس کے ساتھ کہتے جاتے کہ یہ تھوڑا سا زہر تمہارے جسم میں اصل زہر کے خلاف تریاق (Antibodies) پیدا کرے گا اور تمہارا خون زہریلا کر دے گا۔ سات سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے میرا جسم کئی سانپوں کے زہر کے اثرات کی وجہ سے اتنا زہریلا ہو چکا تھا کہ مجھے کاٹنے والے کیڑے بھی کاٹنے کے دوران مر جاتے تھے۔ مجھے یاد ہے جب پہلی بار میں نے صبح اٹھ کر اپنے جسم پر مردہ کیڑے دیکھے تو میں بہت خوش ہوا تھا اور باپو کو بتایا تو وہ کہنے لگے، ابھی تو ابتداء ہے۔ تمہیں ابھی بہت آگے جانا ہے۔ باپو کی یہ بات میری سمجھ میں بہت دیر بعد آئی تھی۔ کبھی کبھار سانپوں کے نئے زہر سے بجھے ہوئے کانٹے چبھنے کے ایک یا دو دن تک مجھے بخار رہتا تھا اس کے بعد میں ٹھیک ہو جاتا تھا۔ بخار کے دوران باپو میری تیمارداری کرتے اور صحتمند ہونے کے بعد زہریلے کانٹے چبھونے کا عمل ایک بار پھر سے شروع کر دیتے۔ جب تک میرا جسم پہلے زہر کا عادی نہ ہو جاتا، باپو زہر تبدیل نہیں کرتے تھے۔ کانٹوں کی مشق کے بعد ہم پچھلے دروازے سے جھونپڑی کے عقب میں جاتے۔ جہاں لوٹے کے پاس رات کی رانی کی جھاڑی میں کم از کم ایک اور کبھی کبھار ایک سے زیادہ سانپ موجود ہوتے۔ باپو ایک سانپ میرے حوالے کرتے اور میں اس سے گھنٹوں کھیلتا رہتا۔

چھ سال کی عمر سے ہی مجھے سانپوں کی اتنی پہچان ہو گئی تھی کہ ایک نظر ڈال کر یہ بتا سکتا تھا کہ سانپ زہریلا ہے یا نہیں اور اگر زہریلا ہے بھی تو کتنا اور اس سانپ کے کاٹے کا تریاق کیا ہے۔ باپو نے ہی مجھے سانپوں کی پہچان کراتے ہوئے سب سے پہلے جامنی رنگ کا ایک سانپ میری گود میں رکھتے ہوئے کہا تھا کہ یہ چوہے خور سانپ ہے۔ پھرتیلا ضرور ہے لیکن بے ضرر ہے۔ اس کے بعد لگڑی سانپ سے میرا تعارف ہوا۔ لال، کالی اور بھوری دھاری دار اور کسی لکڑی کی طرح پتلا، لمبا اور کیڑے مکوڑے خور سانپ۔ یہ بھی ایک بے ضرر سانپ ہے۔ پھر میرا تعارف پیلی سانپ سے ہوا۔ یہ نیلی اور کالی دھاری والا سانپ ہے۔ یہ سانپ پانی کے کنارے رہتا ہے اور مینڈک بڑی رغبت سے کھاتا ہے لیکن زہریلا بالکل نہیں ہے۔ سورج مکھی بھی زہریلا سانپ نہیں ہے۔ اس کا سر کسی برص کے مریض کی طرح باقی جسم کی نسبت کم سیاہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اور کئی غیر زہریلے سانپوں سے میرا تعارف ہوتا رہا۔

پھر ایک دن باپو نے مجھے ایک بڑا اژدھا (ناگ) دیا، جس کی لمبائی کوئی دس بارہ فٹ اور جس کا گھیرا کسی پہلوان کی ران سے یا کسی کھجور کے تنے سے کسی طرح کم موٹا نہیں تھا۔ تعارف کراتے ہوئے باپو نے بتایا کہ یہ سانپ زیادہ تر پانی کے آس پاس پایا جاتا ہے۔ یہ عام طور پر انسانوں سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن وقت پڑنے پر انسان کو بھی نہیں چھوڑتا۔ یہ ناگ نہ زہریلا ہے اور نہ ہی پھرتیلا۔ لیکن اس کی جکڑ مار دیتی ہے۔ یہ ناگ اگر گھوڑے یا مگرمچھ کو جکڑ لے تو اُن کا بھی دم نکال دے۔ یہ سانپ نہ انسان کو کھاتا ہے اور نہ کاٹتا ہے۔ مگر اپنی جکڑ سے مار ضرور دیتا ہے۔ اس کی جکڑ سے بچنے کا حل اس کے پیٹ پر موجود چند ایک نبضوں میں ہے۔ اس کی کسی ایک نبض پر اپنے ناخنوں سے گدگدی کرنے سے یا نبض کو سہلانے سے اس کی جکڑ کمزور پڑنے لگتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ باپو نے مجھے بتایا بلکہ اس ناگ کو میرے جسم کے گرد لپیٹ کر اسے موقع دیا کہ وہ مجھے اچھی طرح دبوچ لے۔ اس کے بعد مجھے ناگ کے پیٹ کی نبضیں دکھاتے ہوئے کہا کہ اب میں ان میں سے کسی ایک پر گدگدی کروں۔ اگرچہ ناگ کی گرفت سے میری سانس گھٹنے لگی تھی اس کے باوجود میں نے جونہی اُس کی ایک نبض سہلانا شروع کی تو ناگ نے مجھ پر اپنی گرفت ڈھیلی کرنی شروع کر دی۔ یہاں تک کہ اُس نے مجھے بالکل چھوڑ دیا۔ اس ناگ سے میری اُس وقت تک تجرباتی جنگ رہی جب تک باپو نے یہ یقین نہیں کر لیا کہ میں اس کو ہر حال میں قابو پانے کا گر سیکھ گیا ہوں۔

سانپوں سے میری شناسائی کا دوسرا دور کم زہریلے سانپوں پر مشتمل تھا۔ کسی کم زہریلے سانپ سے کھیلنے کی اجازت دینے سے پہلے باپو ان سانپوں کے زہر میں بجھا ہوا کانٹا چبھو کر میرے جسم کو زہر آشنا کرتے اور یہ عمل تقریباً ایک ہفتے تک جاری رہتا۔ باپو اُس وقت تک سانپ میرے قریب نہیں پھٹکنے دیتے تھے جب تک اُنہیں اس بات کا یقین نہیں ہو جاتا تھا کہ میرا جسم اس سانپ کا زہر برداشت کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس یقین کے بعد باپو سانپ کا تعارف کچھ یوں کراتے، اس سانپ کا نام سر پھرا ہے۔ نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ پانی میں اپنا سر ایک طرف گھما کر تیرتا ہے، زہریلا کم اور پھرتیلا زیادہ ہے۔ یہ بلّی سانپ ہے، اس کی سبز آنکھیں کسی بلّی کی طرح مقناطیسی ہیں، یہ کاٹتا بھی ہے اور ڈراتا بھی ہے۔ سب سے پہلے میں نے بلّی سانپ کی آنکھوں میں جھانکا تو مجھے ایسے لگا جیسے میں اپنی تمام توانائی کھونے لگا ہوں۔ باپو نے مجھے ایک جھٹکے سے جھنجھوڑا تو میں اپنی توانائی بحال کر پایا۔ اُس دن باپو نے میرے ہاتھ سے سانپ لے کر میرے ہاتھ میں بین تھماتے ہوئے کہا کہ وہ اُس وقت تک مجھے کوئی سانپ نہیں دیں گے جب تک میں بین بجانا نہیں سیکھ جاتا۔

اس کے ساتھ ہی میرا بین بجانا سیکھنے کا دور شروع ہوا۔ بین بجانے کا عمل پیاز کی طرح کئی پرتوں پر مشتمل ہے۔ پہلے مرحلے میں لمبی لمبی سانس لے کر کافی دیر تک پھیپھڑوں میں روکنا ہوتا ہے۔ دوسرے مرحلے میں بین کا پکڑنا آتا ہے۔ تیسرے مرحلے میں بین میں پھونکنا ہوتا تھا اور آخری مرحلے میں بین کے سوراخوں پر انگلیوں کو جمانا اور اُٹھانا آتا ہے۔ ان مراحل کی کامیابی کے بعد بین بجانے کا عمل شروع ہوتا ہے۔ پھر بین بجانے کے دوران بہ یک وقت ناک سے سانس لینا اور بین کے ذریعے منہ سے ایسے خارج کرنا کہ بین کی تان نہ ٹوٹنے پائے۔ اس مرحلے کو ایک سانس میں بین بجانا کہا جاتا ہے۔ ان مراحل سے گزرنے کے بعد گھنٹوں بند آنکھوں سے ایک تان اور ایک ہی سانس میں بین

بجانا سیکھا۔ بعدازیں اپنی آنکھیں کھول کر ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے ایک سانس میں تان کے ساتھ بین بجانا سیکھا۔ آخر میں چلتے ہوئے پانی کو دیکھ کر ایک سانس میں اپنی تان کو برقرار رکھنے پر قدرت حاصل کی۔ یہ مرحلہ میرے لیے سب سے زیادہ مشکل اور محنت طلب تھا۔ باپو کا کہنا تھا کہ بہتا پانی کسی پھُرتیلے سانپ جیسا ہوتا ہے۔ جو سپیرا بہتے پانی کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ اپنی بین کی تان ایک سانس میں برقرار رکھ سکتا ہے وہ سانپ تو کیا اپنی بین سے پوری دنیا کو تسخیر کر سکتا ہے۔ مہینوں تک بین بجانا سیکھنے کے بعد جب باپو نے محسوس کیا کہ میں بین بجانے پر خاصی مہارت حاصل کر چکا ہوں، تو انہوں نے ایک بار پھر بلی سانپ اس ہدایت سے میرے سپرد کیا کہ میں بین بجاتے ہوئے سانپ کی آنکھوں میں دیکھوں۔ یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ رفتہ رفتہ میں نے سانپ کی حرکت کو بین کی لے سے اور اس کی آنکھوں کو اپنی آنکھوں سے قابو کرنا شروع کیا۔ میری تربیت کے تمام دور میں اس سانپ سے زیادہ میرا وقت کسی اور سانپ نے نہیں لیا۔ لیکن اس سانپ نے مجھے کم عمری میں نہ صرف بین بجانے کا ماہر بنا دیا بلکہ میری آنکھوں کو ایسی مقناطیسی توانائی عطا کی کہ میں اگر کسی جنگلی جانور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتا تو وہ اپنی جگہ پر کسی بُت کی مانند منجمد ہو کے رہ جاتا۔ جب میں اپنی آنکھیں موندے بین بجاتا تو مجھے گردونواح کا ہوش ہی نہیں رہتا تھا۔ باپو نے مجھے بتایا کہ میری بین کی تان سُننے کے لیے اردگرد سے پرندے جھونپڑی کے آس پاس جمع ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد میری تربیت میں ایک سے ایک زہریلا سانپ آتا گیا۔ سب سے آخر میں جنگلی شیش ناگ کی باری آئی۔ کالی کی وجہ سے اگرچہ مجھے شیش ناگ سے کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہوتا تھا پھر بھی جنگلی شیش ناگ کو بڑی احتیاط سے برتا کرتا تھا۔ آٹھ سال کی عمر کو پہنچ کر میں ایک پختہ سپیرا بن گیا تھا۔ ایک ایسا سپیرا جس کی بین سانپ تو کیا، دوسرے جانوروں تک کو مسحور کر دیتی تھی۔ آٹھ سال کی عمر میں میرا خون اتنا زہریلا ہو گیا تھا کہ مجھے کاٹنے والے حشرات الارض میرے زہریلے خون کی تاب نہ لا کر میرے جسم پر ہی مر جاتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ کم زہریلے سانپ مجھے ڈستے ہی دم توڑ دیتے تھے۔ اور شیش ناگ میری آنکھوں کی تاب نہ لا کر اپنی نظریں جھکا لیتے تھے۔ سانپ میرے لئے کسی کھلونے سے کم نہیں تھے۔ ایسے کھلونے جن سے میں اپنے دن کا بڑا حصہ کھیلتے ہوئے گزارتا تھا۔

سانپوں کے بارے تو میں کافی کہہ چکا ہوں اب ذرا سانپ کے زہر اور منکوں پر تھوڑی سی روشنی ڈالتا جاؤں۔ سانپ کا زہر دراصل سانپ کی بنائی ہوئی حفاظتی پروٹین (Defense Protein) ہے جو سانپ اپنی حفاظت یا شکار کو مارنے اور مارے ہوئے شکار کو ہضم کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یہ زہر کاٹ کے راستے شکار کے جسم میں داخل ہو کر شکار کو اندر سے ہضم کرتا ہے۔ سانپ کا زہر سموم الدم یا Hemotoxins، سموم العضلات یعنی Myotoxins سموم العصاب بمعنی Neurotoxins کہلاتا ہے۔ سانپ کا منکا سیاہ چمکیلے کوئلے کے پتھر (Porous Graphite) کی ایک گولی سے بنا ہوتا ہے۔ منکے کی جسامت مٹر کے دانے سے لے کر گولی والی بوتل کے کنچے جتنی ہوتی ہے۔ یہ کوئلہ ریلوے انجن میں استعمال ہونے والا کوئلہ ہوتا ہے جس کو آگ میں تاپ کر منکا بنایا جاتا ہے۔ آگ میں تپانے کا مرحلہ اس کوئلے کی گولی کو افزودہ کوئلہ یعنی Activated Charcoal بنا دیتا ہے۔ یہ منکا سانپ کے دانتوں والے زخم یا سانپ کی کاٹ پر رکھ دیا جاتا ہے جو زخم سے کسی چیچڑ کی طرح یا کسی مقناطیس کی طرح چپک جاتا ہے اور زخم سے سانپ کی پروٹین یا زہر کو کسی چُوسن (Spong) کی طرح چُوسنا شروع کر دیتا ہے۔ سائنس میں اس امر کو حرکتِ ربائی یا Immobilization کہتے ہیں۔ سانپ کی کاٹ پر زخم کی مطابقت سے منکا لگایا جاتا ہے۔ سانپ کے کاٹے کا زخم اگر گہرا ہوا تو قیاس کے مطابق جسم میں زیادہ مقدار میں زہر داخل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے بڑا منکا استعمال کیا جاتا ہے۔ کم گہرے یا سطحی زخم کے لیے چھوٹا منکا لگایا جاتا ہے۔ منکا زہر سے سیر شدہ (Saturated) ہونے پر زخم پر چپکنے سے انکار نہ کر دے۔ زخم پر منکا نہ چپکنے کا مطلب ہوتا کہ زخم میں زہر اب باقی نہیں رہا۔ منکا ایک بار استعمال کرنے کے بعد پانی یا دودھ میں ایک رات کے لیے بھگویا جاتا ہے جس کی وجہ سے منکا اپنا چوسا ہوا زہر پانی یا دودھ میں اُگل دیتا ہے۔ سائنس میں اس مرحلے کو انفراغ یا Demobilization کہتے ہیں جس کے بعد منکا دوبارہ قابلِ استعمال ہو جاتا ہے۔

سانپ کے کاٹنے اور منکا لگانے کے درمیان جتنا کم وقت ہو مریض کے بچنے کی اتنی زیادہ امید ہوتی ہے۔ منکا اگر کاٹ پر کسی مقناطیس کی طرح چمٹ جائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ سانپ کا زہر جسم میں ابھی نہیں پھیلا۔ اگر سانپ کاٹے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزر جائے تو منکے کا استعمال بے کار تصور کیا جاتا ہے۔ ایسے مریض کے سانپ کے کاٹے کا زخم چاقو سے ایک انچ کی لمبائی میں چیرا جاتا ہے اور چیر پر لکڑی کا خشک برادہ باندھا جاتا ہے۔ لکڑی کا برادہ زہر چوستا ضرور ہے لیکن کم موثر ہوتا ہے اس لیے یہ طریقۂ علاج تقریباً متروک ہو چکا ہے۔ زخم سے زہر کو منہ سے چوس چوس کر تھوکا بھی جاتا ہے۔ زخم چوس کر زہر نکالنے کا مرحلہ خاصہ مشکل اور وقت طلب ہوتا ہے۔ زہر چوسنے والا اگر خود زہریلا نہ ہو تو سانپ کا زہر چوس کر مر بھی سکتا ہے۔ باپو نے اسی لئے مجھے زہر بجھے کانٹے چبھو کر زہریلا کر کے اس مرحلے کے لیے تیار کر دیا تھا۔

ہمارے ہاں علاقائی لوگوں کی نسبت سانپ سے ڈسے ہوئے سیاح زیادہ آتے تھے۔ ان میں بہت کم ایسے لوگ آتے تھے جنہیں سانپ کاٹے ہوئے گھنٹوں گزر گئے ہوتے اس لیے زخم کو چوس کر زہر نکالنے کی مشقت بہت کم کرنا پڑتی تھی۔ زیادہ تر مریض منکا لگانے پر ہی سنبھل جاتے تھے۔ سانپ کی کاٹ کو دیکھ کر نہ صرف کاٹ کی گہرائی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے بلکہ سانپ کی عمر اور قسم کا بھی

پتہ چلایا جاسکتا ہے۔مثال کے طور پرشیش ناگ کے دانت تکون ہوتے ہیں اور بلی سانپ کے دانت گول ہوتے ہیں۔ بے ضرر سانپوں کے دانت زیادہ تر مستطیل کی شکل کے ہوتے ہیں اور کم زہریلے سانپوں کے دانت چوکور ہوتے ہیں۔کاٹ کے دو دانتوں کا درمیانی فاصلہ سانپ کی عمر بتانے کے کام آتا ہے۔ایک بڑے شیش ناگ کے دونوں دانتوں کے درمیان تین انچ سے زیادہ فاصلہ ہوتا ہے اور سنپولیے کے دو دانتوں کے درمیان ایک انچ کے آٹھویں حصے کے برابر فاصلہ ہوتا ہے۔اژدھا کے دانتوں کا درمیانی فاصلہ اگرچہ پانچ اور چھ انچ سے بھی زیادہ ہوتا ہے لیکن یہ سانپ زہریلا نہیں ہوتا اور اس کی کاٹ بھی بیضوی ہوتی ہے۔

آٹھ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے میں کاٹ دیکھ کر سانپ کا نام اور عمر تک بتا دیتا تھا اور کاٹ کی گہرائی دیکھ کر جسم میں داخل زہر کی مقدار تک بتا دیتا تھا۔ مریض کو دیکھ کر میں یہ تک بتا سکتا تھا کہ اس کو سانپ نے کتنی دیر پہلے کاٹا تھا اور یہ کب تک اپنے روزمرہ کے معمول میں واپس آجائے گا۔ایک بات میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے دواخانے میں ایک بار آنے والا مریض ہمیشہ زندہ ہی واپس جاتا تھا۔ان میں ایسے ایسے مریض بھی شامل تھے جن کے لواحقین انہیں تقریباً مردہ حالت میں چار پائی پر لاد کر ہمارے ہاں لائے تھے اور ہم نے انہیں اپنے پاؤں پر چل کر گھر واپس بھیجا تھا۔

اب ذرا اپنے دواخانے کا تفصیلی تعارف کراتا چلوں۔اس دواخانے میں باپو صرف اور صرف سانپ کی کاٹ کا علاج کرتے تھے۔ دواخانے میں علاقے کے سانپ کے زہر کا تریاق موجود تھا۔ یہ دواخانہ دیوالی، دسہرا اور عیدین کو بھی کھلا رہتا تھا۔باپو کسی سے علاج کی فیس بھی نہیں لیتے تھے۔اگر کوئی پیسے دینے کی کوشش کرتا تو باپو سختی سے منع کر دیتے اور کہتے یہ روپے کسی غریب کو میری طرف سے دے دینا بھائی صاب۔ چیت کے مہینے سے لے کر اساڑھ کے مہینے کے دوران سندر بن کا علاقہ ملکی اور غیرملکی سیاحوں کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ان چار ماہ میں ہمارے دواخانے میں روزانہ بیس یا تیس کے لگ بھگ سانپ کاٹے کے مریض آتے ہیں۔ان سیاحوں میں ہر ملک، رنگ اور نسل کے لوگ ہوتے تھے۔ساون کے شروع ہوتے ہی سیاحوں میں کمی آنے لگتی ہے۔چار ماہ بعد یعنی کاتک کے مہینے تک علاقے میں اکا دُکا سیاح نظر آتے ہیں۔ان دنوں ہمار دواخانے میں سانپ کاٹے کے مریضوں کی تعداد گر کر ایک دو روزانہ ہو جاتی ہے۔ان میں زیادہ تر علاقائی دہقان ہوتے ہیں۔سردیوں کے چار ماہ ہمارے ہاں ایک دو مریض ہفتہ وار کے حساب سے آتے ہیں۔اس کی دو وجوہات ہیں۔پہلی وجہ سانپ ٹھنڈے خون (Cold-blooded) کے ہوتے ہیں اس لیے استراحتِ سرما (Hibernation) میں چلے جاتے ہیں۔ دوسری وجہ سندر بن کا علاقہ جاڑے کے موسم میں لوگوں سے تقریباً خالی ہو جاتا ہے۔ بہار کا موسم جہاں سیاحوں کو سندر بن کی سیاحت کی کشش میں کھینچ لاتا ہے وہاں سانپوں کو بلوں سے باہر لاتا ہے۔

میں اس وقت تقریباً چھ سات سال کا ہوں گا جب ایک دن ہمارے دواخانے میں ایک شخص اپنے چودہ سالہ لڑکے کو اپنی سائیکل پر بیٹھا کر لے آیا۔لڑکا سائیکل کے ڈنڈے پر بیٹھنے کے بجائے پڑا ہوا تھا۔لڑکے کی حالت دیکھنے میں اگرچہ اتنی پتلی نہیں تھی اس کے باوجود اُس کے ہونٹ ہلکے سے کپکپا رہے تھے۔ آنکھوں میں سبزی جھلکتی تھی اور اُس کو سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔آنکھوں سے سبز رنگ جھلکنا بھی سانپ کاٹے کی کئی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔باپو جھونپڑی میں نہیں تھے۔سائیکل کھڑی کر کے جونہی وہ شخص بچے کو سائیکل سے اتارنے بلکہ گھسیٹنے لگا تو میں نے اُن کے قریب پہنچ کر اُس شخص سے مخاطب ہو کر کہا، لگتا ہے آپ کے بیٹے کو سبزے نے کاٹا ہے۔سبزہ پانی کا سانپ ہے۔یہ درمیانی درجے کا زہریلا ہے لیکن اس کی کاٹ بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔اُس شخص نے میری طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا،تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ میرا بیٹا ہے اور اسے سبز رنگ کے سانپ نے کاٹا ہے؟ میں نے اُسے کوئی جواب دینے کی بجائے لڑکے پر توجہ دی جو باپ کے ہاتھوں سے زمین کی طرف ڈھلکا جا رہا تھا۔سانپ کی کاٹ دائیں پاؤں کے انگوٹھے کے پاس تھی۔کاٹ دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا لیکن بڑا تھا۔یعنی اس لڑکے کو بڑے سانپ نے کاٹا تھا۔اس لیے مریض کی زندگی کو خطرہ لاحق ہوسکتا تھا۔میں بھاگ کر اندر سے منکا لے آیا۔ زخم صاف کر کے منکا لگایا تو وہ زخم سے چپک گیا۔جو اس بات کی دلیل تھی کہ کاٹ زیادہ پرانی نہیں تھی اور زہر بدن میں زیادہ پھیلا نہیں تھا۔یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا وہ شخص محوِ حیرت مجھے یہ سب کچھ کرتے دیکھتا رہا۔منکا لگا کر میں نے اس شخص سے کہا،فکر کی کوئی بات نہیں آپ کا بچہ دس منٹ میں ٹھیک ہو جائے گا۔ اتنے میں باپو جو اس وقت جھرنے پر نہا رہے تھے واپس آگئے۔وہ اپنا پہلا سوال بھول کر باپو سے کہنے لگا، آپ کا بچہ بڑوں کی سمجھ بوجھ والا ہے۔اس نے جس چابکدستی سے میرے بیٹے کامران کو منکا لگایا، میں اس عمر کے بچے سے ایسی توقع نہیں رکھتا تھا اور اس نے زخم دیکھ کر ہمیں کاٹنے والے سانپ کا نام تک بتا دیا ہے۔ باپو نے مجھے پیار سے تھپکی دیتے ہوئے کہا، میرا رامو بڑا ذہین بچہ ہے۔یہ میری بتائی ہوئی ایک ایک ہدایت کو کسی تصویر کی طرح اپنے ذہن میں بٹھا کر کبھی نہیں بھُلاتا۔

یہ ماسٹر اسماعیل سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اپنے بیٹے کی جان بچانے پر وہ کچھ ضرورت سے زیادہ میرے ممنون ومشکور نظر آتے تھے۔انہوں نے باپو سے کہا کہ ایسے ذہین بچے کو سکول میں بھی تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔اگر اسے سکول میں داخل نہ کیا گیا تو یہ اپنے اندر کی ذہانت کو پوری طرح بروئے کار نہ لا سکے گا۔ ذہانت خداداد ہوتی ہے اور اس کا استعمال نہ کرنا کفرانِ نعمت میں شامل ہوتا ہے۔اس نے میرے کامران کی زندگی بچائی ہے۔اس نے نہ صرف مجھ پر بلکہ میرے تمام خاندان پر احسان کیا ہے۔پھر انہوں نے مجھے سکول میں داخل نہ کرانے کی وجہ پوچھی تو باپو نے بتایا کہ میرے لیے اس کو روزانہ سکول لے جانا اور

لانا ممکن نہیں۔ ماسٹر نے بتایا کہ ان کا چپڑاسی رام داس یہاں قریب ہی رہتا ہے وہ مجھے روزانہ اپنے ساتھ سائیکل پر سکول لایا اور لے جایا کرے گا۔ ان باتوں کے دوران کامران کے زخم سے منکا اُتر گیا تھا اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں استعمال شدہ منکا دواخانے کے اندر پانی والے جار میں رکھ کر واپس آیا تو کامران کو ہشاش بشاش دیکھ کر مجھے اندرونی مسرّت ہوئی اور اس خوشی کی اصل وجہ یہ تھی کامران میرا پہلا مریض تھا۔ اس سے پہلے میں نے کئی مریضوں کا علاج باپو کی زیرِ نگرانی کیا تھا۔ آج پہلی بار باپو کی غیر موجودگی میں مجھے اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا تھا۔ کامران کو ٹھیک ہوتا دیکھ کر میں نے اس کے والد کے چہرے پر اپنے لیے تشکر بھرے آثار صاف پڑھے۔ وہ باپو سے کافی دیر تک میرے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ ان کے جانے کے بعد باپو نے مجھے بلا کر کہا کہ کل سے تم سکول پڑھنے جایا کرو گے۔ ماسٹر کا چپڑاسی رام داس روزانہ صبح سات بجے اپنی سائیکل پر تمہیں لینے کے لیے آئے گا۔

دوسرے دن صبح سویرے چھ بجے سے تیار ہو کر میں رام داس کا منتظر تھا۔ رام داس پکی عمر کا کمزور لیکن بڑی توند والا آدمی تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے پوچھا، تمہارا نام راموہے۔ میں نے جواب دینے کی بجائے اپنی گردن ہاں میں ہلائی۔ اس نے مجھے اپنی سائیکل کے پچھلے بستر بند پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کی توند اتنی بڑی تھی کہ ڈنڈے سے آگے نکل کر سائیکل کے ہینڈل سے رگڑ کھا رہی تھی شاید اسی وجہ سے رام داس نے مجھے سائیکل کے بستر بند پر بیٹھنے کو کہا تھا۔ رام داس نے اس کے علاوہ مجھ سے سارے راستے کچھ نہیں کہا۔ سائیکل کے بستر بند پر میں نیم پختہ سڑک پر ہچکولے کھاتا ہوا سکول جانے والے راستے کا جائزہ لینے لگا۔

سڑک کے دونوں طرف چیل، کاؤ اور سندری کے درخت تھے اور درختوں کے درمیان دھندھل، پاسور، گرجان اور کانے کی گھنی گھنی جھاڑیاں تھیں۔ بہار کے موسم میں یہ جھاڑیاں رنگ برنگے پھول کھلا کر سندر بن میں آنے والے سیاحوں کا استقبال کرتی تھیں۔ سڑک کی مشرقی سمت دریائے گنگا کے بنائے ہوئے جزیرے تھے۔ یہ جزیرے مون سون کے تین مہینے دلدل بن جاتے تھے لیکن سال کے باقی نو مہینوں میں یہ گنگا کے دامن میں ایک خوبصورت قدرتی جھیل کی شکل میں ہوتے تھے۔ جہاں دور دراز سے لاکھوں کی تعداد میں سیاح اپنی سیاحت کی ابتدا کرتے تھے۔ جو سیاح اپنے بچوں اور گھر والوں کے ساتھ ہوتے تھے ان کی منزل یہی جھیل ہوتی تھی۔ جھیل کے آس پاس وہ اپنے پڑاؤ ڈال کر چند دن قیام کرتے اور پھر اپنی دنیا میں واپس چلے جاتے۔ جھیل کا پانی قسم قسم کی مچھلیوں، مگرمچھوں اور سانپوں کے علاوہ انواع واقسام کی مخلوق سے بھرا رہتا تھا۔ کچھ سیاح سندر بن کے اندرونی علاقے میں جاتے تھے۔ نوجوان اور تجربہ کار اور شکاری حضرات سندر بن کے اندرونی علاقوں کا نظارہ کرنے علاقائی راہبروں کی معیت میں جاتے تھے۔

سڑک کے مغرب کی جانب علاقائی لوگوں کے گھر تھے۔ ان کے بوڑھے، بچے اور عورتیں پٹ سن، کھجور، درختوں کی چھال اور بانس کی بنی ہوئی مصنوعات کے علاوہ علاقائی پھل اور جنگلی شہد سیاحوں کو بیچ کر اپنی گزراوقات چلاتے تھے۔ یہاں کے نوجوان زیادہ تر راہبر یا Tour Guide کے طور پر کام کرتے تھے۔ جو سیاحوں کو سندر بن کے اندرونی علاقوں کی سیر کراتے تھے۔ یہ نوجوان چھوٹے موٹے شکاریوں کا سامان خود ڈھوتے تھے۔ بڑے بڑے شکاری ان علاقوں میں نوجوانوں کے ساتھ ساتھ خچر بھی کرائے پر لے جاتے تھے۔ شوقین شکاری یہاں عیاشی کے لیے بھی کافی تعداد میں اپنی داشتائیں یا حرم لے کر آتے تھے۔ علاقے کے لوگ ان کا سامان اپنے خچروں پر لادتے تھے۔ ان کے لیے شکار کھیلتے تھے اور مارا ہوا شکار اُنہیں پکا پکا کر کھلاتے بھی تھے۔ شوقین شکاریوں میں زیادہ تر نوابین، راجا اور بڑی بڑی ملوں کے مالکین کے علاوہ سیاسی شخصیات ہوتی تھیں۔

علاقائی راہبر سندر بن میں داخل ہونے اور سیاحوں کا سامان خچروں پر لادنے سے پہلے چند سکے بنوں بی بی کے ڈیرے پر دان ضرور کرتے تھے۔ بنوں بی بی سندر بن کے جنگلوں کی دیوی ہے۔ ایک روایت کے مطابق ابراہیم نامی ایک مالدار شخص کی ایک خوبصورت بیوی تھی مگر وہ خود اولاد پیدا کرنے کی قابل نہ تھی۔ ابراہیم اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اداس رہتا تھا۔ خاوند کو خوش کرنے کے لیے اس نے ابراہیم کو دوسری شادی کرنے کی اجازت دے دی۔ ابراہیم کی دوسری بیوی کا نام گل لعل بی بی تھا۔ لعل بی بی حاملہ ہوگئی تو ابراہیم کا جھکاؤ فطری طور پر اپنی نئی بیوی کی طرف ہو گیا۔ پہلی بیوی نے حسد کی وجہ سے قسم کھائی کہ وہ جب تک لعل بی بی سے نجات حاصل نہ کرے گی اپنے خاوند کے ساتھ ہم بستری نہیں کرے گی۔ ایک رات اس نے لعل بی بی کے کھانے میں زہر ملا دیا۔ لعل بی بی بے ہوش ہوگئی تو پہلی بیوی نے اس کو مردہ سمجھ کر اپنے نوکروں کی مدد سے سندر بن کے جنگلوں میں پھینکوا دیا۔ زہر کا اثر زائل ہونے کے بعد لعل بی بی کی آنکھ کھلی تو اس کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔ اُس نے خدا سے اپنے لیے دعا مانگی اور صبر اور شکر سے اپنی زندگی سندر بن میں گزارنے لگی۔

اِسی دوران اس کے دو جڑواں بچے ہوئے۔ ایک لڑکا جس کا نام اس نے شاہ جنگلی اور لڑکی کا نام بنوں بی بی رکھا۔ بچوں کو جنم دینے کے بعد لعل بی بی کی حالت خراب ہونے لگی تو اس نے خدا سے اپنے بچوں کی پرورش کے لیے التجا کی۔ خدا نے اس کی دعا قبول کر کے ایک پری کو آسمان سے ان کی پرورش کے لیے اتارا۔ پری نے لعل بی بی کے مرنے کے بعد دونوں بچوں کی پرورش کی۔ بنوں بی بی نے اپنی ساری زندگی سندر بن کے جنگلوں میں خدا کی ریاضت کرتے ہوئے گزار دی۔ عبادت کے صلے میں خدا نے بنوں بی بی کو دیوی کے درجے پر فائز کیا اور سندر بن کے تمام جانوروں کو بنوں بی بی کی اطاعت کا حکم دیا۔ اسی لیے سندر بن کے تمام جانور آج تک بنوں بی بی کے نام کا احترام کرتے ہیں اور اس کے نام پر دان دینے والے سندر بن کے جانوروں کی زد سے محفوظ رہتے ہیں۔ بنوں بی بی کے آستانے کو بنوں بی بی کا ڈیرہ بولتے ہیں اور وہاں رہنے والے شاہوں کو ڈیرہ

وال بولا جاتا ہے۔ پاکستان کے صوبہ سرحد کے شہر بنوں کا نام بھی سندر بن کی دیوی کے نام پر رکھا گیا تھا۔

میں انہی خیالات میں نہ جانے کب تک کھویا رہتا اگر رام داس اپنی سائیکل روک کر مجھے سکول پہنچنے کی نوید نہ سناتا۔ گھر سے سکول پہنچنے تک ہمیں دس منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگا ہوگا۔ یہ سکول میں میرا پہلا دن تھا۔ سکول کی عمارت انگریزی زبان کے بڑے حرف ای (E) جیسی تھی۔ ای کی درمیان والی ٹانگ میں ہیڈ ماسٹر کا دفتر تھا، اس کے ساتھ سکول کے واحد کلرک کا کمرہ تھا اور شمالی بلاک میں پرائمری سکول تھا اور جنوبی سمت میں مڈل سکول تھا۔ رام داس کے ساتھ میں ہیڈ ماسٹر اسماعیل صاحب کے کمرے میں داخل ہوا۔ ہیڈ ماسٹر چھوٹی قد وقامت کے مالک تھے اور تقریباً چالیس کے پیٹے میں ہوں گے۔ وہ بجنی غلی کے اکلوتے مڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ سکول پہلی جماعت سے آٹھویں جماعت تک تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اپنے بچوں کے ساتھ سکول سے ملحقہ کواٹر میں رہتے تھے۔

ماسٹر اسماعیل مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ بڑی شفقت سے مجھے گلے لگایا اور بولے تمہارے داخلے کا فارم پُر کرنے کے بعد میں تمہیں اپنے کواٹر لے جاؤں گا۔

انہوں نے اپنے آگے رکھی ہوئی میز کی دراز سے سکول میں داخلے کا فارم نکالا اور اسے پُر کرنے کے لیے مجھ سے پوچھنا شروع کیا:

تمہارا پورا نام۔

رامو۔

رامو سے پہلے یا آخر میں کچھ ہے۔

مجھے نہیں معلوم۔

تاریخ پیدائش۔

مجھے نہیں معلوم۔

گھر کا پتہ۔

مجھے نہیں معلوم۔

مذہب۔

مجھے نہیں معلوم۔

میرے ان جوابات پر وہ مسکرائے اور مجھے کہا، چونکہ علاقائی لوگ تمہارے باپو کو شان جی کے نام سے جانتے ہیں اس لیے میں نے تمہارا خاندانی نام شان لکھا ہے اور باقی خانہ پری بھی اپنی طرف سے کر دی ہے۔ پھر بولے، اچھا اب میرے ساتھ چلو۔ وہ مجھے اپنے رہائشی کواٹر میں لے گئے۔ ان کی بیوی بھاری جسامت کی خاتون تھیں ان کا نام آمنہ تھا۔ انہوں نے اپنی بیوی سے میرا تعارف کرایا۔ میرا نام سن کر وہ بجلی کی طرح مجھ پر جھپٹ کر میری بلائیں لینے لگیں۔ وہ مجھے پیار کرتی جاتیں اور رو رو کر کہتی جاتیں کہ میں نے ان کے اکلوتے بیٹے کی جان بچا کر ان پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ میں ان کے گھر کو اپنا گھر سمجھوں اور جب جی چاہے ان کے ہاں بغیر کسی جھجک کے آجایا کروں۔ ہر روز ظہرانہ بھی ان کے گھر کیا کروں۔

کواٹر سے واپسی پر انہوں نے گھنٹی بجا کر رام داس کو طلب کر کے کہا کہ مجھے جسونت سنگھ کی کلاس میں بٹھا آئے۔ جسونت سنگھ سکول میں میرا پہلا استاد تھا۔ اس کی آواز بڑی گرجدار تھی لیکن جسامت لچکدار تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھا اردو کے حرف ح کی طرح مڑا تڑا لگتا تھا۔ شاید اسے میرے آنے کی اطلاع پہلے سے تھی اس لیے اس نے میری آمد پر کسی قسم کی توجہ نہیں دی۔ اس کے بعد میں روزانہ بلا ناغہ رام داس کے ساتھ سکول آنے جانے لگا۔ سکول کے چھ سالوں کے دوران میں ساتویں جماعت میں آ گیا تھا اور اپنے سکول کے ہوشیار طلباء میں شمار ہونے لگا تھا۔ وقت اپنی رفتار سے گزرتا رہا۔ مجھے سکول جاتے ہوئے تقریباً آٹھ سال گزر چکے تھے۔

گرمیاں اپنے آخری سانس لے کر خزاں کی آمد کا اعلان کر رہی تھیں اور سندر بن کے سیاحوں میں حسبِ معمول کمی آ رہی تھی۔ گرمیوں کی چھٹیاں گزرنے کے بعد سکول شروع ہو چکا تھا۔ میں آٹھویں جماعت میں پڑھ رہا تھا اور شاید میری عمر اس وقت کوئی چودہ پندرہ برس کے لگ بھگ ہو گی۔ ایک روز میں اپنی کلاس میں بیٹھا تھا کہ سکول کے سامنے ایک کالی موٹر آ کر رُکی۔ ڈرائیور سیدھا ہیڈ ماسٹر کے دفتر گیا۔ کچھ دیر بعد رام داس میری کلاس میں آیا اور مجھے اپنے ساتھ چاچو کے دفتر لے گیا۔ میں رام داس کی معیّت میں چاچو کے دفتر داخل ہوا جہاں ڈرائیور دفتر کے شمالی کونے میں پڑی ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔

چاچو نے مجھے بتایا کہ میں اس ڈرائیور کے ساتھ ابھی اور اسی وقت گھر جاؤں۔ باپو کو میری سخت ضرورت ہے۔ ساتھ ہی وہ میری پریشانی کو بھانپ کر کہنے لگے، فکر کی کوئی بات نہیں تمہارے باپو بالکل ٹھیک ہیں۔ انہیں ایک مریض کے سلسلے میں تمہاری مدد درکار ہے۔ مجھے اچنبھا اس بات کا تھا کہ باپو کو آخر میری کیا ضرورت پڑ گئی ہے۔ سانپوں کے سلسلے میں باپو کا تجربہ میری عمر سے بھی کئی گنا زیادہ تھا۔ بیٹے جلدی کرو اور ڈرائیور کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر جاؤ، میرے خیالات میں ڈوبنے سے پہلے ہی چاچو کی آواز ایک بار پھر میرے کانوں میں پڑی۔ میں کوئی بات کئے بغیر موٹر کی طرف بڑھا۔ ڈرائیور نے میرے لیے موٹر کا پچھلا دروازہ کھولا۔ یہ کسی موٹر میں بیٹھنے کا میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ موٹر کے سامنے والے شیشے کے علاوہ تمام شیشے اندھے تھے۔ یعنی موٹر کے اندر بیٹھ کر باہر کا نظارہ صاف ہوتا تھا لیکن باہر سے اندر کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میرے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے موٹر آگے بڑھائی اور اس کے ساتھ ہی مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا، میں راجہ رمیش جی کا ذاتی ڈرائیور ہوں۔ راجہ صاب کی نئی رانی جی کو جھیل کے کنارے کپڑے بدلتے ہوئے سانپ نے کاٹا ہے اس لیے تمہارا جانا ضروری ہے۔ میں اس سے کہنے والا تھا کہ باپو جیسے شان کی موجودگی میں میری کیا حیثیت ہے۔ لیکن میری بات زبان پر آنے سے پہلے ہی ہم منزل پر پہنچ چکے تھے۔ سکول سے گھر تک کا جو سفر سائیکل پر

ہم دس منٹ میں کرتے تھے وہ موٹر نے پل جھپکتے میں طے کیا تھا۔

میں موٹر کا دروازہ کھولنے کی ناکام کوشش میں مصروف ہی تھا کہ ڈرائیور نے میرے لیے دروازہ کھول کر میری مشکل حل کر دی۔ میں نے بھاگ کر اوپر جا کر دیکھا کہ باپو کے ساتھ کچھ اور مرد اور عورتیں جھونپڑی سے باہر کھڑے تھے۔ باپو نے میری طرف اشارہ کر کے ایک موٹے لمبے تڑنگے اور سانولے رنگ کے بڑی بڑی سفید موچھوں والے ادھیڑ عمر کے آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، یہ میرا راموہے مہاراج۔ جس آدمی کو باپو نے مہاراج کہہ کر مخاطب کیا تھا، نے سر پر تاج نما پگڑی باندھی تھی اور سنہری جھالروں والا کرتا اور پاجامہ پہنا تھا۔ اس کے گلے میں موتیوں کی کئی مالائیں تھیں اور اس کی کلائیوں میں سونے کے کڑے تھے۔ راجہ نے اپنی موٹے موٹے شیشوں والی عینک کے پیچھے سے میری طرف بڑے غور سے دیکھا اور مجھے اپنی آنکھوں سے سر سے پاؤں تک تول کر کہنے لگا، ہاں یہ بچہ ٹھیک ہے۔ تم اسے اندر بھیج سکتے ہو۔ راجہ کی آواز گرجدار لیکن پوپلی تھی۔ گو راجہ کے منہ میں دانت دکھائی ضرور دیتے تھے اس کے باوجود ان کی آواز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بولتے وقت اپنی بتیسی کو گرنے سے بچانے کی فکر میں زیادہ رہتا ہے۔ باپو نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا، رانی جی کو سانپ نے کاٹا ہے۔ وہ جھونپڑی کے اندر ہیں۔ کاٹ منکا ٹھہرنے کی جگہ پر نہیں ہے اس لیے میں نے تمہیں بلایا ہے۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اور باپو سے کچھ اور پوچھے بنا میں جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔ اندر ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکی اور اس کے ساتھ ایک بڑی عمر کی عورت کھڑی تھی۔ میں عورت کی طرف بڑھا تو اس نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ جیسے کہہ رہی ہو، رانی جی وہ ہیں۔ لڑکی اپنی عمر کے لحاظ سے مہاراجہ کی پوتی یا نواسی کی ہم عمر لگتی تھی۔ لڑکی کا جسم بھرا بھرا تھا جبکہ اس کا رنگ کالا سیاہ تھا اور اس نے سفید براق ساڑھی پہن رکھی تھی۔ ساڑھی پر اس نے سنہری کام والا سفید رنگ کا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ کالی جوانی پر سفید کپڑوں کا یہ سنگم مجھے اچھا لگا۔

اس کی آنکھوں سے سانپ کی کاٹ کا درد صاف عیاں تھا۔ اس کے کالے کالے ہونٹ سانپ کے زہر کے زیرِ اثر ہولے ہولے ایسے کپکپا رہے تھے جیسے بادِ صبا سے کالے گلاب کے پھول کھیل رہے ہوں اور اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے پنکھڑیوں پر تیرتی ہوئی شبنم کی یاد دلا رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے لیے کھڑا رہنا مشکل ہو رہا تھا تو میں نے اسے اپنے قریب پڑے ہوئے تختہ پوش پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ تخت پوش پر بیٹھی تو میں نے اس سے سانپ کی کاٹ کے بارے میں پوچھا۔ اس نے شرماتے ہوئے اپنی داہنی چھاتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑی معصومیت سے کہا، یہاں۔ میں نے اسے سانپ کی کاٹ پر سے کپڑا ہٹا کر دکھانے کو کہا تو شرماتے ہوئے پہلے اس نے وہاں موجود عورت کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ وہاں سے اجازت ملنے پر اس نے اپنے اوپر کے تمام کپڑے اتار کر ساتھ والی عورت کے حوالے کیے اور اپنی آنکھیں بند کر کے میری جانب رُخ کے ساکت بیٹھ گئی۔

## غم کدے سے نکل کر

**پروین شیر کے لئے**

**یوگیندر بہل تشنہ**

اشکبار،
غم کدے سے نکل کر
رُکتے رُکتے، ٹھہرتے
خلوت کدے کی جانب
کشتیِ حیات ہے رواں
مجھ پر کُھلا، دل ذرا ٹھہرا گیا،
اسقدر حسین و جمیل، ہوگی زندگی
جہاں میں
خود میں گم، سرگرداں ہوں
محوِ تلاش اپنی ہی تلاش ہے مجھے
کہ یہ لامتناہی جہانِ آرزو
ماورائے تشنگیاں، کچھ بھی نہیں
کچھ بھی تو نہیں
یہاں کہاں میں ٹھہر گئی
یہ تو میری منزل نہیں ہے
کہ میرے اس موقلم کو
اک نئی سپاٹ کینوس پر ہے
ابھی نقش کرنا
نگار خانہ ہستی کے لیے
وہ نگارش
جو مجھے لے جائیگی
اس جہانِ آرزو کی تشنگیوں
سے پرے،
اُس جہانِ لا آرزو پہ،
جہاں،
یہ رشتوں کا جنگل اور اِن سے
منسلک باہمی تعلق سارے
ہوں گے
ایک لایعنی حقیقت
میں کہاں اِس، رہ گزر پر رُک گئی ہوں،
میں کہاں ٹھہر گئی ہوں
میری یہ منزل نہیں ہے
میری منزل تو ہے
لا آرزو ہونا
میں بناؤں گی، نگار خانہ ہستی کے لیے، اک نئی نگارش

خاکہ

# ماں جایا

رینو بہل
(چنڈی گڑھ، بھارت)

سال میں شاید آٹھ مہینے میری اُس سے بات چیت بند رہتی تھی۔ اس وقت کسی بات کا جواب دینا ضروری ہوتا تو گھر کے تیسرے فرد کا کام بڑھ جاتا۔ بول چال وہ نہیں میں بند کرتی تھی۔ وہ تو کبھی مجھ سے ناراض ہوتا ہی نہیں تھا یہ تو میں ہی تھی جو اس کی ہر چھوٹی چھوٹی بات سے چڑ جاتی اور پھر اس کا مجھے چڑانا، مسکراتے جانا، ہنستے جانا آگ میں گھی کا کام کرتا۔ میں آخری ہتھیار استعمال کرتی اور اُس سے کلام کرنا بند کر دیتی۔ مجھے سکون محسوس ہوتا تو باقی گھر والے سر پکڑ کر بیٹھ جاتے کیونکہ وہ جانتے تھے اب یہ ناراضگی لمبی چلے گی اور سب میں بیٹھ کر بھی دونوں اجنبیوں کی طرح بیٹھے رہیں گے مگر اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ اس دوران میں اُس سے لاتعلق رہتی یا اُس کی فکر نہ ہوتی۔ خفا بھی میں ہوتی، غصّہ بھی میں کرتی، جھگڑا بھی میں کرتی، اُسے جلی کٹی کراری کراری سناتی بھی میں اور اتنا کچھ ہونے کے بعد خوشامد بھی وہ کرتا، منّتیں بھی وہ کرتا اور آخر میں مناتا بھی وہ ہی۔ ہمارے رشتے کی بنیاد ہی شاید جھگڑے سے پڑی تھی۔ میرا اُس سے کوئی خون کا رشتہ نہیں تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ وہ رشتہ خون کے رشتوں سے زیادہ مضبوط، زیادہ خوبصورت زیادہ پائیدار ہو گیا۔

جب پنکی ہمارے گھر پہلی بار آیا تھا اُس وقت میری عمر بارہ سال کی تھی۔ وہ مجھ سے دو سال بڑا تھا مگر ناٹا قد اور دُبلا ہونے کی وجہ سے دیکھنے میں چھوٹا لگتا تھا۔ سارا دن نیکر پہن کر محلے کے لڑکوں کے ساتھ سائیکل پر گھومتا رہتا یا محلے کے بیچ و بیچ بنے دودھ کے بوتھ پر لڑکوں کے ساتھ بیٹھا مستی کرتا کبھی گلی ڈنڈا تو کبھی کنچے کھیلتا رہتا۔ مجھے وہ چھچھورا لگتا تھا۔ اُس محلے میں ہم نئے نئے آئے تھے مگر میری ماں کا اُن کے گھر آنا جانا پہلے سے ہی تھا۔ اُس کی جی جی لڑکیوں کو سلائی سکھاتی تھیں اور کپڑے بھی سیتی تھیں۔ ہمارے فراک کے نئے نئے ڈیزائن ماں اُن سے ہی بنواتیں۔ چار بہن بھائیوں میں وہ سب سے چھوٹا تھا اور اکثر اپنی جی جی کے اردگرد ہی منڈلاتا رہتا۔ مجھے نہیں معلوم کب اور کیسے میری ماں نے آنٹی سے ''چائی جی'' کا سفر کتنے عرصے میں طے کیا مگر یہ ضرور یاد ہے کہ جب اُس نے ہمارے گھر آنا شروع کیا تو وہ ماں کو ''چائی جی'' کہہ کر بلاتا تھا۔ وہ پہلے ہماری ماں کا بیٹا بنا پھر ہمارا بھائی۔

جس گھر میں پھل دار درخت لگے ہوں اور اُس پیڑ کی رکھوالی کرنے والا صرف ایک شخص ہو تو منچلوں کی نظریں کچے پھلوں کو دیکھ کر للچانے لگتی ہیں اور کہیں نہ کہیں سے اُس آنگن میں پتھر ضرور آن پڑتا ہے۔ پھر کچھ یوں ہوا کہ میری جوانی کی طرف بڑھتے قدم بھی کچھ منچلوں کی آنکھوں میں چمک کا باعث بننے لگے۔ وہ بات کرنے کا بہانہ تلاش کرنے لگے، قریب آنے کی کوشش کرنے لگے۔ پنکی کو جب اس کی بھنک پڑی تو وہ ڈھال بن کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے سے بڑے، اپنے سے تگڑے لڑکوں سے بھی دشمنی مول لے لی۔ اُس وقت اُس نے اپنے کمزور چھوٹے سے وجود کی بھی پرواہ نہیں کی اور بحث سے شروع ہوئی بات ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ خود ہی اُس نے سارا فساد نپٹا دیا، نہ بابا کو اور نہ ہی ہمیں اس بات کی بھنک پڑنے دی۔ بس ہمیں ڈانٹ کر آئندہ احتیاط کرنے کو کہا تو لڑکوں کو خبردار کرتے ہوئے کہا:

''اگر کسی نے اس گھر کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھا تو اچھا نہیں ہوگا۔''

''کیوں بے تیری بہنیں لگتی ہیں کیا؟'' کسی نے چھیڑ دیا۔

''ہاں۔ میری بہنیں ہی ہیں۔''

اُس روز گھر آتے ہی اُس نے ماں سے کہا:

''چائی جی کیا میں آپ کا بیٹا نہیں؟''

''بیٹا ہی تو مانتی ہوں تمہیں۔ کیوں کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔ ان چاروں کو سمجھا دو بڑے بھائی کا کہنا ماننا چاہیے۔''

اس نے ناراضگی سے منہ پھُلا کر کہا۔

''ماں اِسے کہہ دو مجھ پر رُعب ڈالنے کی ضرورت نہیں۔''

میں خاموشی سے اُن کی باتیں سُن رہی تھی کہ مجھ سے بنا بولے رہا نہیں گیا۔

''بڑا ہے۔ سُن لو کیا کہنا چاہتا ہے۔''

''میرا کوئی بڑا وڑا نہیں۔ میں نہیں مانتی اسے بڑا۔'' میں غصے سے ہاتھ ہلاتی ہوئی وہاں سے اُٹھ کر اندر چلی گئی۔ میری بات سُن کر اُس کا چہرہ اُتر گیا تھا۔ ماں اُسے بڑی دیر تک دلاسے دیتی رہی۔

رکشا بندھن والے دن وہ صبح سویرے ہی تیار ہو کر ہم سب بہنوں سے راکھی بندھوانے آ گیا۔ جب بھی رکشا بندھن اور بھائی دوج کا دن آتا تو دل میں کہیں ٹھیس سے اُٹھتی تھی، اپنی محرومی کا شدت سے احساس ہوتا تھا مگر میں اُسے راکھی باندھنے کو تیار نہیں تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ یہ وقتی اور جذباتی فیصلہ ہے اُس کا۔ ایک دو بار راکھی بندھوالے گا پھر یہ رسم بھی ختم کر دے گا۔ وہ اپنی بات پر اڑا رہا اور اُس کی ضد اور ماں کے اصرار پر میں نے اس بوجھل من سے راکھی کو صرف ایک رسم سمجھ کر اُس کی کلائی پر باندھ دی۔ میرے بعد چھوٹی بہنوں سے پھر اس نے راکھی بندھوائی۔ کلائی راکھیوں سے بھر گئی جسے دیکھ وہ دل کی خوشی چھپا نہ سکا۔ اس راکھی سے وہ محلے کے لڑکوں کو منہ توڑ جواب دینا چاہتا تھا۔ جو رشتہ میں نے بے دلی سے جوڑا تھا اس کی جڑیں وقت کے ساتھ گہری بہت گہری اور مضبوط ہوتی چلی گئیں اور

میں یہ بھول گئی کہ وہ میرا منہ بولا بھائی ہے ماں جایا نہیں۔

کوئی بھی رشتہ بنانا جتنا آسان ہوتا ہے نبھانا اُتنا ہی مشکل۔ رشتے میں پختگی کے لیے اعتماد لازمی جُز ہے جو آسانی سے جھولی میں آ کر نہیں گرتا۔ اُسے اعمال سے کمانا پڑتا ہے۔ چار لڑکیوں والے گھر میں کسی لڑکے کا ہر روز آنا آس پڑوس کے لوگوں، محلے والوں، رشتے داروں سے آسانی سے ہضم نہیں ہوا تھا۔ بہت سی انگلیاں بھی اٹھیں، غلاظت بھری نظروں کو پاکیزگی کہاں نظر آتی ہے۔ اس وقت ہمارے والدین ہماری ڈھال بن کر کھڑے ہوگئے۔ بابا کہا کرتے تھے ''دنیا دو دھاری تلوار ہے۔ کسی کو جینے نہیں دیتی۔ لوگ بولتے ہیں بولنے دو۔ کسی کو تم جواب دہ نہیں۔ سب سے پہلے خود اپنے آپ کو ہو۔ جب رب کے سامنے سچے ہو تو دنیا کا کیا ڈر۔''

جب نیت سچی ہو، لگن پکی ہو اور ارادے مضبوط ہوں تو راستے کی رُکاوٹیں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ دھیرے دھیرے میرے ننھیال ددھیال والوں نے بھی اُسے گھر کا بڑا بیٹا قبول کرلیا۔ بڑا وہ تینوں چھوٹی بہنوں کے لیے تھا میرے لیے وہ بڑا ہو کر بھی چھوٹے بھائی جیسا ہی تھا۔ اپنے گھر میں سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے سب کا حکم اُسے ماننا پڑتا اور ہمارے یہاں سب سے بڑا ہونے کے سبب سب اُس کے پیچھے ''بھیّا بھیّا'' کہتی پھرتی، سوائے میرے۔

کالج جاتے ہی اُسے پر لگ گئے تھے۔ پڑھائی کم اور دوستوں کے ساتھ موج مستی، مٹر گشتی زیادہ۔ ان فضول مصروفیات کے باوجود آتے جاتے گھر کا چکر ضرور لگ جاتا۔ گھر میں گھُستے ہی سب سے پہلے ''چائی'' ''چائی'' کہتا ماں کو تلاش کرتا پھر بعد میں سب کی باری آتی۔ ماں کب اُس کی ''چائی جی'' سے صرف ''چائی'' بن گئی پتا ہی نہیں چلا۔ تھوڑی دیر کے لیے آتا مگر سب کی خبر رکھتا۔ کون کس سہیلی کے یہاں گئی، کیوں گئی، کتنی دیر کے لیے گھر سے باہر رہی سب پر اُس کی نظر ہوتی۔ اُس کی غیر موجودگی میں احساس ہوتا کہ دو آنکھیں سب پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ درمیانہ قد، دُبلا جسم، سانولی رنگت، کشادہ پیشانی، چوکس بڑی بڑی آنکھیں اور مونچھے گھنی اور بڑی جنہیں وہ مروڑ مروڑ کر خم ڈالتا رہتا۔

چہرے پر سنجیدگی کی پرت چڑھی رہتی جیسے مسکرانے پر ٹیکس لگتا ہو۔ کم گو تو وہ تھا ہی اور ساتھ میں بہت کم لوگوں سے بات کرتا تھا۔ گھر میں کوئی باہر کا اگر پہلے سے بیٹھا ہوتا تعارف کے بعد چاہے وہ کتنی ہی گرم جوشی سے ملتا وہ اپنے مخصوص انداز میں سرد مہری سے رسماً دعا سلام کرتا اور آگے بڑھ جاتا۔ ہمارے جاننے والوں کو اُس کے اس رویہ سے اکثر گلہ رہتا اور کئی مرتبہ خود کو بھی شرمندگی محسوس ہوتی۔ مہمان کے چلے جانے کے بعد لڑائی بھی ہو جاتی مگر عادتیں کہاں جاتی ہیں۔ اگلی بار پھر وہی ہوتا۔ ایک اور عادت اُس کی یہ تھی کہ اگر ایک بار کسی کی کوئی بات بُری لگی تو وہ اُس سے سارے تعلق توڑ لیتا تھا۔ لاکھ اچھا بن کر دوبارہ وہ شخص سامنے آ جائے دوبارہ رشتہ نہیں رکھتا۔ جو دل سے اُتر گیا سو اُتر گیا۔

کالج پہنچتے ہی اُس نے چوری چھپے سگریٹ پینا شروع کر دیا اور نوکری پر لگنے کے بعد وہ کبھی کبھی شراب بھی پینے لگا۔ جی جی، باؤجی، ماں بابا سب نے اپنے اپنے طریقے سے سمجھانے کی لاکھ کوشش کی مگر کسی کے سمجھائے کوئی سمجھا ہے آج تک۔ جب تک عیب پردے میں تھے بڑوں کا خوف تھا مگر جب بات کھُل گئی تو پکڑے جانے کا ڈر بھی ختم ہو گیا۔ رہی سہی کسر دیوالی کے دنوں میں پوری ہوگئی۔

ایک دن صبح کام کے لیے نکلا اور ساری رات گھر نہیں لوٹا۔ صبح سویرے ہی اچانک جی جی باؤجی ہمارے گھر پوچھنے آئے کہ ہم کو تو بتا کر نہیں گیا۔ وہ رات ماں باپ نے نہ جانے کیسے انگاروں پر لوٹتے کاٹی ہوگی جو صبح پو پھٹنے کا انتظار بھی نہ کر سکے۔ ان دنوں موبائل تو دور ٹیلی فون بھی عام نہیں ہوتے تھے۔ دونوں گھروں میں پریشانی پسر گئی۔ ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچے تھے کہ پولیس میں رپورٹ کرائی جائے یا کسی دوست سے پوچھا جائے یا اسپتال کے چکّر لگائے جائیں کہ تبھی پتا چلا کہ جناب لوٹ آئے ہیں۔ بہانہ تو دوست کے ایکسیڈنٹ کا تھا پر سب جانتے تھے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ بعد میں پتا چلا کہ دوستوں کے ساتھ پینے بیٹھا تھا کہ تاش کا دور شروع ہو گیا۔ شراب اور جوا رات بھر چلتا رہا۔ ہار جیت کے جال میں رات بھر اُلجھتا رہا پھنسا رہا۔ اس حالت میں وہ گھر نہیں لوٹ سکتا تھا لہٰذا رات دوستوں کے یہاں ہی گزاری۔ جی جی باؤجی نے اپنی ناراضگی کا اظہار خاموشی اختیار کر کے کیا۔ ماں نے ڈانٹا، بابا نے پیار سے سمجھایا اور میرے ساتھ بحث کے بعد لڑائی اور اُس کے بعد کئی مہینے بول چال بند۔

گھوڑا جب سرکش ہو کر دوڑنے لگے تو اُسے لگام ڈالنا لازمی ہو جاتا ہے۔ والدین نے جلد سے جلد اُسے شادی کے بندھن میں باندھنے کا فیصلہ کر لیا اور وہ چاہتا تھا کہ پہلے بہنوں کے ہاتھ پیلے ہو جائیں مگر سنجوگ تھا کہ بہنوں کا گھر بستا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ماں بابا میری شادی کو لے کر پریشان تھے۔ ایک روز جی جی نے ماں بابا کی پریشانی دیکھتے ہوئے کہا:

''بھائی صاحب آپ وپن کا اپنے گھر آنا بند کر دیں''

''کیوں؟ آپ کو کوئی اعتراض ہے اس میں؟'' ماں نے حیران ہو کر پوچھا:

''نہیں نہیں ایسی بات نہیں۔ وپن کے باؤجی اور میں سوچ رہے تھے کہ جدھر بھی بیٹی کی شادی کی بات چلتی ہے بات سرے کیوں نہیں چڑھتی۔ کیا اس کی وجہ وپن تو نہیں؟''

''مطلب؟''

''اب ہمارا بیٹا تو سولا کلا سمپورن ہے اور اُس کا آپ کے گھر آنا جانا کسی سے چھپا تو نہیں۔ لوگوں کی سوچ پر آپ روک تو نہیں لگا سکتے؟''

دیکھیے بہن جی اگر اس وجہ سے کوئی رشتہ نہیں کرنا چاہتا تو نہ کرے۔ جس جگہ میری بچیوں کا سنجوگ ہوگا وہاں رشتہ ہو ہی جائے گا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نئے رشتے جوڑنے کی خاطر پُرانے رشتے توڑ دیئے جائیں۔

''تو پھر آپ ایک اور کام کریں''
''وہ کیا؟''
''اسے شادی کے لیے راضی کرا دیں۔ہم نے ایک دو لڑکیاں دیکھ رکھی ہیں۔ہوسکتا ہے اُس کی شادی کے بعد ادھر بھی بچیوں کی شادی کا کام بن جائے۔''
''اسے بابا کی بات جلدی سمجھ آتی تھی۔ بابا نے اُسے راضی کر لیا تھا۔''
میں اُسے اکثر کہتی تھی:
''تجھے ایسی بیوی ملنی چاہیے جو پل پل تیرے آنے جانے کا حساب رکھے اور تجھے اپنی انگلیوں پر نچائے''
''میں انگلیوں پر ناچنے والا نہیں ہوں البتہ نچانے والا ضرور ہوں''
''شادی سے پہلے سبھی ایسے کہتے ہیں۔''
''میں اُن میں سے نہیں۔دیکھ لینا''
''دیکھ لیں گے۔''

دل کے کسی کونے میں ایک خوف بھی تھا کہ نہ جانے آنے والی ہمارے رشتے کو قبول کرے گی یا نہیں۔بدمزاج ہوئی تو بچپن کے رشتے ٹوٹ نہ جائیں مگر شادی کے بعد یہ خوف بھی دل سے نکل گیا۔ پنکی نے شادی کا فیصلہ جی جی پر چھوڑ رکھا تھا۔ چوپال کی خوبصورت پہاڑیوں میں بسنے والی پڑھی لکھی مگر سیدھی سادی، درمیانہ قد، تیکھے تین نقش، مکھن میں ملے سندور جیسی رنگت اور اکہرے بدن والی، کچھ گھبرائی کچھ شرمائی سی، کچھ بوکھلائی سی لڑکی پہلی ہی نظر میں اُسے بھا گئی۔ نہ لڑکی سے کوئی بات کی نہ کچھ پوچھا اور جھٹ سے ہاں کر دی۔ شادی کی تاریخ پکی کر کے واپس لوٹ آئے۔ اس سے ہمیں کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی اس کے چہرے پر خوشی کی دمک نے سب بنا پوچھے ہی بتا دیا تھا۔

سوعیب ہونگے اُس میں مگر لڑکیوں سے وہ کوسوں دور بھاگتا تھا۔ وہ تو جس لڑکی کو چاہتا تھا جو اس کا پہلا پیار تھی۔ اسے دور سے ہی دیکھتا بات کرنے کا موقع تلاش کرتا رہا، اپنی کتابوں کے ہر صفحہ پر اس کا نام لکھتا رہا مگر کبھی دل کی بات اُسے کہنے کا حوصلہ نہ جٹا پایا۔ دل کی دل ہی میں رہ گئی اور وہ ڈولی میں بیٹھ کر کسی اور کی دُنیا سجانے چلی گئی۔

پنکی کی شادی میں اُس کے گھر اور سُسرال سے ہمیں وہ ہی مان عزت رُتبہ ملا جو سگی بہنوں کو ملتا تھا۔ بہت جلد بھابی سب سے گھل مل گئی۔ بڑی نیک، فرمانبردار اور ضرورت سے زیادہ سادہ طبیعت۔ اتنی سادہ کی تو اُس نے خواہش بھی نہیں کی تھی اور اُسے ضرورت بھی کچھ تیز طرار ساتھی کی تھی جو اُس کے ڈھیلے پیچ کس کر رکھتی مگر جوڑیاں تو آسمانوں سے بن کر آتی ہیں۔ حقیقت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اگر تیز طرار ہوتی تو شاید ہم لوگوں کا رشتہ وہیں دم توڑ دیتا مگر اوپر والے نے تو زندگی بھر کا ساتھ لکھا تھا اس لیے ایک مضبوط کڑی کے روپ میں اُسے بھیج دیا۔ بھابی کی سادہ طبیعت کا یہ عالم تھا کہ شروع شروع میں وہ جان بوجھ کر گھر دیر سے جاتا کہ بیوی دیر سے آنے کا گلہ کرے گی، سبب پوچھے گی مگر اُس نے کبھی کچھ کہا ہی نہیں کبھی کچھ پوچھا ہی نہیں۔ وہ جان بوجھ کر سگریٹ اس کے سامنے زیادہ پیتا کہ وہ اُسے ٹوکے، اُسے روکے، قسم دے کر سگریٹ کو ہاتھ نہ لگانے کا وعدہ لے لے۔ پر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ شادی سے پہلے وہ کبھی کبھی گھر سے باہر کسی پارٹی یا بیاہ شادی میں شراب پیتا تھا۔ اب اُس نے والدین سے چھپ کر اپنے کمرے میں شراب پینی شروع کر دی اور بیوی کو سختی سے منع کر دیا کہ وہ جی جی باؤجی تک یہ خبر نہ پہنچائے۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اُسے شراب پینے سے روکے، اُسے ڈانٹے، اُس کے ساتھ حق سے جھگڑا کرے، مگر اس فرماں بردار بیوی نے بھاگ بھاگ کر ساس سُسر کی نظریں بچا کر ٹھنڈا پانی، برف، نمکین اور دیگر کھانے کے لوازمات کا انتظام کر دیا۔ بیوی نے روکا نہیں اور اُس کی گاڑی کہیں رُکی نہیں۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ دوسری عورتوں کی طرح اُس کی بیوی بھی اُس سے فرمائشیں کرے، اس سے کسی بات پر ناراض ہو اور وہ اسے منائے، وہ جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کرتا کہ وہ اُس سے جھگڑا کرے مگر وہ رب کی بندی نہ جانے کس مٹی کی بنی تھی کہ نہ غصہ کرتی، نہ شکایت نہ گلہ نہ لڑائی نہ جھگڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُسے اپنی من مرضی کرنے کی کھلی چھوٹ مل گئی۔ وہ اسے کیا اُنگلیوں پر نچاتی وہ تو خود اس کے اشاروں پر ناچنے لگی۔ جتنی دیر وہ گھر پر ہوتا وہ سب کام چھوڑ کر اس کے آگے پیچھے گھومتی رہتی۔ اُس کا ہر کام بھاگ بھاگ کر کرتی۔ ایک گلاس پانی تک وہ خود اُٹھ کر نہ پیتا۔ اُس کے لیے بھی وہ بھاگ آتی۔ شراب کی تو اب بہار لگ گئی تھی۔ دن بہ دن پینے کے ناغے کم ہوتے جا رہے تھے۔ پینے والوں کو تو پینے کا بہانہ چاہیے اور اُسے تو ویسے بھی کسی بہانے کی ضرورت کہاں تھی۔ سونے پہ سہاگہ یہ ہوا کہ ایک بار باؤجی شدید بیمار ہو گئے۔ کئی روز اسپتال میں رہے اور پھر ٹھیک ہو کر گھر بھی آ گئے اُس کے بعد جب کبھی بھی اُسے شراب نہ پینے کی نصیحت دی جاتی تو وہ ایک ہی بات کہتا:

''یہ میں نہیں چھوڑ سکتا۔ بھگوان شنکر سے وعدہ کیا تھا کہ باؤجی ٹھیک ہو کر گھر آ جائیں تو روز شراب پیوں گا۔''

منّت پوری ہونے پر اپنی پسندیدہ عادت یا کوئی شے چھوڑنے کا سُنا تھا مگر اس طرح کی منّت وہ بھی اپنے فائدے کی نہ کبھی دیکھی نہ سُنی۔

دونوں گھروں کے فرائض میاں بیوی نے مل کر خوب نبھائے۔ گھر میں جب لڑکیوں کی شادی کا دور چلا تو بڑے بھائی بھابی کے سارے فرائض انہوں نے نبھائے۔ ماں بابا نے بھی کسی جگہ اُنہیں پیچھے نہیں چھوڑا۔ ایک کے بعد جب دوسری بیٹی اُس کے گھر پیدا ہوئی تو جی جی نے مایوس ہو کر بہو کو اتنا ضرور کہا:

''اپنی دوسری ساس کے نقشِ قدم پر چل رہی ہے''

جی جی باؤجی دوسری بیٹی کی پیدائش پر خوش نہیں تھے مگر اُس کی خوشی

ساتویں آسمان پر تھی۔ کہتا تھا:

''اچھا ہے بیٹیاں ہیں، بیٹا ہوتا تو میرے جیسا ہی نالائق ہوتا''

وقت اور حالات کے ساتھ انسان کے مزاج میں تبدیلی آنا لازمی ہے مگر بدلتے موسم اُس کا کچھ نہ بگاڑ سکے البتہ وقت کے ساتھ شراب، سگریٹ کے ساتھ ساتھ انا پرستی میں بھی اضافہ ہو گیا۔ کسی کی نصیحت کسی کی صحبت خود نفسی کے حصار سے اُسے باہر نہ نکال سکی۔ یہ وجہ تھی کہ اُس کے جاننے والوں اور دوستوں کا حلقہ محدود ہوتا گیا۔ ہمارے جاننے والے اس بات پر حیران تھے کہ ہمارے ساتھ کیسے نبھ رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے سامنے نہ کوئی اُنا تھی اور نہ ہی ''میں''۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ماں نے اُس کے آگے کسی کو کبھی ترجیح نہیں دی۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ یہ برداشت نہیں کر پائے گا منہ سے تو کچھ نہیں کہے گا مگر اندر ہی اندر گھلتا رہے گا، کڑھتا رہے گا، سُلگتا رہے گا۔ لڑکیوں کی شادی میں تو ماں نے اُسے سب سے آگے رکھا مگر جب اچانک بابا سڑک حادثے میں چل بسے تو گھر میں کہرام مچ گیا، کسی کو کسی کا ہوش ہی کہاں تھا۔ خاندان کے بڑے بزرگ سب جمع تھے اور اس وقت تایا جی کے بڑے بیٹے کو آخری رسومات اور سُپردِ آتش کرنے کی ذمہ داری دے دی۔ یہ بات اُسے بہت ناگوار گزری۔ ساری عمر بیٹے کے فرائض وہ نبھاتا رہا اور آخری وقت میں گھر کا بڑا بیٹا ہونے کا حق اُس سے چھین لیا گیا۔

بڑے بزرگوں کے سامنے اُس وقت خون کا رشتہ زیادہ اہم ہو گیا۔ اس کی بات بے جان نہ تھی مگر نہ تو ایسی کسی بات کا موقع تھا اور نہ ہی ہماری توجہ اس طرف گئی۔ بابا کی رحلت نے اس قدر توڑ دیا تھا کہ کوئی بھی بات اُس وقت اہم نہ تھی۔ سب باتیں بے معنی تھیں۔ اپنی ناراضگی کا اظہار اُس نے ''کریہ'' کے متعلق چھپے کارڈ اور اخبار میں دیئے کریہ کے اشتہار سے اپنا نام ہٹا کر کیا۔ خوشی کے موقع پر ناراضگی جائز ہے مگر ایسے غمی کے موقع پر بھی اس طرح ناراض ہوتا ہے بھلا کوئی؟ ایسی ہی باتیں ہماری تکرار کی وجہ بنتی اور پھر کئی دن کئی ہفتے، کئی مہینے بنا بات کیے گزر جاتے۔

پوری دنیا میں وہ واحد شخص تھا جس سے میں ناراض بھی ہوتی، گالیاں بھی دیتی، جھگڑا بھی کرتی ورنہ میری کبھی کسی سے کسی بات پر نہ کبھی لڑائی ہوئی نہ جھگڑا۔ ہمارے معاملے میں کبھی گھر کے کسی فرد نے نہ تو دخل دیا اور نہ ہی بیچ بچاؤ کرنے کی کوشش۔ کبھی کبھی ایسا ضرور ہوتا کہ کسی رشتے دار کے یہاں جانا ہوتا یا کسی نے آنا ہوتا تو دباؤ بنتا کہ لوگوں کے سامنے یہ بچگانہ حرکت نہ کرنا بے شک اُن کے جاتے ہی دوبارہ سے بول چال بند کر دینا۔ پھر ایسے موقعہ پر جب لوگوں کے سامنے بات چیت شروع ہو جاتی تو لڑائی خود بخود ختم ہو جاتی۔ گھر کے لوگ بھی راحت کی سانس لیتے۔

اُس نے اپنی زندگی کے اہم فیصلے کبھی ہماری صلاح مشورے کے بنا نہیں کیے۔ چاہے وہ اس کی شادی کی بات تھی، بچوں کے نام رکھنے سے لے کر اُن کے سکول کالج کے داخلے، نئی گاڑی خریدنے کا مشورہ، جدّی مکان میں حصہ ملنے کے بعد کہاں اور کیسا مکان خریدا جائے، غرض ہر چھوٹی بڑی بات میں ہمیں شامل کرتا۔ ماں بھی کوئی اہم فیصلہ اُس کی صلاح کے بنا نہیں لیتی تھی۔

جب کسی شے میں لچک ختم ہو جاتی ہے اور جھکنے اور مُڑنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی تو وہ ٹوٹ جاتی ہے۔ اُس کے مان کو اُس کی بڑی بیٹی اور داماد نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اُس نے رشتہ بچانے کی بھرپور کوشش کی۔ بیٹی کی رگوں میں بھی اُسی کا خون دوڑ رہا تھا دونوں اپنی اپنی انا کے شکنجے میں پھنسے رہے۔ وہ جھکا نہیں مگر اندر ہی اندر ٹوٹ گیا۔ وہ بیٹی جو اُسے جان سے بھی زیادہ عزیز تھی جس کے لاڈ پیار میں اُس نے زمین آسمان ایک کر دیئے، جس کی ہر خواہش پوری کی یہاں تک کہ اپنی برادری سے باہر سب سے بغاوت کر کے اُس کی من پسند جگہ پر شادی بھی کی، وہ ہی اپنے والدین کی صورت دیکھنے کو تیار نہ تھی۔ بیٹیاں اگر ماں باپ کا مان ہوتیں تو وہی بیٹیاں ماں باپ کے لیے امتحان بن کر بھی آتی ہیں۔ بھابی کی سادہ طبیعت دیکھتے ہوئے اس نے شہر کے سب سے بہترین سکول میں بیٹی کو داخلہ دلوایا تھا کہ وہ زندگی کے طور طریقے سیکھ لے۔ اُس وقت یہ نہیں معلوم تھا کہ گھر کے اور سکول کے ماحول میں جو فرق ہے وہ اُس کی تربیت پر کچھ زیادہ ہی اثر کر جائے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہائی سوسائٹی کی لڑکیوں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے سے احساس کمتری کا شکار ہو گئی۔ متوسط طبقے کی لڑکی کے خواب بھی ہائی کلاس ہو گئے۔

ماں کو ماں نہیں سمجھتی تھی اور چھوٹی بہن سے تو جنم جنم کا بیر، ڈرتی تھی تو صرف باپ سے۔ باپ کے غصے کے خوف سے ماں بیٹی کی غلطیوں، اُس کی گستاخیوں پر پردہ ڈالتی رہی اور جوان ہوتے ہوتے وہ پوری طرح باغی ہو گئی۔ ایک روز پریشانی کے عالم میں ماں سے اپنا درد سانجھا کرتے پنکی نے کہا:

''میری چھوٹی چار بہنیں میری ایک نظر سے ڈرتی تھیں یہاں خود میری اولاد کا حال یہ ہے کہ میں اُس سے ڈرنے لگا ہوں۔'' اور پھر جب سب کے انکار کے باوجود اس کی شادی اس کے پسند کے لڑکے سے کروانے کو راضی ہو گیا تو کہا تھا:

''شکر ہے اُس نے مجھے یہ فرض پورا کرنے کا موقع دے دیا۔ مجھے تو ڈر تھا کہ کہیں خود ہی شادی کرا کے نہ آ جائے۔ اگر آ جاتی تو اُس وقت میں کیا کر سکتا تھا؟ کم سے کم اب میں عزت سے اُسے رخصت تو کر سکتا ہوں۔''

اُس وقت وہ گھنی مونچھیں پھسپھسی لگنے لگی تھیں اُن رعبدار، جلال بھری آنکھوں میں کتنی بے بسی تھی۔ اپنی اولاد کے آگے انسان کس قدر مجبور ہے، بس لاچار ہو جاتا ہے۔ ماں اُسے اکثر کہتیں:

''جو کسی کے آگے نہیں جھکتا وہ اولاد کے آگے جھک جاتا ہے۔ انسان اپنے پیٹ کے آگے ہی جھکتا ہے۔''

بیٹی کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی۔ دل کھول کر پیسا خرچ کیا۔ پھر بھی خود پسند، بے لحاظ، بد دماغ، بے مروت لڑکی کے تیور نہیں بدلے۔ لڑکیاں

جب بیاہ کر دور جاتی ہیں تو مائیکے کی قدر کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتی ہے۔اس بیٹی نے تو اس بات کو بھی جھٹلا دیا کہ بیٹی تا عمر بیٹی رہتی ہے۔میری نظر میں وہ واحد بیٹی تھی جس نے شادی ہوتے ہی والدین کا گھر ایسا چھوڑا کہ پلٹ کر دوبارہ نہیں دیکھا۔ نہ وہ اچھی بیٹی ثابت ہوئی نہ بڑی بہن۔اُس نے چھوٹی بہن کو وہ لاڈ پیار، دُلار اپنا ساتھ نہیں دیا جس کی وہ مستحق تھی اور چھوٹی نے بڑی کو وہ عزت نہیں دی۔عزت خود ملتی ہے کروائی نہیں جاتی، چھینی نہیں جاتی یہ تو بہت کچھ قربان کر کے کمانی پڑتی ہے۔

بڑی بیٹی کی ذمہ داری سے فارغ ہو کر ابھی راحت کی سانس بھی نہ لے پایا تھا کہ کاروبار میں زبردست نقصان اُٹھانا پڑا۔اس کا اپنا ہی کاروباری حصہ دار اُسے چونا لگا گیا۔جس پر وہ آنکھ موند کر بھروسہ کرتا تھا۔اپنے پریوار کا فرد سمجھتا تھا۔خود کو شاطر، چست چالاک سمجھنے والا اس انسان کو نہیں پہچان پایا جو برسوں سے اس کے ساتھ تھا۔مالی نقصان اور اعتماد کے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے نے اسے جھنجھوڑ دیا تھا۔ابھی اس حادثے سے دوچار ہو ہی رہا تھا کہ بیٹی کے سُسرال والوں نے رشتوں میں کیڑے نکالنے شروع کر دیے۔بے وجہ ہی کی بات سُننے کا مادہ تو اس میں تھا نہیں، بس ایک بار بات بگڑنی شروع ہوئی تو بگڑتی ہی چلی گئی۔ دُکھ تو اسے اس بات کا تھا کہ اس کی خود کی بیٹی اُن کے ساتھ اس کے خلاف کھڑی ہو گئی تھی۔نہ مالی نقصان اُسے توڑ سکا نہ ہی حصہ دار کا دھوکا اُسے خود اُس کی اولاد نے توڑا۔بیٹی کی بدلحاظی اور بے مروّتی دیمک کی طرح اُسے اندر سے کھوکھلا کرنے لگی اور پھر ضبط کے سارے بندھن اس روز ٹوٹ گئے جب اُسے غیروں نے آ کر نانا بننے کی مبارک باد دی۔کئی بار دل کڑا کر کے سوچا کہ ایک بار اپنی نواسی کو دیکھ آؤں مگر ہر بار اُس کے زخم ہرے ہو جاتے کہ کس طرح بیٹی نے ماں کو اپنے گھر کی چوکھٹ سے واپس لوٹا دیا تھا، دہلیز بھی الانگھنے نہیں دی تھی۔اس کے بعد اُس نے بیوی کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ دوبارہ کبھی اُس کے گھر کا نہ تو رُخ کرے گی اور نہ ہی اُس کا نام کبھی اس کے سامنے لے گی۔بیوی خاموش ہو گئی تھی مگر ماں کی ممتا بے عزتی بھول کر پھر سے اُچھالے مارنے لگی تھی۔

زندگی نے کروٹ لی تھی۔اس نے خاموشی سے زندگی کے اس موسم کو بھی قبول کر لیا تھا۔گھر سے نکلنا بہت کم کر دیا تھا۔کبھی کسی کے آگے بدلتے حالات کا رونا نہیں رویا کبھی کسی کو اپنی پریشانی ظاہر نہیں ہونے دی۔

نومبر کی ایک صبح، ابھی پو بھی نہیں پھٹی تھی کہ فون کی مسلسل بجتی گھنٹی نے نیند سے بیدار کر دیا۔دوسری طرف بھابی روئے جا رہی تھی۔پنکی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی اور سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی۔اسے اسپتال لے کر جا رہے تھے۔اُدھر سے وہ اپنے ہم سایوں کے ساتھ اسپتال پہنچے اِدھر سے ہم۔ تین دن اسپتال میں ہی گزرے۔اس روز دیوالی کا دن تھا شام تک اس کی طبیعت سنبھل گئی تو اُس نے ہمیں زبردستی گھر بھیج دیا کہ کم از کم گھر جا کر پوجا کی جائے اور دیپک جلا دئے جائے۔آج تک دیوالی کی پوجا اُس کے بغیر کبھی نہیں ہوئی تھی۔پہلے وہ اپنے گھر پوجا کرتا پھر ہمارے یہاں آتا۔اس دیوالی پر اس کے بغیر ہی یہ رسم ادا کی۔پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ گھر نہیں آیا تھا۔اس کے بغیر دیوالی دیوالی نہیں لگ رہی تھی۔تیسرے دن بھائی دوج تھی اور اس دن اسپتال میں ہی ہم نے یہ رسم نبھائی۔جب اسے تلک لگایا تو اس کی آنکھیں بھر آئیں تھیں جسے بڑی ہوشیاری سے اُس نے سب سے چھپانا چاہا اور جسے سب نے دیکھ کر بھی ان دیکھا کر دیا۔اگلے ہی روز اُسے اسپتال سے چھٹی مل گئی تو سب نے راحت کی سانس لی۔اسپتال سے نکلتے وقت اُس نے اپنی چھوٹی بیٹی سے اتنا ضرور کہا تھا کہ ''اگر ایک بار بھی وہ حال پتا کرنے آ جاتی تو میں اُسے معاف کر دیتا۔تجھے کیا لگتا ہے اُسے میری بیماری کی خبر نہیں ہوئی ہو گی؟''

دل کے کسی کونے میں بیٹی کو ملنے کی تڑپ زندہ تھی جسے شاید اُس نے اپنے آپ سے بھی چھپا کر رکھا تھا۔

اسپتال سے چھٹی سے پہلے ڈاکٹرز نے سخت ہدایت دی تھی کہ سگریٹ، شراب کا پرہیز کیا جائے۔نہیں تو انجام کچھ بھی ہو سکتا ہے۔پورے سال میں صرف ماں دُرگا کے نوراتری کے نو دن ہی وہ شراب کا ناغہ کرتا تھا اور سگریٹ کا تو حساب ہی نہیں۔تین دن اسپتال رہنے سے اُسے اب شراب سگریٹ کو ہاتھ لگانے سے خوف آنے لگا تھا۔اُس نے دوبارہ کبھی ہاتھ نہ لگانے کا چھوٹی بیٹی سے وعدہ بھی کر لیا۔وہ جینا چاہتا تھا اپنی چھوٹی بیٹی کے لیے جس نے ابھی سکول کی پڑھائی ختم کر کے کالج میں داخلہ لیا تھا۔ہنسی مذاق میں اکثر کہا کرتا تھا:

''اگر مجھے کچھ ہو گیا تو میری پلک کا خیال رکھ لینا''

اور ہم صاف لفظوں میں منہ توڑ جواب دے دیتے:

''نا بابا نا۔جس کی ذمہ داری ہے وہ خود نبھائے۔ہم نے کسی کا ٹھیکہ نہیں لینا'' اور وہ ہنس کر بات بدل دیتا۔

ہمیں کیا پتا تھا کہ دو دن بعد ہی دوبارہ طبیعت خراب ہو جائے گی۔ اُس رات اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔بھابی کو نیند سے اُٹھایا اور اپنی پسند کی ادرک والی چائے بنوائی اور پھر دیر تک اس سے کچھ پرانے دنوں کی یادیں تازہ کیں کچھ مستقبل کو لے کر باتیں کرتا رہا۔نہ خود سویا نہ اُسے سونے دیا۔صبح پانچ بجے کے قریب سینے میں پھر درد اُٹھا فون کی گھنٹی نے گہری نیند سے جگا دیا۔بھابی کہہ رہی تھی کہ پھر طبیعت خراب ہو گئی ہے وہ اُسے اسپتال لے کر جا رہی ہے۔پندرہ منٹ بعد ہم بھی اسپتال پہنچ گئیں۔صدر دروازے پر ہی جانی پہچانی دھاڑے مار مار کر رونے کی آوازیں سن کر دل دھک سے رہ گیا۔وہ بھابی تھی جسے اپنی ہوش نہیں تھی اُس کی حالت دیکھ کر پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔چند اجنبی اُس کے اردگرد کھڑے اسُے دلاسا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔اسپتال کے اندر گئے تو پلک باپ کے مردہ جسم سے لپٹ کر رو رہی تھی۔اسپتال پہنچتے ہی اُس نے دم توڑ دیا تھا۔جی تو چاہ رہا تھا کہ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اُٹھالوں مگر وہ وقت ہمارے کمزور ہو کر ٹوٹنے کا نہیں تھا بلکہ ان دونوں کو سنبھالنے کا تھا۔دل کڑا کر کے موقع کی

نزاکت کو دیکھتے ہوئے خود پر ضبط کیا اور اُن دونوں کی ڈھال بن کر اُسی طرح کھڑے ہوگئے جس طرح ہمارے کڑے وقت میں وہ کھڑا ہوتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اُن دونوں کو سنبھالنے کے لیے ہم اپنے اکلوتے بھائی کے بے وقت بچھڑ جانے کا ماتم بھی نہ منا سکیں۔ ہم خود کو فریب دیتے رہے۔ اپنے دل میں اُس کے چلے جانے کا خیال تک نہیں آنے دیا۔ ایک ہی بات نظر آتی تھی کہ کسی طرح بھابی کو سنبھالا جائے۔ اُس عورت کو جس نے باہر کی دنیا تک نہیں دیکھی تھی جس کی ساری کائنات اپنے شوہر اور بیٹیوں کے اردگرد گھومتی تھی جسے دنیاداری کا رتی بھر بھی علم نہ تھا اور وہ معصوم بچی جس کے سر پر نہ باپ اور نہ بھائی کا سایہ تھا۔ بڑی بہن کا رشتہ تو نام بھر کا ہی تھا جو غیروں کی طرح باپ کے ماتم پر آئی۔ نہ چھوٹی بہن کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا نہ ماں کے گلے لگ کر اُس کا دکھ بانٹا۔ دو گھروں کا چراغ گُل ہوگیا۔ بابا کے انتقال پر لگا تھا سر سے گھنا سایہ دار درخت چھن گیا ہو جیسے سر ننگا ہوگیا ہو اور اب اُس کے جانے کے بعد ایسے لگا جیسے کسی نے میرے دونوں بازو کاٹ دیئے ہوں۔ اُس کے آخری سفر کے وقت جب اُسے سپردِ آتش کرنے کے لیے وین میں لے جا رہے تھے، اُس وقت میں اُس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ آخری بار اُس سے مخاطب ہوئی تھی۔

''دیکھ میں نے تیری آخری سانس تک تیرا ساتھ نبھایا۔ تجھے تیری منزل تک خود پہنچانے جا رہی ہوں مگر تُو تو ہمیں بیچ راستے میں تنہا چھوڑ کر چل دیا۔''

میرے گِلے کا جواب دینے کی قوت اُس میں تھی ہی نہیں۔

وقت کسی کے لیے رُکتا نہیں۔ زندگی اسی طرح چلتی رہتی ہے۔ جانے والا تو چلا جاتا ہے پیچھے چھوڑ جاتا ہے محرومیاں، اِک خلا جو کبھی پُر نہیں ہوتا۔ پچپن سال کی عمر میں وہ چل بسا۔ جتنی زندگی جی اُس نے اپنی شرطوں پر جی۔ اس کے جانے کے بعد بھابی اور پلکی پہلے سے بھی زیادہ ہمارے قریب آ گئیں۔ جس طرح وہ بنا صلاح کوئی کام نہیں کرتا تھا، اُسی طرح پانچ سال گزر جانے کے بعد بھی وہ کوئی اہم فیصلہ بنا مشورے کے نہیں کرتیں۔ جو کچھ اُس نے ہمیں دیا تھا سُود سمیت واپس اُسی کی بیوی اور بیٹی کو لوٹا رہے ہیں اعتماد، ہمت، تحفظ، خلوص، سہارا، ایک اٹوٹ رشتہ۔ کیا اب بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ ماں جایا نہیں؟

- بقیہ -

## ادھ کھلے پھولوں کا زمانہ

کبھی کسی نے حتیٰ کہ اُس کی دوست، اُس ڈل ڈریس والی لڑکی تک نے محسوس نہیں کیا کہ جب ہم اس گزرے ہوئے زمانے کا ذکر کرتے ہیں تو اس سرحد پار چلی جانے والی لڑکی کا ذکر بھی اس میں آ جاتا ہے۔ اب اس نے بی۔ایس۔سی کیا، اب ایم۔ایس۔سی بوٹنی میں، اب شادی ہوگئی۔ پڑھا بھی نہیں رہی ہے۔ اب وہ لوگ شملہ میں رہتے ہیں جہاں اس کے شوہر کی پوسٹنگ ہے۔ ڈوکٹر جوزف جورڈن اور مسز کلارا جورڈن کسی کو نہیں معلوم تھا (شروع میں ویلور گئے تھے) کہاں ہیں۔

ایک ساتھ والی لڑکی نے البم میں اپنی بچپن سے لے کر بڑے ہونے تک کی تصویریں دکھائیں۔ اس میں ایک تصویر میری۔ این کی بھی تھی۔۔۔ دروازے کی دہلیز پر بیٹھی ہے، پیر نیچے کے قدم پر ہیں۔ چٹیاں اُسی طرح تھیں، ذرا لمبی، دونوں طرف کندھوں سے لٹکتی ہوئی۔

میں نے اس سے وہ تصویر نہیں مانگی۔ مانگتا تو بلا توقف دے دیتی اور اگر چھیڑ میں کچھ کہتی تو میں جھٹلاتا نہیں۔۔۔ کندھے اچکا کر کہتا ''وہ تھی ہی پوجا کے لائق۔''

میرے پاس وہ گروپ فوٹو بھی نہیں ہے جس میں میری۔ این جورڈن بھی ہے لیکن میں کسی وجہ سے وقت پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ اور ''وہ تھی ہی پوجا کے لائق'' کہنے کے بعد شاید یہ بھی کہتا ''وہ میرے گزارے ہوئے اتنے دنوں، اتنے سالوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی ہوگی اور شاید اُسے وہ لڑکا یاد بھی نہ ہو جس نے اس سے آخری دنوں میں ایک دن تھوڑی دیر بات کی تھی جس غصے سے کانپتے اور روتے ہوئے کو پروفیسر نے لاکر اس کے برابر کی سیٹ پر بٹھا دیا تھا۔ ویسے بھی نو، دس مہینے کا ساتھ کوئی ساتھ ہوتا ہے۔

وہ البم دیکھتے وقت، اُس عمر کو پہنچتے پہنچتے میرا رتبہ میری نظروں میں وہ نہیں رہا تھا جسے لئے میں کولج کے پہلے سال میں داخل ہوا تھا۔ جس نے مجھے بہکار رکھا تھا کہ میں ایسا طالب علم ہوں کہ اس جیسی اہم کلاس فیلو صرف میرے بارے میں سوچتی ہوگی۔

میں چاہت کی اُن جڑوں کو اب بھی پانی دیتا ہوں گو اُن کے اوپر کوئی پودا نہیں ہے۔ وہ جس زمین کو چلی گئی تھی کبھی میں بھی وہیں کا تھا۔۔۔ دونوں کی یاد کبھی پھل نہ لانے والی ہے۔

☆

# تنقید کے حوالے سے کچھ حقائق

حمیدہ معین رضوی
(لندن)

☆ پہلا سوال ہے ادبی تنقید کیا ہے؟
جواب ہے۔فن پارہ کی خوبیوں اور کمزوریوں کو اجاگر کرنے کی اہلیت

☆ ادبی تنقید کا مقصد کیا ہے؟اور ضرورت کیا ہے؟
ج۔۔۔فن پارہ کا معیار مقرر کرنا۔قاری کی مدد کرنا اور ذوقِ مطالعے کو بڑھانا

☆ نقاد کون ہے؟
جس میں تنقیدی صلاحیت ہواور اس تنقیدی صلاحیت سے وہ کسی معیار کو مقرر کرکے۔اور اس معیار کو استعمال کرکے تو ازن کرسکے اور پھر فن پارہ کا معیار مقرر کرے۔

☆ نقاد میں یہ صلاحیت کیسے اور کہاں سے آتی ہے اور۔نقاد کا فرض کیا ہے؟
نقاد میں یہ صلاحیت علم سے آتی ہے اور اس کا فرض ہے کہ مسلسل اپنے علم کو بڑھاتا رہے فنونِ لطیفہ اور اصنافِ سخن یعنی مختلف لنوع تخلیقات کے بارہ میں بھی اور اور اصولِ تنقید کے بارہ میں بھی تا کہ اصنافِ سخن کی خوبیوں اور نقائص کے علم پہ عبور حاصل ہوجائے۔۔یہاں تک کہ اس میں یہ صلاحیت پیدا ہوجائے کہ اسکی نگاہیں ادب وفن کے اندر چھپی ہوئی خصوصیات کو مخصوص زاویے سے دیکھنے کا شعور پیدا کرلے۔بلکہ وہ ان خصوصیات کو بھی جاننے لگے جن کا فنکار کو بھی علم نہ ہو۔پھر اسکے اندر یہ بھی صلاحیت ہونی چاہئے کہ وہ زبان و بیان کے ساتھ ان خصوصیات کو اسطرح صفحۂ قرطاس پہ بکھیرے کہ عام قاری بھی اس فن پارہ کی طرف متوجہ ہوں اور خاص قاری بھی۔اور فنکار کو بھی اس سے مدد ملے۔۔ان معنوں میں کہ وہ اپنی کمزوریوں اور خوبیوں سے آگاہ ہو مثلاً نثر کی۔خصوصیات ہیں,فکری بلندی،خیال کی پختگی،جذبے کی گہرائی،موضوع اور مضمون میں اکائی۔اظہار کا حسن۔موضوع کی اکائی وغیرہ ندرتِ بیان۔معاشرت اور تاریخ کی جستجو ذاتی ترجیح سے علٰحیدہ ہوکر فن پارہ پہ تبصرہ کی صلاحیت۔منطقی جواز کے ساتھ بتا سکے کہ تخلیق میں خوبی کیوں کر ہے؟اور کمزوری کیا ہے؟ نقاد کے اندر تقابلی جائزے کی صلاحیت بھی وافر ہونی چاہئے،اور اسے منطقی طور پہ تقابلی انداز میں بتانا چاہیئے کہ مقررہ معیار کے مطابق کونسا ادب پارہ بہتر ہے؟اور دوسرا کمتر ہے تو کیوں؟ ورنہ قاری سوال کرسکتا ہے کہ کیوں وہ نقاد کی رائے کو صائب سمجھے بہ نسبت دوسروں کی رائے کے اگر۔نقاد نے وضاحت کردی کہ اس نے فیصلہ منطقی وجوہ،اصولوں،معیارات اور میزان سے کیا اور وہ اصول کیا ہیں تو سمجھدار قاری نقاد پہ طرف داری کا الزام نہیں لگا سکتا۔نقاد ویسے ہی ادب پارہ کے بارہ میں فیصلہ کرتا ہے جیسے عدالت کا منصف ملکی قوانین کو استعمال کرکے انسانوں کے بارہ میں فیصلہ کرتا ہے۔نقاد کو اس معیار تک پہنچنے کے لئے وسیع المطالعہ ہونا ضروری ہے اسے گونا گون اعلیٰ ادب کا قاری بھی ہونا پڑیگا۔اس کا مطالعہ جتنا گہرا اور وسیع ہوگا اتنا اسکے اچھا نقاد بننے کے امکانات بڑھ جائیں گے،نقا کو صرف اس صنفِ سخن پہ تنقید کرنی چاہئے جس کے مطالعۂ کا اور اسکی اچھی اور بری خصوصیات کا اسے مکمل علم ہو۔اسی لئے بعض ماہرین کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر کسی فن پارہ کے بارہ میں نقاد کو کوئی حتمی فیصلہ دیتے ہوئے تزبزب اور غیر یقینی کا سامنا ہو۔تو اسے حتمی فیصلہ نہیں دینا چاہیئے بلکہ اسکی اچھی اور کم اچھی خصوصیات کا ذکر کرکے قارئین پہ فیصلہ چھوڑ دینا چاہئے۔نقاد کو کسی فن پارے پہ بحث کرتے ہوئے تخلیقات کے ایسے گوشے سامنے لانا چاہئے جس پہ اور کسی نقاد کی نظر نہیں گئی ہو اور ایسے لوگوں پہ ریسرچ کرنی چاہیئے جس پہ پہلے نہیں ہوئی آجکل پی ایچ ڈی کے طلبا اکثر تے۔پاکستان کے اردو ادب میں یہی ہو رہا ہے ہندستان میں بھی حالت کوئی بہت اچھی نہیں ہے۔نقادوں کا اپنا حلقہ ہے اور ان کا اہم مطمحِ نظر وہی بازار کے اصولِ طلب ورسد ہے۔نئے لکھنے والے پرانے نقادوں کے جتھے سے اتنے خوفزدہ ہیں کہ وہ سچ کہنے سے ڈرتے آتے ہیں یہ اسلئے کہ اگر نقاد کسی فنکار کو بہت بہترین کے الفاظ سے نوازے گا تو اسکے ارتقا کے امکانات محدود ہوجائیں گے اور نقاد بھی کی رائے کی اہمیت بے وزن ہوجائے گی اور اسکے اپنے اان لکھنے والوں پہ ریسرچ کرتے ہین جن پہ انکے پیشرو اور اساتذہ کرچکے ہیں اور اکثر ان فنکاروں پہ لکھتے ہیں جو ان کے اساتذہ کو محبوب ہیں اکیونکہ وہ استاد سے ہٹ کر یا مختلف رائے ظاہر کرنے اور سچ کہنے کی جرائت خود میں نہیں پاتے۔اور یہی وجہ ہے کہ نئے نقاد نئے لکھنے والوں پہ لکھنے کی ہمت اور جرائت دونوں نہیں رکھتے۔کیونکہ ایسا کرنے کے لئے نقاد کو مکمل علم اور مطالعہ ہونا چاِئے کہ وہ اپنی رائے کو صحیح اور صائب ثابت کرنے کے لئے آگے بڑھیں جب کہ وہ بغیر محنت کے استاد خوشی پہ پی ایچ ڈی کی ڈگری لے سکتے ہیں ۔ کو خوش کرکے کامیابی حاصل کرسکتے ہیں اسکی مرضی اور انصاف کی کرسی پہ بیٹھ کر انصاف کا ترازو اٹھانا جرائت کا کام ہے۔مگر جس معاشرہ میں منصف ظالم کے خلاف فیصلہ دینے کی جرائت نہیں رکھتے۔وہاں ادب کے ترازو کی،انصاف کی،اور فنکار کی کسے پرواہ ہ۔سماج اور،معاشیات۔ادب و معاشرت تہذیب وتمدن اور سیاست میں انقلاب لانے کے لئے تطہیر کا عمل ضروری ہے۔یہ عمل بغیر اس تطہیر کے ناممکن ہے اور تطہیر شعورِ انصاف سے آتا ہے۔جو جس چیز کا مستحق اسے ملنی چاہیئے۔خواہ ادب کا میدان ہو یا زندگی کا۔

نقاد کو دیدۂ بینا بھی کہا جاسکتا ہے اس لئے کہ وہ معاشرے کا باشعور شخص جو کثرتِ مطالعہ سے گہری فکر ونظر پیدا کرلیتا ہے دور رس نگاہوں سے فنکاروں کی خوبصورت تخلیقات کا تقابلی جائزہ لیتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ فن کا معیار نقاد مقرر نہیں کرتا فنکار مقرر کرتا ہے۔سوال ہوسکتا ہے کہ کیسے؟

جب نقاد دس خوبصورت فن پارے دیکھتا اور پڑھتا ہے تو گیارہویں کی کمتری اسے فوراً نظر آجاتی ہے کہ یہ کمتر کیوں ہے؟۔اسی طرح جب وہ مسلسل کمتر درجے کی تخلیقات دیکھتا یا پڑھتا ہے اور گیارہواں اعلےٰ درجے کی چیز دیکھتا یا پڑھتا ہے تو اس کا وجدان خوشی سے جھوم اٹھتا ہے اور معیار مقرر ہو جاتا ہے وہ منطقی طور پہ اس فوقیت کو ثابت کرنے کا بھی اہل ہوتا ہے۔وہ اپنے اندروں یا باطن کو اس تخلیق میں منعکس کرتا ہے اور نقاد اور قاری کا اندروں یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اسے چار ایک جیسے افسانوں میں بھی ایک کیوں زیادہ اچھا لگا۔اسی لئے تنقیدی عمل منطقی اصولوں کی راہنمائی کے باوجود دو اور دو چار کا عمل نہیں ہے۔۔خیالات کا تعلق زمانے اور حالات سے ہوتا ہے جیسا ادب اور فن تخلیق کیا جاتا ہے جیسے سماجی اور معاشرتی حالات ہوتے ہیں۔جس طرح کی آویزش اور تصادم وجود میں آتی ہے جس قسم کے الیےاس تصادم سے پیدا ہوتے ہیں اس قسم کا ادب پیدا ہوتا ہے۔
کہ فنکار مسائل کو ابھارتا ہے ۔ اور نقاد ان چیزوں کو حسنِ بیانکے ساتھ اس فنکار کے فن اور ہنر کو ڈھونڈ کر سامنے لاتا ہے۔جیسا ادب تخلیق ہوتا ہے اسی کے حساب سے تخلیقی اصول بھی وضع کیئے جاتے ہیں۔اور تنقیدی معیار بھی۔نقاد دوسری چیزوں کے بھی ہو سکتے ہیں۔میں یہاں صرف فن سے تعلق رکھتے ہوئے تنقید کی ذمہ داری کی بحث کو آگے بڑھاتی ہوں۔کہ تنقید کو صرف فن پارے کی۔ تشریح سے واسطہ نہیں رکھنا چاہئے بلکہ تنقید کو، تجزیہ تقابل اور حسن اظہار کی خوبیوں کو اجاگر کرکے فن پارے کو اس طرح عام قاری سے متعارف کرانا چاہئے کہ اسکے دل میں فن پارے کو مزید جاننے کی تمنا پیدا ہو۔نقاد فن پارے کی خوبیوں اور کمزوریوں دونوں کی ایسے وضاحت کردے کہ جب عام قاری اسکا مطالعہ کرے تو اس فن پارے کی خصوصیات اسکے ذہن پہ ثبت چکی ہوں اور وہ مطالعہ کے لئے بے چین ہو۔یاد رہے کہ تخلیق کی کمی اور کمزوری کو واضح کرنا بھی نقاد کی ہی ذمہ داری ہے؟ اگر ناول کی بات ہے تو بتائیں کہ بہترین ناول کیسا ہتا ہے؟ کچھ بہترین ناولوں کا تذکرہ۔اگر افسانہ ہے تو بہترین افسانے کی شرائط اور کچھ بہترین افسا نوں ؎ کی مثالیں اچھی شاعری کی خصوصیات کیا ہیں،؟اور کس کی شاعری میں یہ خصوصیات زیادہ ہیں کس میں کم ہیں؟ وزن، بحور، ردیف قافیہ۔اور سب سے بڑی چیز فلفہءِ حیات کی موجودگی اور غیر موجودگی ، خیال کی نزاکت۔ندرت، اچھوتا پن وغیرہ اچھی شاعری کی شرائط ہیں۔بقول شیلے بری شاعری حسین اور دور از کار انوکھی تشبیہات سے وجود میں آتی۔اور سب سے بڑھ کر ایک ٹھوس فلسفہ حیات کی موجودگی۔

اگر کسی نقاد کو ان شعری خصوصیات کی خود شناخت نہ ہو تو وہ دوسرے شعراء مین اسکو کیسے تلاش کرے گا؟ اسی طرح افسانے کا معاملہ ہے جو نقاد افسانے کے بارے میں وافر معلومات رکھتا اور اس نے لاتعداد افسانے پڑھے ہیں وہ فن کی روح اور ناول کی کھال میں گھس کر اس کے بارہ میں لکھتے ہیں انکی تنقید میں بھی ایک تخلیقی رنگ آجاتا ہے اور یہ تنقید پڑھتے ہوئے مسرت کا احساس ہوتا ہے۔

تاہم سب سے ضروری شرط کسی بھی نقاد کے لئے یہ قرار دی گئی ہے کہ اس کا ادب کا مطالعہ وسیع وعمیق ہونا چاہئے اس کے علاوہ تاریخ سوشیالوجی نفسیات وغیرہ پہ بھی عبور ہو تو بہتر ہے۔پھر جس ادب کا مطالعہ وہ کر رہا یا کر ہی ہے اس کے مذہب کا بھی علم ہو تو ادب پارے کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے ان علوم کے باوجود بھی فن پاروں کے بارہ میں دوٹوک فیصلہ نقاد کو نہیں دینا چاہئے اگر کسی کتاب کا حوالہ دینا ہے تو سو فیصد یقین کے بعد حوالہ دے ورنہ نہیں۔اسکا مطلب یہ ہے کہ اسے خود اونچے، درمیانے، اور معمولی درجے کے ادب میں تمیز ہونی چاہئے تاکہ وہ موازنہ کر سکے۔اور اس کی کم علمی صحیح فیصلہ کرنے میں حائل نہ ہو یا اور وہ بعد میں ندامت کا شکار نہ ہو۔بہتر تو ہوتا ہے کہ نقاد کو ہر صنفِ سخن کا وافر علم ہو اور نہیں تو کم از کم ادب کی جس صنفِ سخن میں اس نے تنقید کے لئے منتخب کیا ہے اس میں کم از کم اسے پورا علم ہونا چاہئے جیسے شاعری یا ناول افسانہ، یا انشائیہ وغیرہ۔زمانے اور وقت کے مطابق ہی انسان اصول تنقید کے لیئے وضع کرتے ہیں۔کہ ادکی نوعیت کے مطابق یہ تو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ادبی نقاد کا ایک اہم فریضہ یہ ہے کہ فن کے بارہ میں ہمارے نقطہِ نظر میں وسعت گہرائی اور سمجھنے کا شعور پیدا کرے۔اور ہمارا یہ ردعمل فن کے ابلاغ میں ہو اور ادب کو سمجھنے کا شعور پیدا کرے۔

اب آخری سوال؟

کیا نقاد معروضی انداز اختیار کر سکتا ہے

نقاد کو اصولاً ایسا کرنا چاہیئے۔مگر۔۔۔۔نقاد کی ذاتی پسند اسکی تحریر میں آسکتی ہے لیکن تقابلی جائیزے کے بعد اصول وضع کئے گئے ہیں جن کی موجود گی میں وہ بے مقصد تعریف اور تنقیص سے بچ سکتا ہے۔اگر ہم اقبال کی شاعری پڑھیں، حافظ کی شاعری پڑھیں اور پھر آج کی شاعری پڑھیں یا قرۃ العین کا آگ کا دریا پڑھیں اور مینا ناز کو پڑھیں تو آگ کا دریا کے حق میں فوری دلائل دے سکتے ہیں ایک دفعہ عظیم ادب کی خصوصیات کی ہمیں پہچان ہو جائے تو پھر عام دب ، درمیانہ ادب، اور عظیم ادب کے اصول مرتب کئے جاسکتے ہیں۔اور سمجھا جاسکتا ہے تنقید کرنا منطقی رویے کے باوجود دو اور دو چار کا عمل نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ اصولِ تنقید میں وقت کے ساتھ تبدیلی اور ارتقا ضروری ہے مگر ضروری ہے کہ پہلے ہمارا ذہن تنقید کے مقاصد۔فرائض، قواعد وضوابط کے بارہ میں صاف ہو اور تبدیلی صرف اس میں لائی جائے۔ادب خیالات کا تابع ہے اور خیالات زمانے اور حالات کے۔ادب میں تبدیلی آتی ہے۔ہمیشہ ادب میں تبدیلی آنے کے بعد تنقیدی اصول بدلے گئے۔سوائے بیسویں صدی کے آخر میں جو نظریات برساتی منڈکوں کھمبوؤں اور جنگلی پودوں کی طرح وجود میں آئے جو اسلئے وجود میں آئے کہ یہودیوں نے طے کر لیا تھا کہ ہٹلر کی زیادتیوں کا بدلہ وہ ہر کمزور قوم سے لیں گے اور اب وہ ساری دنیا کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً تباہ کر کے ختم کرنے کے در پے ہیں کیونکہ اس صدی میں انکے مقابل ایک یہی قوت ہے جو مغرب کو تباہ کر سکتی ہے ۔ پہلا وار روشن خیالی کے ذریعے کیا گیا پھر جدیدیت ساختیات بات

اشاروں میں ہوئی۔ اور پھر۔ردِ تشکیل یا شکستگی تعمیر کا فلسفہ ڈریڈا نے پیش کیا globalisationاسی کی دین ہے اس منصوبے کے مطابق عمل شروع ہوگیا۔ عراق اافغانستان پاکستان کی جڑ بنیادا کھڑ گئی ایران کے لیئے کوششیں ہورہی ہیں تعصب اس کا سب سے بڑا حربہ ہے مذہبی صوبائی اور قومی دونوں جاری ہیں اور ہم بغیر مغرب کو سمجھیے انکی گنجلک اور مبہم فلسفوں کے چکر میں پُڑے ہیں ایک دوسرے پہ اسکے علم کے حوالے سے رعب جمارہے ہیں۔اور مغرب کے ہاتھوں بے وقوف بن رہے ہیں۔ممکن ہے لوگ سمجھیں خود نہیں لکھ سکتیں اسلیئے کہہ رہی ہیں لیکن اردو کے کچھ نقاد نامور بھی۔مغربی تنقید کی دوراز کار تشریحات کرنے میں مصروف ہیں آج تک نئے لکھنے والوں کو یہ نہیں بتا یا گیا کہ ان سے ہماری معاشرت اور ثقافت کا کیا واسطہ؟ کم ازکم عملی تنقید کرکے ہی دکھا دیتے کہ ایسے تنقید کی جاتی ہے۔۔جیسے اڈورنو،اورلوائے ٹارڈ کے کلیہات قرۃ العین کی آگ کے دریا کا کیا معیار مقرر کرے گا۔انکو آپ پڑھیں ضرور۔مگر۔۔۔۔۔۔۔

مغربی فلسفوں کے اندر اردو ادب کو جانچنا کچھ مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے تنقیدی نظریات کو پڑھنے سے ہر تعلیم یافتہ کو محسوس ہوسکتا ہے کہ ان تلوں میں تیل نہیں ہے اس سلسلہ میں ایسے لوگ پاکستان میں بھی ہیں اور ہندستان میں بھی ہیں میں نے ناول پہ ایک آدھ پی۔ایچ۔ڈی کے مقالات پڑھے ہیں وہ پچھلی کتا بوں کا چربہ معلوم ہوتے ہیں،اس میں بھی کوئی ندرت نہیں،کسی جستجو کا پتہ نہیں لگتا، کہیں نفسیاتی تجزیہ نہیں،کیا۔یہ بتانے کی کوشش نہیں کی گئی کہ کونسا ناول نگار بہتر ہے اور کیسے؟ اور کس ناول نگار میں ایسی خوبیاں ہیں جو دوسرے لکھنے والوں کو نظر میں رکھنی چاہیئے۔بس تاریخ دہرائی گئی ہے۔جیسے اس سے پہلے لوگوں نے لکھا ہے۔اور حد یہ ہے کہ ریسرچ کا موضوع بھی صرف مشہور اساتذہ ہیں۔جانے اس میں کونسی مصلحت ہے؟۔

پاکستان میں خواتین لکھنے والوں میں تنقید نگاروں کا خصوصی کال ہے اور رجن لوگوں کی تحریریں سامنے آئی ہیں ان میں بھی لکھنے والوں والیوں نے ریسرچ کے لیئے زیادہ تر مشہور اور اہم لوگوں کو منتخب کیا ہے اور ان پہ لکھا گیا ہے ایک مقالہ سامنے آیا ہے فاطمہ حسن کا جو ایک حوصلہ افزا قدم ہے یعنی ایک خاتوں کے اوپر ہے۔بعض رسالوں کے مدیروں نے یہ اصول بنا لیا ہے کہ وہ وہ زندہ ادیبوں پہ مضامین نہ لکھیں گے نہ چھاپیں گے اس میں مصلحت وہ جانیں مجھے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ تساہلی اور بے انصافی اردو والوں کے مزاج میں بس گئی ہے اور وہی قوم کا مزاج ہوگیا ہے۔لوگ سچ کہتے ہوئے ڈرتے ہیں اگر نقاد اصولِ تنقید کی تفصیل دے کر فن پارے پہ بحث کرے کہ اس اصول کے تحت تخلیق میں درج ذیل کسر ہے یا خوبی ہے تو فنکار رفتہ رفتہ اپنی تخلیق کو بہتر کرنے کے بارہ میں فکر کر سکتا ہے نقاد تجویز بھی کرسکتا ہے کہ فنکار کے لیئے کس قسم کا مطالعہ مفید ہو لکھنے والوں کی وہ نسل جو ساٹھ کی دہائی میں آئی ان میں صرف وہ لوگ آگے بڑھے ہیں جن کی بڑے نقادوں سے دوستی رہی یا انکی سرپرستی حاصل رہی۔اسلیئے میری استد عا ہے کہ نئی نسل تنقید میں آگے بڑھے۔نئے ادیبوں کو سنجیدگی سے سوچنا چاہیئے۔ میں ان کو ترجیع دیں تو بہت اچھا ہو۔ ہندستان میں چند خواتین سامنے آئی ہیں جن سے امیدیں وابستہ ہیں originalityانفرادی جستجو کریں رہ کر کئی چھپے جوہروں سامنے آئیں اگر انھیں موقع دیا جائے۔اور وہ مغربی ملغوبے سے دور رہیں۔اتحقیق میں ندرت دکھائیں اظہار میں خوف کے عنصر سے چھٹکارا پالیں جیسے رفیعہ شبنم عابدی۔پاکستان میں بھی کچھ خواتین سامنے آئی ہیں مگر نمایاں نہیں ہوسکی ہیں وہ بھی اپنی انفرادی حیت پہ بھروسہ کریں خوف سے باہر آئیں مطالعہ وسیع کریں کیونکہ وہ تمام نظریات جنکو اینڈو پاک میں لوگوں نے متعارف کروائے تھے اور خوب اوارڈ حاصل کئے گئے،وہ مداری تماشہ دکھا کر جاچکا ہے کچھ حضرات ابھی تک لکیر پیٹ رہے ہیں۔ساختیات پس ساختیات اور ردِ تشکیل وغیرہ اپنا مُقصد پورا کرکے جاچکے۔یہ سب طاقت کے مظاہروں کا کھیل تھا اور یہ جیتنے والوں کے کھیل ہیں۔ہم اردو والے تو ویسے ہی پٹے ہوئے مہرے ہیں۔مغربی نظریات صرف سیاسی قوت آزمائی اور طاقت کے کھیل ہیں۔

کھیل ہیں جو ہمیں کھیلنا نہیں آتا نہ سمجھ میں آتا ہے۔ہمیں دست بردار ہوجانا چاہیئے۔ہمیں پھر سے حالی اور شبلی وقار عظیم اور ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ترقی پسند نقادوں کی طرف متوجہ ہوکر منتخب اسول لے لیں بغیر تعصب کی عینک کے،مغرب سے بھی رجوع کریں جو ہمیں مناسب لگے۔اب ہم سب کو سیدھے سیدھے سادے ادب کی خوبیوں اور معیار بڑھانے سے واسطہ رکھنا چاہیئے۔ادبی مافیا سے نہیں ڈرنا چاہیئے جہاں تک ادبی مافیا کا تعلق ہے وہ ہر جگہ ہے اسکی نوعیت مغرب میں کافی سوفسطائی ہے۔لیکن ہمارے ملکوں بیں ہر کام کی طرح یہ بھی بے دھڑک ہے۔۔مغرب کے ادبی ایوانوں سے انھوں نے اس تنقید کو باہر پھینک دیا ہے۔

کچھ نئے لکھنے والے مہینوں میں آسمانِ شہرت پہ جالٹکتے ہیں۔اور کچھ گلزار جاوید جیسے واقعی حقداروں کا کوئی نقاد ذکر ہی نہیں کرتا اور بھی بہت لوگ ہیں جبکہ کچھ خواتین اور حضرات تنقید کی ہر کتاب میں نصف صدی کی ترتیب کے ساتھ سے برطانیہ کے بارہ میں آجکل کے ایک انگریز نقاد اور کئی کتابوں کے مصنف ٹے ری ایگل ٹن۔تفصیل سے روشنی ڈالتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

Terry Eagleton says In his book "The Function of Criticism"

"Modern criticism was born of struggle against the absolutist states; unless the future is now defined as a struggle against the bourgeois states it has no future.It has ended up ,in effect as a handfull of indivisuals ,reviewing each others books. Criticism itself has become incorporated in

culture، the culture industery" .

Terry writes about Robart Wejmann complaining "academic critics have largely abandoned broadly civilising function of criticism p107. He says further:"Talking about deconstruction Terry makes the comment ." if "deconstruction is telling acedemic liberal humanism that it does not know quite what it was doing.Or, wheather they are doing anything or not, or wheather it can know wheaher they are doing anything or not, then it is not only because of the tropical fictive nature of all discourse .it is also historical uncertailty in the wider social functions of acedemic humanism which neither it nor much, deconstruction will fully acknowledge that". p108 . Actually he is making fun of acedemic humanists.

ردتشکیل کا رد ہو چکا اور دنیا جہان کی ردِتشکیل یا تخریب بھی ہو چکی جس مقصد کے لیئے یہ فلسفہ گڑھا گیا تھا۔ وہ بھی ہو گیا پھر اس پہ کیوں ہم وقت ضائع کریں۔ یہ تنقید اور سیاست کا گورکھ دھندا ہمارے بس کا روگ نہیں ہے ۔بہرحال ہم ہم ہیں ہندستان میں ایک خاتون نے تنقید کی ایک کتاب لکھی ہے غالباً پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ شہناز نبی ایک نوجوان خاتوں رضوانہ ارم۔ کچھ اور خواتین بھی ہیں۔

شہناز نبی کی تنقید کی کتاب دو تین برس قبل آئی ہے اسے نسائی تنقید کہا گیا ہے۔صرف نسائی ادیبوں کے بارہ میں ہے نسائی تنقیدی کے اصول متعین نہیں کیے ہیں البتہ انھوں نے تعداد میں زیادہ خواتین ادیبوں پہ بحث کی ہے مگر زاویہ پرانا ہے۔جب اردو کے اپنے گھروں کی یہ حالت ہے تو برطانیہ میں کیا توقع ہوگی ۔کہ اردو میں نقاد ہوں گے برطانیہ میں بقول ایک مبصر کے برطانیہ میں جب سے ہندو پاک سے لوگوں کی آمد شروع ہوئی اب تک ڈیڑھ ہزار شاعر یہاں گنے جا ہو چکے ہیں۔معلوم نہیں یہاں کی آب وہوا ایسی ہے یا اردو والوں کا مزاج، جب میں لندن آئی اور پہلے مشاعرے مین شریک ہوئی تو شاعرات مجھے شامل کر کے صرف چار تھیں جبکہ صرف لندن میں مرد شاعروں کی تعداد سو سے اوپر تھی۔

افسانہ نگاری میں تعداد کے حساب سے خواتین کو اولیت حاصل رہی۔زیادہ تر خواتین افسانہ اور کچھ کالم نگار۔انھیں خواتین میں سے کچھ خواتین نے تجزیہ نگاری بھی کی اور یہی نثر نگار خواتین تھیں جنھوں نے کتابوں پہ تبصرے لکھے ان کے اسماء، گرامی ہیں صؔفیہ صدیقی مرحومہ،محسنہ جیلانی۔ فیروزہ جعفر مرحومہ، پروین لاشاری سب سے زیادہ یہاں سے چھپنے والی کتابوں پہ تبصرے بانو ارشد نے لکھے ہیں ۔یہ سیدھے سادے تبصرے ہیں۔شاہدہ احمد بھی ایک خاتوں تھیں مرحومہ وہ افسانے بھی لکھتی تھیں انکے افسانوں کے دو مجموعے شایع ہوئے ہیں انھوں نے بھی کچھ مضامین تجزیاتی لکھے ہیں انکی تحریر میں تنقیدی شعور جھلکتا ہے اور وہ اچھی نقاد ہو سکتی تھیں۔مردوں میں نثر رضا علی عابدی بھی لکھتے ہیں لیکن وہ تنقید نہیں لکھتے۔تبصرے عقیل دانش نے بھی بہت سی کتابوں پہ لکھے ہیں ۔شریف بقا صاحب بھی اچھے مبصر ہیں یہ دونوں حضرات شاعر بھی ہیں۔صحافی جناب آصف جیلانی بھی اردو نثر لکھتے رہے ہیں۔مردوں میں ایک صاحب ہیں جو ادب کے آسمان پہ ذرا دیر سے طلوع ہوئے۔لیکن انھوں نے کتابوں کی تعداد اور کاموں کی بہتات میں تمام لکھنے اولوں کے ریکارڈ توڑ دیئے، یہ ہیں امجد مرزا۔ وہ افسانوں ،شاعری اور مزاحیہ ادب کو ملا کر کوئی تیرہ چودہ کتابوں کے مصنف ہیں جن میں ایک کتاب بے حد اہم ہے جو انھوں نے تمام اہل قلم کے بارہ میں لکھی ہے انھوں نے یہاں کے تمام اہم غیر اہم اچھے کم اچھے۔ بڑے اور مبتدی جس نے قلم پکڑا اس کے بارہ میں لکھا ہے اور انصاف کے ساتھ سب کو ایک صف میں کھڑا کیا ہے کتاب میں فن کی کارکردگی اور فن کے معیار کو پانے کی جستجو کرنے والوں کو تو مدد نہیں ملے گی مگر اس کا بہت بڑا یہ فائدہ ہوا ہے کہ انھوں نے ایک تاریخ کی بنیاد ڈالی ہے اور آنے والے وقت میں انکو تاریخ مرتب اور ادیب کہا جائے گا۔انھوں نے تقریباً پانچ سو صفحات پہ مشتمل یہ تاریخی کتاب لکھی ہے جو آنے والے وقتوں میں یاد کی جائے گی اور تاریخ کا حصہ بن جائے گی ۔یہ سب نثری تحریریں قابلِ قدر ہیں مگر تنقید کی صورت نہیں ۔جنوبی برطانیہ یعنی لندن ور اسکے مضافات کی ۔شمالی علاقوں کے بارہ میں میں کہہ نہیں سکتی کہ صورتِ حال کیا ہے؟۔

مرد افسانہ نگار تو کئی بہت اچھے ہیں جیسے ش۔ صغیر ادیب مرحوم۔ محمود ہاشمی مرحوم ۔شیخ مقصود الٰہی ۔جتندر بلو،گلشن کھنہ۔سوہن راہی۔شاعر ہیں اور نثر بھی لکھتے ہیں۔امجد مرزا افسانے بھی لکھتے ہیں۔اور اخباروں میں لکھتے رہتے ہیں جنکی شہرت برِصغیر میں بھی ہے لیکن کچھ اور لوگ جیسے طلعت سلیم ۔رضیہ اسماعیل بھی لکھ رہی ہیں۔عمران بھنڈر کی معرکتہ لآرا کتاب نثر میں آئی ہے جو تنقید کی کتاب کہی جا سکتی ہے نام ہے۔فلسفۂ مابعدِ جدیدیت۔اس کو ضرور ایک اہم تنقیدی کتاب کہہ سکتے ہیں جیسا کہ دنیا اور خصوصاً مغربی ادب کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ادب کو طاقت قوت اور استعماریت کے مقاصد کے لیئے استعمال کیا جانے کے لیئے لچھے دار، نا قابلِ فہم اور الجھانے والیے فلسفے کے طابع کر دیا گیا تھا اور یہ استعماری مقاصد کے بعد کے مقاصد کے لیئے خوب استعمال ہوا اور ہو رہا ہے ۲۰۰۰ پہ دور ختم ہو گیا اور اس کے بعد یہ گلے کا مینڈک بن گیا۔اس کو سمجھنے اور تنقید کی نئ جہتوں کو جاننے کے لیئے بھنڈر کی کتاب کا پڑھنا سود مند ہے۔اور اس کتاب کو تنقید ہی کی کتاب کہیئے

اگر چہ یہ ایک فلسفے کی کتاب ہے اور چونکہ نئ تنقید فلسفے کا ہی گورکھ دھندا ہے ااسلیئے اس گورکھ دھندے کا عرفان حاصل کرنے کے لیئے عمران بھنڈر کو پڑھنا چاہیئے ـ تعصب برطرف، کتاب ہرایک کی پڑحتی چاہیئے ـ ہمارا مزاج فلسفیانہ نہیں ہم نئے تنقیدی نظریات کو سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں لھذا تعصب اور ذاتی پرخاش سے علٰحدہ ہونا سودمند ہوتا ہے تنقید سے دلچسپی رکھنے والوں کو عمران بھنڈر کی کتابوں کو بھی پڑھنا چاہیئے پڑھنا نقصان نہیں دیتا، اسی طرح میں چاہتی ہوں کہ مغرب کی تازہ صورتِ حال سمجھنے کے لیئے تنقید کے پرستاروں کو خصوصاً اور اسکی باقی کتابیں بھی پڑھیں تو بی Criticism by TerryThe Function of Eagleton. ـ سرار کے کئ در کھلیں گے ـ میں کہہ نہیں سکتی کہ اردو لوں نے اس حقیقت پہ غور کیا کہ نہیں کہ جب مغربی ملکوں نے استعماریت کا کھیل شروع کیا تو اسکے پیچھے ایک بڑی منصوبہ بندی اٹھارہ سوستاون کے بعد سے ہی شروع ہو گئ تھی ـ اس زمانے میں سائینس نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی تھی مگر امپائیر پہ حکومت کرنے کے لیئے طے تھا کہ صرف ارسٹوکریٹ ہی حکومت کرنے کے اہل ہیں اور تہذیب و ثقافت کے علمبردار بھی وہی ہیں کیونکہ وہ جو انگریزی ادب پڑھتے ہیں کلاسکی ادب میں مہارت رکھتے ہیں جو انگریزی ادب انھیں مہذب بناتا ہے ـ جو شیکسپیئر اور پراؤسٹ جیسے ادیبوں کو پڑھتے ہیں اور فنون وثقافت کے علوم سے آراستہ ہوتے ہیں ـ اور امپیریلزم کی عمارت کو مظبوط بنانے کے صرف وہ ہی اہل ہوسکتے ہیں ـ کیونکہ انکی تربیت دانشگاہوں کے اعلٰے طبقے کے دابشوروں اور پروفہسروں کی گود میں ہوتی ہے جو کلاسیکی انگریزی ادب پڑھاتے رہے ہیں اور آج بھی وہ طبقہ زبر دستی ان عہدوں پہ فائیز رہنا چاہتا ہے ـ ان کا پہلا فریضہ نوجوان ارسٹوکریٹ کے دماغوں کو اس خناس سے بھرنا ہے کہ ایمپائیر کو چلانا اور استعماریت کو ہرصورت قائیم رکھنا انکا فرض ہے ـ انگریزی ادب انکو اس مستحسن فرض کے لیئے تیار کرتا ہے ـ اس رویئے کے خلاف آواز اٹھانے کی کسی کی مجال نہیں تھی نہ ہے ـ بقول ایڈورڈ سعید دانشور یا ادارتی مافیا کے ہاتھوں بک جاتے ہیں یا ایمان کھودیتے ہیں اور اور سر جھکا دیتے ہیں. اب تنقید کا مقصد ادب کی قدر متعین کرنا نہیں رہا بلکہ بھاری بھرکم فلسفیانہ اصطلاحوں کے ملغوبوں میں چھپا کر استعماریت کی تلقین کرنا اور ہنر سکھانا ہے ـ اب یہ گھاگ اساتذہ آنسو بہا رہے ہیں کہ لوگ کلاسک فخر کے ساتھ نہیں پڑھ رہے ہیں اور ادب کی موت واقع ہوجائے گی ـ بدلتے ہوئے زندگی کے منظر نامے مین لوگ ان گھاگ پروفیسروں ، اور ارسٹوکریت نقادوں کےء فلسفیانہ گھورکھ دھندوں کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں، یا ان لوگوں کی ادب کو اپنی مٹھی میں دبائے رکھنے کی دہشت گردی کو ختم کرنا چاہتے ہیں ـ اگر نئے لکھنے والوں کی کتابوں پہ یہ تنقید نہ کریں یا سنڈے میگزین اور پیپر میں انکی کتاب پہ تبصرے نہ ہوں تو انھیں کوئ قلق نہیں ہوتا جب کہ پہلے ایسی کتابوں کو کوڑے دان میں جگہ ملتی تھی اب دانشوروں کے تبصرے کے بغیر یہ کتابیں عوام کے ہاتھوں میں پہنچ جاتی ہیں اسلیئے یہ لوگ ادب کی موت سے لوگوں کو خوفزدہ کرر ہے ہیں ـ

ادب کے مرنے کی دہائی دینے والا یہی ادبی مافیا ہے جو اصل میں اپنی طاقت کے گنوانے کے غم میں مبتلا ہے، رتبے کے کھونے کے کرب میں مبتلا ہے ـ ٹے ری ایگلٹن کہتا ہے اایسا ادب اور ایسی ظالمانہ مقاصد سے بھرپور تنقید مرہی جائے تو بہتر ہے ممکن ہے اسکی خاک سے نیا ادب پیدا ہو اور نئ تنقید پیدا ہو، ٹے ری، کارل ماکس کے حوالے سے بات کرتا ہے جس نے کہا تھا ـ کہ ملک کی اسی فیصد آبادی کے پاس نہ وقت ہے نہ پیسہ کہ وہ ارسٹوکریٹک فن وثقافت پہ ضائع کریں اور ارسٹوکریٹ کے گن گائیں تا کہ یہ لوگا ستعماریے مقاصد کی تکمیل کریں ـ

اردو میں ساحر نے بھی تو کہا ہے ـ

نورِ سرمای سے روحِ تمدن کی ضیاء یا ـ ـ ـ ـ بھوک یہذ یب کے آداب مٹادیتی ہے ـ مسٹر ایگلٹن نے صیح لکھا ہے کہ جدیدیت کے اشاراتی اور سر ریلزم کے گورکھ دھندوں کی لافہم تخلیقات کو مرضی کے معانی پہنانے کے لیئے تنقیدی نظریات گڑھے گئے تھے ـ اس مقصد کے لیئے جدیت کے نام سے بہت کچھ دفترِ بے معنی وجود میں آیا مغرب کے بعد اردو میں آیا اور بے معنی تخلیقی ادب لکھا گیا ویسٹ لینڈ کو ۸ مثال بنایا گیا ہے ایلییٹ کے بعد میں آنے والوں نے بھی لکھا یہ تمام ادب ـ جو جنگ، عظیم میں گورے مرنے والوں کا مرثیہ تھا اور پھر اس ـ ـ ـ ـ خرافات کو معانی پہنانے کے لیئے sing and signifer کا سلسلہ شروع ہوا جس چیز کے جو معنی چاہیں بنادیں ـ ٹے ری اایگلٹن اس حوالے سے کہتا ہے کہ ان گھاگ پروفیسروں سے اگر کہا جائے کہ ان بے سروپا تنقیدی نظریات کو ایڈمنڈ سپنسر پہ استعمال کرو تو ان کا منہہ پکڑ جائے گا ـ اور انکی علمیت اور تعصب کا یہ حال ہے کہ دنیا میں کہیں بھی جنگِ آزادی پہ لکھی ہوئی بہترین اور اعلٰے ترین کتابوں پہ وہ کبھی تبصرہ نہیں کرتے ذکر تک نہیں کیا جاتا تعریف تو دور کی بات ہے ـ ان لوگوں کی نظر میں صرف وہ کتابیں جچتی ہیں جو استعماری مقاصد کی تکمیل کرتی ہیں، جیسے تسلیمہ نسریں یا رشدی ـ یا اب ملالہ نوبیل انعام اقبال کو کیوں نہیں ملا؟ اسوال ہے ـ فیض کو بھی نہیں ملا جو انکے داماد تھے ـ سولزے نتسن کی ایک دن پہ کیوں ملا؟ ہمارے ملک میں بھی اس استعماریت کے گرویدہ لوگ ہیں جیسے کازی جاوید (ایسی ہی ان کا نام کا نام لکھا جائے بقول انتظار حسین کہ کازی صاحب کی تاکید ہے ) تو کاضی جاوید کو چاہیئے کہ روشن خیالی کے حوالے سے درجِ ذیل دو کتابیں ضرور پڑھیں مارکس ویبر مصنف ہے ـ

1. The protestent Ethenic and protestent and the Spirit of capitalism.

2. The Protestent Ethnic and the Economy and Society .

جس نظام نے امیر کو امیر تر بنایا ہے وہ یہ روشن خیالی کا فلسفہ ہے ـ دیکھ لیجیئے مسلمانوں کی اکلوتی مزاحم طاقت کا کیا حشر ہوا ـ اور یہ حشر

Jean Francioes lytord 10-8-1924 to April

The Function of Criticism byTerry Eagleton . 1998

خوش خبری دے رہا ہے کہ روشن خیالی اور جدیدیت پُٹخنیاں کھا رہی ہے کہ نیطشے کا سارا زور خدا اکا نعوذ باللہ جنازہ نکالنے پہ صرف ہوا اور اب جدیدیت کا یہ حال ہے اسی کے الفاظ میں۔۔۔

The old man's occupation rummaging in the dustbin of finality to find remains." The post modern Conditions.,,

اگر کسی کو میرے خیال سے اتفاق نہیں تو ثابت کردے مین سرآنکھو پہ رکھوں گی یہ ثبوت۔

جس کوڑے دان کو خالی ہوتا دیکھ کر ردِ تشکیل کا فلسفہ یہودی لابی نے ایجاد کیا اور طمطراق کے ساتھ۔ ڈریڈا آسمانِ علم پہ برآمد ہوا۔ اور دنیا کو تہس نہس کر گیا۔ خود مر گیا۔ اور ہمارے ادیبوں کو، بلکہ دنیا بھر کو گمراہی کے جنگل اور سراب میں پھنسا گیا۔

روشن خیالی کا مطلب تھا کہ دنیا کے ذرائع کو استعمال کرنے کا حق صرف سفید قوموں کو ہے۔ جدیدیت روشن خیالی کا بچہ ہے اور ہجئین مسلسل کہ انکو کانٹ اور فختے نے گود لے لیا جن کا خیال ہے کہ تہذیب (مغربی لادین تہذیب) کے لیئے سرمایہ اور سرمائے کے لیئے اکثریت کو غلام بنائے رکھنا ضروری ہے خوہ یہ اپنے ملک کے غلام ہوں یا باقی دنیا کے۔ ثقافت اور تہذیب اور جمہوریت دنیا کے لیئے ضروری ہے یہی روشن خیالی کا منتہا ہے۔ ہیگل، فختے۔ ہیبر ماس کے جواب میں کارل مارکس نے کہا تھا پرولتاری انقلاب انسانیت کی بقا کے لیئے ضروری ہے مغرب کو جمہوریت سے بہت محبت ہے پھر کیوں الجیریا، نائیجیریا۔ مصر عراق میں منتخب حکومتوں کو نیست و نابود کیا گیا۔ اور شام کی نئی جنگلی حکومت کس کی دین ہے؟

صورتِ حال کا تجزیہ کیجیئے۔ کیوں باؤلے کتے کی طرح یہ لوگ اسلام فوبیا کا شکار ہیں۔ اسلیئے کہ ہم کاہل اور جاہل ہیں۔ کم نظر ہیں، فوری مفاد۔ کے پیچھے بھاگ رہے ہیں حقیقت کا تجزیہ نہیں کرتے۔ کچھ لوگوں کو علم نہیں کچھ اپنے مفاد کے غلام ہیں کچھ صرف بھیڑ ہیں ایسی ہی صورتِ حال پہ ٹے رہی ا ایگلٹن نے ایک دلچسپ بات کہی۔ اور مجھے بہت پسند آئی۔ لگتا ہے اس نے ہمارے لیئے کہا ہے۔

"I shall end this subject with an allegorry. We know that the lion is stronger than the lion tamer ,and so does the lion tamer. The problem is that the lion does not know it. It is not out of the question that death of Literature (imperialist Literature It may help the lion to wake up" "It may teach us we are stronger than what we think. "

عراق میں کیا ہو رہا ہے کیوں ہو رہا ہے۔؟ کازی جاوید نے جن علماء کی مذمت کی ہے ان علماء کو کچھ تو دشمن کی پہچان تھی تجزیہ کر لیجئے بہ نسبت روشن خیالی پہ بیعت کرنے والوں کے۔ یاد رہے کہ جو کچھ نیطشے ہائی ڈیگر۔ مارکس ویبر، فختے نے کھلم کھلا کہہ دیا وہ وقت مختلف تھا اسے ڈریڈا نے ادب اا ور فلسفے کے مخمل میں لپیٹ کر منہہ پہ مارا ہے۔ اور فلسفے کو تنقید کی مدد کے لیئے تیار کیا گیا ہے ردِ تشکیل، گلوبلائیزیشن۔ خوش خبری۔ کاش اسے اوڑھنے بچھانے کے بجائے اس کے پس منظر۔ پیش منظر۔ اور اندر جھانکنے کی کوشش ہوتی۔ پوری قوم کازی جاوید بنی ہے۔

,اس منظر اور پس منظر کو کھانے کے بعد میں پھر اسی سوال کی طرف لوٹنا چاہوں گی ہم تنقید کی حثیت اور اغراض ومقاصد کو صرف ادب تک کیوں محدود نہیں کرتے ؟۔ اور تخلیقی ادب کی قدر قیمت و متعین کرنے کے لیئے ہی استعمال نہیں کرتے۔؟ بجائے ادب کی تنقیدی کلیوں کے جنگل میں سر مارنے کے۔ وقار عظیم، انور سدید۔ محمد علی صدیقی، ممتاز شیریں وارث علوی۔ کی تنقید میں کیا برائی ہے۔؟ کیوں نہیں دوسرے لوگ عملی تنقید کر کے دکھاتے کہ کیسے ادبی تحریر کی قدر متعین کی جاتی ہے؟ یا مغربی تھیوری کے رسیا لوگ اس کے مطابق کسی افسانے یا ڈرامے پہ خود عملی تنقید کر کے کیوں نہیں دکھاتے۔ اگر کسی نے کی ہو اور مجھے معلوم نہ ہو تو مجھے ضرور مطلع کریں میں اپنی ناواقفیت پہ معذرت خواہ ہوں گی ویسے تو مجھے ٹے ری اسی لیئے پسند آیا کہ وہ مجھے اپنا ہم خیال لگا بہت سی چیزوں میں مجھے اتفاق کرتا ہے وہ درج ذیل خیالات کا اظہار کرتا ہے۔" تنقید کا مقصد ادب کی قدر متعین کرنا ہے جبکہ اب اسکا دمقصد۔ جدیت بعد، جدیدیت۔ ساختیات پس ساختیات کے سراب میں لوگوں کو گھسیٹنا ہو گیا۔ اس کا مقصد ادب کا معیار اور قدر متعین نکالنا یا ڈھونڈنا نہیں۔ Sign System ۔کرنا ہی ہونا چاہیئے۔۔۔

کہنا یہ چاہتا ہے کہ اب وقت بدل رہا ہے اور مزدور طبقے کو پرواہ نہیں کہ سنڈے پیپر انکی کتابوں پہ تبصرہ چھاپیں یا نہیں اس طبقے کے لوگ اب خود ادب لکھ رہے ہیں۔ چھاپنے بھی لگے ہیں، انھیں ان گھاگ پروفیسروں کی محتاجی نہیں رہی۔ اسی طرح میرا پر خلوص مشورہ ہے کہ اگر ساٹھ کی دہائی کے بعد لکھنے والے جو ابھی تک نئے لکھنے والے کہلاتے ہیں اگر خود آگے بڑھیں اور تنقید لکھنا شروع کریں کم از کم پرانے نقادوں کے انتظار میں نہ بیٹھیں کہ وہ کب ہمارے فن پہ لکھیں۔ تو ادب کی قدر اور انسانیت کی قدر قریب قریب ہو کر صحت مند ہو جائیں گی۔ ورنہ یہ استعماری تنقیدی کلئے چند برسوں میں طاقِ نسیاں کے سپرد کر دیئے جائیں گے۔

عام صورتِ حال یہ ہے تنقید کی۔ برطانیہ میں اس سے بدتر حالت ہے، لوگ تنقید سے خفا ہو جاتے ہیں گویا وہ تنقید کا مطلب تک نہیں سمجھتے۔ البتہ برطانیہ میں اردو کے کچھ تجزیہ نگاروں ہیں جن کا میں نے ابتدائی صفحوں میں ذکر کیا

ہے۔ کچھ اور حضرات کا ذکر کروں گی ایک صاحب صفات علوی ہیں وہ بھی اچھے صٓبِ علم ہیں غالباً تنقیدی مضامیں لکھتے تھے محمود ہاشمی بھی اچھی تنقیدی صلاحتوں کے مالک تھے۔ جتندر بلو بھی لکھ سکتے ہیں مگر بات یہی ہے ان میں سے کسی نے اسکو اپنایا نہیں۔ سو ہم کہہ سکتے ہیں کہ برطانیہ میں تنقید کا وجود نہیں۔ غالباً اسی کی دہائی میں ایک صاحب فاخر حسین کی تنقید کی دو کتابیں شائع ہوئی تھیں میری بدقسمتی یہ اس وقت شائع ہویں ءجب مین لندن سے بہت دور رہتی تھی۔ وہ بھی کہین باہر سے آئے تھے۔ دو کتابیں ایک ساتھ آئی تھیں نام معلوم نہیں۔

نہ صرف یہ کہ برطانیہ کے اردو لکھنے والوں میں کوئی نقاد نہیں بلکہ انھین تنقید، تنقیص۔ اور تعریف میں فرق کا بھی کچھ صحیح اندازہ نہیں۔ ہر وہ شخص جس نے قلم اٹھایا اور کچھ لکھا وہ چاہتا ہے کہ جو اسکے قلم سے برآمد ہوا سے شاہکار کہا جائے۔ آسمانِ ادب کا چاند کہا جائے۔ خواہ شاعر ہوں یا افسانہ نگا، راگر تخلیق کی کمزوری کا اشارہ کر دیا تو آپکے خلاف محاذ تیار۔ یہی بنیادی وجہ ہے کہ یہاں کے لکھنے والے پاک و ہند میں کم کم چھپتے ہیں مقصود الٰہی شیخ نے ان کو مخزن کے ذریعے آگے بڑھانے کی بہت کوشش کی مگر زیادہ بات نہ بنی۔ جو تخلیق کار لکھ رہے ہیں انھوں نے اپنے طرزِ نگارش، میں کوئی تبدیلی نہیں کی صرف اسلیئے کہ انھیں عادت نہیں اپنی تخلیق پہ تنقید کی۔ اور وہ کبھی تنقیدی نگاہ سے تخلیق کو نہیں دیکھتے۔ اچھے لکھنے والوں کو پڑھتے بھی نہیں۔

امین مغل کا تعلق ترقی پسند ادب سے ہے۔ اردو کی کانفرنسوں میں انھوں نے بہت اعلیٰ معیار کے تنقیدی مضامین لکھے اور بڑے سے بڑے دیبوں پہ لکھا ان کی تنقیدی نگاہ بہت گہری ہے افسانوں اور ناولوں پہ ان کو دسترس حاصل ہے۔ شاعروں پہ بھی بہت لکھا ہے حتےٰ کہ ساقی فاروقی کی بلی کتوں والی جدید شاعری میں بھی انھوں نے علمی نکتے تلاش کیئے۔ مگر افسوس کہ انھوں نے ابھی تک اپنے لاتعداد مضامیں کو کتاب کی صورت نہ دی جانے کیا مصلحت ہے؟

شاعری کے میدان میں حکیم جی مرحوم عروض کے اعلیٰ پائے کے نقاد تھے۔ اکبر حیدرابادی بھی اچھا علم رکھتے ہیں مگر شاعری پہ کوئی تنقیدی مضموں پڑھنے کو نہیں ملا ہاں اکثر رسالوں میں لوگوں کی شاعری پہ عروضی نقطءِ نظر سے ظفر اقبال سٹائل تنقید اور تبادلہ، خیالات ہوتے رہتے تھے۔۔ ہمارے ایک مایہ ناز تجزیہ نگار تبصرہ نگار پچاس کتابوں کے مصنف اقبالیات کے ماہر جناب شریف بقا صاحب ہیں وہ صاحبِ علم بھی ہیں اور صاحبِ فہم بھی ہیں۔ بریڈفورڈ میں صفات علوی بھی تنقید میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اب ضعیفی اور صحت کی خرابی کی بنأ پہ خانہ نشین ہیں۔ برمنگھم کی شبانہ یوسف نے بھی ایک آدھ تنقیدی مضامین لکھے تنقیدی صلاحیت بھی نظر آئی مگر وہ بھی اب جانے کن بکھیڑوں میں پڑ گئی ہیں، ممکن ہے لکھتی ہوں اور کئی برس سے میں نے کوئی نئی تحریر نہیں دیکھی۔

اسی طرح ڈاکٹر عزم ہیں، قانون کے ڈاکٹر ہیں۔ لیکن شاعر بھی ہیں اور انکا مطالعہ بھی گہرا ہے مگر اس علم کو اگر الفاظ کا روپ دیکر قرطاس کی صورت دے دیں تو کچھ اردو ادب کا فائدہ ہو، چیزیں اپنے وجود سے جانی اور پہچانی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بھی جب چاہا کہ وہ پہچانا جائے تو عشق کو پیدا کیا۔ مگر کون سمجھائے۔ یہاں کے اچھے شاعروں میں سوہن راہی، گلشن کھنہ چمن لال جونشر بھی لکھتے ہیں مگر تنقید نہیں۔ یا مجھ تک انکی تحریر نہیں پہنچی۔ ویسے حقیقت تو یہ ہے کہ ہر اچھا فنکار پہلے اچھا نقاد ہوتا ہے جو جتنا اچھا فنکار ہوگا وہ ویسے ہی بہتر نقاد ہوگا۔ اور شبانہ یوسف اچھی شاعرہ ہیں۔ بلکہ نظم کی بہت اچھی شاعرہ ہیں۔

آخر میں بقول ٹے ری ایگلٹن۔ ترجمہ

''آج تنقید کے میدان میں افراتفری، بے یقینی اور ہنگامے کی جو صورت ہے وہ اسلیے ءکہ تنقید کی تعریف ہی نہیں ہو پا رہی ہے۔

یعنی ادبی تنقید کیا ہے؟ کس لیئے ہے؟ س کے فرائض و مقاصد کیا ہیں؟

جو دفترِ بے معنی اس نام اور اسکے کام سے وجود میں آیا ہے وہ خود بے معنی ہے۔ بیکار ہے۔''

ویسے تو اپنی معمولی سمجھ کے مطابق میں نے بھی تنقید کی تعریف اس مضمون کے شروع میں دی ہے۔ جو میں نے خود سوچ کر لکھی ہے اور اپنی کتاب تخلیقی تنقید میں اس پہ بحث بھی کی ہے۔ اس پہ منطقی اعتراض اور اضافے کی دعوتِ عام ہے۔ یہ تعریف میں نے اپنی ثقافت اپنے پسِ منظر اور اپنے ادب کے مطابق لکھی ہے گر قبول افتد زہے عزو شرف۔ ورنہ کمی بیشی پہ مطلع فرمائیں۔ یہ صحیفہ نہیں کہ بدلا نہیں جا سکتا ہے۔ ممکن ہے مل کر کچھ مفید ادبی نکات نکلیں اور آنے والوں کے لیئے مفید ہوں۔ پدرم سلطان بود کے نعروں سے کوئی فائدہ نہیں۔

## ٹائی ٹینک کا مینو کارڈ

بدقسمت بحری جہاز ٹائی ٹینک کے فرسٹ کلاس مسافروں کو پیش کیے جانے والے آخری لنچ کا مینو کارڈ آن لائن نیلامی میں اٹھاسی ہزار ڈالرز میں فروحت ہو گیا۔ نیلامی لگانے والے لائن ہارٹ آٹو گراف کا کہنا ہے کہ جہاز کے پہلے درجے کے مسافروں کو پیش کیا جانے والا مینو کارڈ ایک پرائیویٹ کلکٹر کو فروخت کیا گیا ہے اور یہ قیمت قبل از فروخت اندازوں میں شامل تھی۔ مینو پر 14 اپریل، 1912 کی تاریخ اور وہائٹ لائن لوگو چھپا ہوا ہے جبکہ مینو میں گرلڈ مٹن، چاپس اینڈ کسٹرڈ پڈنگ، کورنڈ بیف، میشیڈ، فرائیڈ اور بیکڈ جیکٹ پٹاٹو، بوفے آف فش، ہیم اور گائے کا گوشت، ایپل میرینگو پیسٹری اور آٹھ اقسام کی پنیر شامل ہیں۔ لائن ہارٹ آٹو گراف کا کہنا ہے کہ یہ مینو نام نہاد لائف بوٹ ''منی بوٹ'' جو صرف امیر لوگوں سے بھری ہوئی تھی، میں سوار مسافروں میں سے ایک ابراہم لنکولن سالمن نامی مسافر کے پاس محفوظ تھا۔

# مکاں سے لامکاں کی جستجو

ڈاکٹر ریاض احمد
(پشاور)

۳۱ردسمبر۲۰۱۵ءکا سورج اپنے تمام ہنگاموں کے اختتام پر غروب ہوا تو ساتھ ہی آسمانِ ادب کا ایک درخشندہ ستارہ بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔اور یوں ان کی بے تاب روح اپنے اگلے سفر پر اور ایک نئی دنیا کے آسمان پر نمودار ہونے کے لیے اس دنیائے فانی سے پرواز کر گئی۔

جونہی یہ اندوہناک خبر موصول ہوئی کہ صفوت صاحب جہانِ فانی سے کوچ کر گئے، ہمارے دل میں ہوک اُٹھی اور ہم نے جولائی اگست ۲۰۱۴ء کا شمارہ ''چہارسُو'' ڈھونڈ نکالا اور وہ کلام دوبارہ گہرائی اور گیرائی سے پڑھا جو شاید پہلے اتنی توجہ سے نہیں پڑھا تھا اسی شمارہ میں صفوت کی ایک غزل پڑھ کر اُن کی شخصیت، جدید سائنسی علوم کی وسعت اور مذہبی لگاؤ جان کر دیر تک افسردہ رہا کہ کاش صفوت بھائی کی زندگی میں ان سے ہمکلام ہونے کا موقع حاصل کر پاتا حالانکہ کئی مرتبہ اُس دیس کے چکر لگا چکا ہوں جہاں وہ مقیم رہے ان کے بارے میں مزید جاننے اور پڑھنے کا تجسس ہوا تو مارچ اپریل ۲۰۱۲ء چہارسو کا صفوت علی نمبر انٹرنیٹ کی مدد سے پڑھ کر حیران رہ گیا کہ علم طبعیات میں پی۔ایچ۔ڈی کرنے والے صفوت علی نے قدیم وجدید دنیاوی ومذہبی علوم پر گہری نظر رکھی اور ''مسلسل بہتری اور ترقی'' کے اصول کے مطابق قابل قدر اور غیر روایتی اسلوب میں حد درجہ اہم ادبی خدمات انجام دیں۔نہ صرف تحقیقی کام کے لیے بلکہ عوام الناس اور حکومتِ وقت کو مختلف شعبوں میں بہتری کے لیے تحریری تجاویز بھی دیں جو نہ صرف اوباما کے دور کے پالیسی سازوں کو پیش کی گئیں بلکہ ایک سائنسی تحقیق کی کتاب امریکی خلائی ادارہ ناسا (NASA) کے بک شیلف پر رکھ دی گئی۔

مدیر ''چہارسُو'' نے صفوت علی نمبر شائع کر کے ایک شاندار کام ہی نہیں کیا بلکہ قارئین چہارسو پر ایک احسان بھی کیا ہے ورنہ ہم ایک قابل فخر پاکستانی نژاد اور راسخ العقیدہ مسلمان اور سائنسدان شاعر اور ادیب کے بارے میں اتنا کچھ نہ جان سکتے۔صفوت علی اب ہم میں موجود نہیں رہے۔اب ہم تخیل میں ان کی یاد میں کچھ شمعیں جلاتے ہوئے انہی کے ایک شعر کے بقول آگے چلتے ہیں:

مرنے کے بعد کچھ تو تیری شاعری چلے
تیرے سخن کے ساتھ رمِ زندگی چلے

تقسیم ہند کے بعد جب صفوت کا خاندان لکھنؤ سے لاہور منتقل ہوا تو وہ کمسنی میں تھے اُن کا آبائی شہر خیر آباد ضلع سیتا پور تھا۔شیر خوار ہی تھے کہ والد وفات پا گئے، جبکہ سات سال کی عمر کے لگ بھگ والدہ بھی فوت ہو گئیں اور لاہور ہی میں ان کی پھوپھی نے پرورش کی۔صفوت علی نے لاہور میں رہتے ہوئے ۱۹۶۸ء میں بی ایس سی (آنرز) پاس کیا اور میرٹ سکالرشپ پر اسلام یونیورسٹی سے (جو اس وقت نئی نئی سکستھ روڈ سٹیلائٹ ٹاؤن راولپنڈی میں قائم ہوئی تھی) طبعیات میں ایم۔ایس۔سی پاس کیا۔بعد ازاں وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے بیرون ملک روانہ ہو گئے۔اٹلی میں کچھ عرصہ قیام اور انٹرنیشنل ریسرچ سنٹر میں کام کرنے کے بعد عازم امریکہ (فلاڈلفیا) ہوئے۔امریکہ سے اعلیٰ تحقیق اور ریسرچ کے بعد پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی اور وہیں پر خلائی شعبہ (NASA) میں بطور سائنٹسٹ کام کیا اور کچھ عرصہ سپیس شٹل کے منصوبے سے منسلک رہے۔شاید کائنات اور خلاؤں میں جھانکنے کا ان کا شوق یہیں سے پروان چڑھا تھا۔جوان کی تحریروں میں عیاں اور حاوی رہا۔ریٹائرمنٹ کے بعد اُنہوں نے کمپیوٹرز میں اپنی مصروفیات جاری رکھیں اور انگلیوں کے نشانات کو کمپیوٹر کے ذریعہ پڑھنا، جانچنا اور ریکارڈ رکھنا ممکن بنانے میں قابلِ قدر کام کیا۔

صفوت علی مرحوم ایک مفکر، مدبر، قادرالکلام اور صاحب طرز انشا پرداز تھے۔زندگی کا بیشتر حصہ امریکہ میں گزارنے کے باوجود گھر کا ماحول خالص مذہبی، پاکستانی اور تہذیبی تھا۔اردو سے محبت اُنہیں ورثہ میں ملی تھی اس لیے وہ نہ صرف اردو کے مداح بلکہ ترقی کے لیے بھی کوشاں رہتے تھے۔لکھنوی انداز کے ساتھ پاکیزہ اور شیریں زبان۔اظہار میں ندرت اور سوچ میں انتہائی وسعت گہرائی اور تجسس تھا۔ان کے ادبی کام کو برصغیر میں ہی نہیں سراہا گیا بلکہ امریکہ میں بھی وہ ایک ممتاز ادیب اور شاعر کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔وہ امریکہ کے ادبی افق پر نمودار ہوئے تو واشنگٹن پریس کلب کے ممبر اور امریکن پوئٹری سوسائٹی کے ممبر بھی بنے۔نیز ''اردو ٹائمز'' میں کالم نگاری بھی کرتے رہے اور انگریزی اور اردو میں بہت سی کتابیں لکھیں۔شاعری میں جمالیاتی انداز، گہری سوچ، وسعتِ نظر، اجتہاد، مکاشفہ، سائنس، مذہب، آرٹ اور وقت کی اہمیت اور تاریخ ان کے کلام میں ہر جگہ عیاں ہے۔اُن کا کہنا تھا کہ علما کے لیے اب لازم ہو گیا ہے کہ وہ روایتی مذہبی اور تعلیمی تصور کے علاوہ جدید علوم اور سائنس کو ساتھ لیکر چلیں ورنہ قرآن اور سنت کی گہرائی کو سمجھنا اور موثر انداز میں یہ پیغام دوسروں تک پہنچانا ممکن نہیں رہے گا اور قیادت کسی اور کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔صفوت علی کا کہنا تھا کہ مستقبل اسلام کا ہے۔اسلام وقت کے اعتبار سے آخری عظیم مذہب ہے۔اور بنیادی سائنس کے ارتقائی حساب سے ارتقائی طور پر دوسرے مذاہب سے بہت آگے اور موجودہ وقت کے سائنسی حقائق سے بھرپور اور مکمل ہے۔

صفوت علی نے خالقِ کائنات، رسول کریمؐ اور اسلامی شعائر پر بھرپور انداز میں اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار کیا ہے۔وہ ایک موثر مبلغ بھی تھے اور انہوں نے کئی غیر مسلموں کو مشرف بہ اسلام بھی کیا۔

صفوت سائنس، مذہب اور شاعری کو علیحدہ کرنے کے قائل نہ تھے

بلکہ ان کے امتزاج کے بغیر شاعری کو نامکمل سمجھتے تھے۔ان کے چند اشعار غور طلب ہیں۔

طواف کرتے ستاروں کے درمیاں دیکھوں
عجیب شوقِ زیارت کہ ''لامکاں'' دیکھوں
مجھے پتہ ہے کہ شہ رگ سے بھی قریب ہے تُو
نہ جانے وقتِ دعا کیوں میں آسماں دیکھوں
سولکھ سکا ہوں نہ لکھ پاؤں گا تیری تعریف
نہ جانے کیوں یہ قلم پھر بھی میں رواں دیکھوں

اور پھر کائنات میں آگے جھانکتے ہوئے ''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں'' کے مصداق

ہمارے گرد ہی بارانِ روشنی تو نہیں
اسی میں سدرۃ جبریلؑ گلستاں دیکھوں

جس طرح زمین چاند ستاروں کی طرح تمام اجرامِ فلکی حرکت پذیر رہتے ہیں اسی طرح کہکشائیں بھی گردش میں ہیں ان کے درمیان بلیک ہول (Black Hole) ایک ایسا عظیم اور انتہائی ٹھوس مادہ ہے جو قریب سے گزرتے ہوئے ٹوٹے ستاروں حتیٰ کہ روشنی کی شعاعوں کو بھی بڑی تیزی سے ہڑپ کر لیتا ہے اور یہاں سے روشنی منعکس نہ ہونے کی بنا پر یہ جگہ سیاہ نظر آتی ہے۔مرحوم صفوت علی نے اس سائنسی حقیقت کا کس قدر خوبصورت تشبیہہ سے ذکر کیا ہے ملاحظہ کیجیے اور غور کیجیے:

مزار ہے کوئی ٹوٹے ہوئے ستاروں کا
کہ ایک سیاہ بھنور وسط کہکشاں دیکھوں

صفوت علی مرحوم کے بقول وہ دس فیصد حال اور نوے فیصد مستقبل کے شاعر تھے۔ان کی مشہور تصنیفات میں ''فکرِ فردا'' (مضامین کا مجموعہ) ایک ایسی کاوش ہے جو انہوں نے ایک مدبر اور مفکر کے طور پر تحریر کی ہے اور ملت کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے علم اور تحقیق اور مسلسل ترقی کے اصولوں پر جدید اور آنے والے دور کے چراغ سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنے پر اصرار کرتی ہے۔

صفوت علی مرحوم کی ایک مشہور تصنیف ''مثنویٔ وقت'' ایک عظیم الشان جہان کی سیر ہے جس میں اصلی کردار ''وقت'' ہے۔تصوف اور وسعتِ خیال سے وہ بیان کرتے ہیں کہ لامحدود وقت ازل سے پہلے اور ابد کے بعد کیسے پیدا ہوا۔کیسے ختم ہوجائے گا (یا اس کی ضرورت نہیں رہے گی) محض چاند اور سورج سے وقت کی پیائش کو محدود کر دینا اس کے کائناتی نظام میں تعین کو رکاوٹ بیان کرتے ہیں۔مصنف نے سائنسی تصوف اور جدید فلکیاتی سائنس کے مطالعہ کے باعث دونوں علوم کو یکجا کر کے نہایت خوبصورت اور دلچسپ تصویر کشی کی ہے۔اور اپنی غیر معمولی تخلیقی توانائی کا مظاہرہ کیا ہے۔اُن کا بیان ہے کہ سائنسی، مذہبی اور شعری علوم خود بخود صانع حقیقی و خفی کی طرف رہنمائی کا باعث بنتے ہیں۔''مثنویٔ رسول'' میں صفوت علی نے جہاں لا انتہا عقیدت کے پھول نچھاور کیے ہیں وہاں سیرت اور اجتہادی معاملات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔وہ اپنے الفاظ میں پوری دُنیا کو اپنا وطن کہتے ہیں:

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

''سوادِ حور'' اُن کا شعری مجموعہ ہے جس میں کائنات کے ذرے ذرے کا احاطہ کیا گیا ہے۔جو خوبصورت اور انوکھے انداز میں قاری کو اسرار و معانی کی پرتیں کھولنے پر آمادہ کرتا ہے۔ جہاں اس میں سائنسی موضوعات کی خاص اہمیت ہے وہاں مصنف کی تحریروں میں حبِّ رسولؐ سے سرشار نعتوں اور غزلوں کے علاوہ بہت سے زمانے چشمِ تصور سے دیکھے جاسکتے ہیں۔

صفوت علی صفوت مرحوم کے نادر اور قیمتی ادبی کام پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے اور لکھا جاتا رہے گا اور ان کی علمی اور تحقیقی کاوشیں انہیں زندہ رکھیں گی۔

اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔آمین

## ''لال پُل کا دیوانہ''

دیپک کنول کے افسانوں کی ایک اہم بات یہ ہے کہ اُن کے کئی کردار مسلمان ہیں۔وہ مسلم تہذیب وثقافت سے بخوبی آشنا ہیں اور اسے بہت قریب سے دیکھ چکے ہیں۔اس لیے اُن کے کئی کردار اپنی پوری ثقافتی اور مذہبی روایات کی عکاسی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ایسے افسانوں میں ''آغوش''، ''زون''، ''آخری جام''، ''شنکر پورہ کا بھگوان''، ''گوپال پورہ کا پجاری'' اور ''لال پُل کا دیوانہ'' جیسے منفرد افسانے شامل ہیں جن میں مسلمان کردار اپنی پوری توانائی سے موجود ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے مذہبی کرداروں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے بلکہ اکثر افسانوں میں وہ مسلم کرداروں کے شانہ بشانہ افسانے کے پلاٹ کی بُنت کاری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔دیپک کنول کا یہ افسانوی مجموعہ ''لال پُل کا دیوانہ'' یقیناً ادبی اور علمی حلقوں میں بھرپور پذیرائی حاصل کرے گا اور عام قاری اس کے مطالعہ سے لطف و انبساط کے کئی لمحات سمیٹ سکتا ہے۔میں دیپک کنول کو اس مجموعے کی اشاعت پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ وہ اسی طرح کے مزید کئی مجموعے اردو ادب کی جھولی میں ڈالیں گے۔

آفتاب خان

رابطہ: jawaharfilms@gmail.com

# ایک صدی کا قصہ
## سادھنا
دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

فلم ''چار سو بیس'' کا وہ صدا بہار گانا ''مڑ مڑ کے نہ دیکھ۔ مڑ مڑ کے نہ دیکھ'' جو نادرہ پر فلمایا جا رہا تھا۔ اُسمیں بہت ساری ڈانسرز اُسکے ساتھ ناچ رہی تھیں۔ ان ہی گروپ ڈانسرز میں پندرہ سال کی ایک نوخیز لڑکی بھی ناچ رہی تھی۔ اس لڑکی کا نام سادھنا شودسانی تھا۔ یہ لڑکی 2 ستمبر 1941 میں کراچی کے ایک سندھی پریوار میں پیدا ہوئی تھی۔ سادھنا کے والد سادھنا بوس کے اتنے دیوانے تھے کہ جب اُنکے گھر میں بیٹی پیدا ہوئی تو اُنہوں نے اس کا نام سادھنا رکھ دیا۔ یہ ماں باپ کی اکلوتی بچی تھی جسے اُسکی ماں نے آٹھ سال کی عمر تک گھر میں ہی پڑھایا لکھایا۔ جب 1947 میں ملک میں ہندو مسلم فسادت پھوٹ پڑے تو یہ لوگ کراچی سے بھاگ کر بمبئی آ گئے اوور سائن (بمبئی) کی ایک چال میں رہنے لگے۔ کراچی سے جتنے بھی سندھی پریوار اجڑ کر آئے تھے اُنہیں چمبور کے علاقے میں بسایا گیا تھا جس کا نام سندھی کالونی پڑ گیا۔ سادھنا کے جو چاچا تھے اُن کا نام ہری شودسانی تھا۔ ہری شودسانی فلموں میں چھوٹے موٹے رول کرنے لگے۔ یہ وہی ہری شودسانی ہیں جنکی بیٹی ببیتا نے ہیروئن کا رول ادا کیا اور بعد میں رندھیر کپور سے شادی کی اور اس شادی سے اُنکی دو بیٹیاں ہوئیں جو کامیاب فلمی ہیروئینیں بن گئیں۔ ان کا نام کرشمہ اور کرینہ ہے۔ سادھنا جب چھوٹی تھی تو اپنے چاچا کو فلموں میں دیکھ کر اُسکے دل میں بھی فلموں میں کام کرنے کی اُمنگ جاگی۔ اُسکے والد نے اُسکے شوق کو بڑھاوا دیا۔ اُسے ہر ہفتے دو فلمیں دیکھنے کی اجازت تھی۔ دراصل اُسکے ماں باپ نے اپنی ساری اُمیدیں اسی پر لگا رکھی تھیں۔ جب وہ پندرہ سال کی ہوئی تو اُسنے جے ہند کالج میں داخلہ لیا۔ کالج میں اُسنے ڈراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کیا۔ اتفاق سے ایک سندھی پرڈیوسر نے اُس کا ڈرامہ دیکھا۔ وہ اُسکی اداکاری سے اتنا متاثر ہوا کہ اُسنے پہلی سندھی فلم ''ابھانا'' کے لئے اُسے ایک رول کی پیش کش کی۔ اس فلم میں اُس زمانے کی مشہور اداکارہ شیلا رومانی ہیروئن تھی جس کی چھوٹی بہن کا کردار اُسے نبھانا تھا۔ بے مانگے ہی اُسکے من کی مراد پوری ہوئی تھی۔ اُسنے اس پیشکش کو لبیک کہا۔ اس فلم کے لئے اُسے ایک روپیہ کا معاوضہ پیش کیا گیا جو اُسنے بخوشی قبول کیا۔ فلم بن کے ریلیز ہوئی اور بیحد کامیاب رہی باوجو اس کے سادھنا کو مزید کوئی کام نہیں ملا۔ ایک دن فلم دنیا کے مقبول و موقر اخبار ''سکرین'' میں اس فلم کا ایک اشتہار چھپا۔ اس اشتہار پر ششادھر مکھرجی کی جوہر شناس نظر پڑ گئی۔ ششادھر مکھرجی ایک جانے مانے پرڈیوسر تھے جن کی اُس زمانے میں طوطی بولتی تھی۔ اُنہوں نے سادھنا کو اپنے آفس میں بلوالیا۔ وہ اپنے بیٹے جائے مکھرجی کو لے کر ایک فلم بنانا چاہتے تھے جس کا نام ''لوان شملہ'' تھا۔ اس فلم کے لئے اُنہوں نے ڈائرکٹر آر۔ کے۔ نیر کو بریک دیا تھا۔ آر۔ کے۔ نیر اس سے پہلے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ سادھنا کو اُنہوں نے اس فلم میں بطور ہیروئن لینے کا فیصلہ کیا مگر شرط یہ رکھی کہ اُسے فلمالیہ ایکٹنگ اسکول میں جائے مکھرجی کے ساتھ مزید ایکٹنگ کی ٹریننگ لینی ہوگی۔ سادھنا فوراً راضی ہوگئی۔

جب فلم سیٹ پر چلی گئی اور سادھنا میک اپ کر کے سیٹ پر پہونچ گئی تو آر۔ کے۔ نیر نے محسوس کیا کہ سادھنا کا ماتھا کافی چوڑا ہے جو اسکرین پر اچھا نہیں لگے گا۔ اُسے ایک برٹش اداکارہ کا خیال آیا جس کے ساتھ یہی مسلہ تھا اور اُسنے اپنے ماتھے کو بالوں کی لٹوں سے اسطرح چھپا لیا تھا کہ اُسکا ماتھا بھی ڈھک گیا تھا اور اُسکی شکل وصورت بھی نکھر گئی تھی۔ آر۔ کے۔ نیر نے وہی فارمولہ آزمایا۔ سادھنا کے ماتھے کو بالوں سے اسطرح چھپایا گیا کہ ماتھا بھی چھپ گیا اور سادھنا کی خوبصورتی میں بھی چار چاند لگ گئے۔ فلم جب ریلیز ہوئی تو یہ فلم باکس آفس پر دھوم مچا گئی۔ ساتھ ہی سادھنا کے بالوں کا اسٹائل ''سادھنا کٹ'' سے اتنا مشہور ہوا کہ لڑکیوں نے اُسی کی طرح بال سنوارنے شروع کر دئے۔

''لوان شملہ'' کی کامیابی دیکھ کر اپنے زمانے کے مشہور اور ذی وقار ہدایت کار بمل رائے نے اُسے اپنی فلم ''پرکھ'' کے لئے سائن کیا۔ جب وہ میک اپ کر کے اپنے بالوں کے اسٹائل ''سادھنا کٹ'' کے ساتھ سیٹ پر آ گئی تو بمل رائے نے اُسے واپس میک اپ روم میں بھیج دیا اور اُس سے کہا گیا کہ وہ ماتھے کو کھلا چھوڑ دے اور بالوں کو پیچھے لے جا کر چوٹی باندھ لے۔ بمل رائے کو سادھنا کا ''سادھنا کٹ'' قبول نہ تھا۔ وہ اس فلم میں گاؤں کی ایک سیدھی سادی لڑکی کا کردار نبھا رہی تھی اسلئے وہ اُسے سادگی کے ساتھ پیش کرنا چاہتے تھے۔ اس فلم میں اُسکی اداکاری کو بیحد سراہا گیا اور اُسے اچھوتی اداکاری کرنے کے لئے اعزاز سے نوازا گیا۔ اسی بیچ دیو آنند نے یہ فلم دیکھی۔ وہ اُسکی اداکاری سے اتنا متاثر ہو کہ اُسنے اُسے اپنی فلم ''ہم دونوں'' میں کام کرنے کی پیشکش کی جو اُسنے فوراً قبول کی۔ فلم ''ہم دونوں'' نے سادھنا کو شہرت کی چوٹی تک پہونچا دیا۔ اس فلم کا ایک گانا ''ابھی نہ جاو چھوڑ کے کہ دل ابھی بھرا نہیں'' رومانٹک گانوں میں ایک سنگ میل کی حثیت رکھتا ہے۔

سادھنا بڑی تیزی کے ساتھ کامیابی کی سیڑھیاں چڑھتی جا رہی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب فلم انڈسٹری پر کئی ساری ہیروئنز کا دبدبہ تھا۔ سادھنا نوتن کو اپنا آدرش مانتی تھی۔ وہ اُسی کی طرح کام کرنا چاہتی تھی۔ ایک کے بعد ایک فلم کی کامیابی سے سادھنا بڑے بڑے ہدایت کاروں کی پہلی پسند بنتی جا رہی تھی۔ رشی کیش مکھرجی نے دیو آنند کو لیکر فلم ''اصلی نقلی'' بنانے کا فیصلہ کیا تو ہیروئن کے لئے اُن کی پہلی پسند سادھنا تھی۔ سادھنا نے ایک سیدھی سادی لڑکی کا رول ادا کر کے اپنے کردار کو یادگار بنا دیا تھا۔ ایک طرف شنکر جے کشن کی مدہوش کرنے والی موسیقی دوسری طرف دیو آنند اور سادھنا کی رومانٹک جوڑی فلم ''اصلی نقلی'' کے لئے سونے پر سہاگہ ثابت ہوئی۔ فلم نے بزنس کے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے۔ سادھنا کامیابیوں کی بلندیوں کو چھوتی چلی جا رہی تھی۔ اسی سال فلمالیہ کی ایک اور فلم

''ایک مسافر ایک حسینہ'' ریلیز ہوئی یہ فلم بھی خاصی کامیاب رہی۔ یہ دور بلیک اینڈ وائٹ فلموں کا تھا۔ جب ایچ۔ایس روہیل نے ''میرے محبوب'' بنانے کا فیصلہ کیا تو اُنکی پہلی پسند سادھنا ہی تھی۔ یہ پہلی فلم تھی جو ٹیکنیک کلر میں بننے جا رہی تھی۔ یہ ایک مسلم سوشل ڈرامہ تھا اور اسمیں سادھنا پہلی بار ایک مسلم لڑکی کا کردار نبھانے جا رہی تھی۔ کردار کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے جب اُسنے اس فلم میں سادھنا کٹ نہ اپنانے کا فیصلہ کیا تو روہیل صاحب نے اُسکی رائے سے اتفاق نہ کرتے ہوئے اُسے سادھنا کٹ کے ساتھ ہی کیمرہ کے سامنے آنے کی ہدایت دی تو اُسے ڈائرکٹر کا حکم ماننا پڑا۔ اس فلم میں اُسنے چوڑی دار پاجامہ اور کرتے کا جو پیرہن استعمال کیا اُسنے سادھنا کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دئے۔ کسی کے سان گمان میں نہیں تھا کہ یہ فلم اسقدر کامیاب ہوگی۔ اس فلم نے تو باکس آفس پر تہلکہ مچا دیا۔ 1960 میں پانچ فلموں میں سب سے زیادہ کمائی کرنے والی ''میرے محبوب'' سرفہرست تھی۔ اسمیں روہیل صاحب نے جس سلیقے سے سادھنا کو پیش کیا تھا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ سادھنا نے پہلی بار برقعہ پہن کر صرف اپنی مسحور کن آنکھوں سے اسکرین پر جو غضب ڈھایا تھا وہ ناقابل بیان تھا۔ لوگ اُسکی ایک جھلک دیکھنے کے لئے پاگل ہونے لگے تھے۔

راج کھوسلہ پر فلم ''ایک مسافر ایک حسینہ'' کے دوراں سادھنا کی مخمور آنکھوں کا جادو چل گیا تھا۔ وہ سادھنا کو اپنی ہر فلم میں دیکھنا چاہتا تھا۔ جب اُسے ایک سسپنس تھرلر ''وہ کون تھی'' کی ہدایت کاری کی باگ ڈور تھمائی گئی تو اُسنے اس فلم میں بھی سادھنا کو ہی لینے کا فیصلہ کیا۔ اس پوری فلم میں سادھنا سفید ساڑھی میں نظر آئی۔ یہ فلم بھی باکس آفس پر کامیاب رہی۔ اس فلم کے لئے سادھنا کو بہترین اداکارہ کا فلم فیئر ایوارڈ بھی ملا۔ اس فلم کی کامیابی کے بعد سسپنس تھرلر فلموں کے لئے راج کھوسلہ کے گھر پر پرڈیوسروں کی لائن لگ گی۔ اُسنے سادھنا کو دو فلموں کے لئے سائن کیا۔ ''میرا سایہ'' اور ''انیتا''۔ ''میرا سایہ'' میں سادھنا کا ہیرو سنیل دت تھا۔ اسمیں سادھنا کا ڈبل رول تھا۔

یہ وہ دور تھا جب سادھنا کی توتی بولتی تھی۔ ایک سال میں اُسکی چار چار فلمیں ریلیز ہوتی تھیں اور اپنی محبوب اداکارہ کو دیکھنے کے لئے اُسکے پرستار سینما ہال پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ اسی سال سادھنا کی تین اور فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ان میں ایک تھی ''راجکمار'' جسمیں اُسکا ہیرو شمی کپور تھا۔ ''راجکمار'' میں اُسنے ایک شہزادی کا رول ادا کیا تھا۔ اس فلم نے بھی کامیابی کے ڈنکے بجادئے۔ اسی سال اُسکے من کی مراد تب پوری ہوئی جب راج کپور کے ساتھ اُسکی پہلی فلم ''دلہا دلہن'' یا یوں کہئے دوسری فلم ریلیز ہوئی۔ پہلی فلم ''شری چار سو بیس'' تھی جسمیں اُسنے ایک گروپ ڈانسر کا رول ادا کیا تھا۔ اُسنے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ جسکی فلم میں اُسنے گروپ ڈانسر کا رول ادا کیا تھا ایکدن وہ اُسکی ہیروئن بنے گی۔ فلم ''دلہا دلہن'' نے بھی باکس آفس پر دھوم مچادی۔ ایک اور فلم بھی اُسنے 1964 میں کی تھی جس کا نام ''پکنک'' تھا جو کسی وجہ سے ریلیز نہ ہوسکی۔

1965 کا سال سادھنا کے لئے سب سے خوشگوار سال رہا۔ پہلی بار اُسنے دو بڑے پرڈیوسر ڈائرکٹرس کی فلمیں کیں۔ ایک تھے بی آر چوپڑہ اور دوسرے تھے رامانند ساگر۔ چوپڑہ صاحب اپنے چھوٹے بھائی کی ہدایت کاری میں ایک ملٹی سٹار فلم بنا رہے تھے جس کا نام ''وقت'' تھا۔ اس فلم میں راجکمار، سنیل دت، ششی کپور، شرمیلا ٹیگور، بلراج ساہنی اور سادھنا کام کر رہے تھے۔ یہ اپنے وقت کی پہلی فلم تھی جسمیں اتنے سارے ایکٹرس کو یکجا کیا گیا تھا۔ اسمیں سادھنا کی شان ہی نرالی تھی۔ اُسنے جو چوڑی دار شلوار کرتے کو فلموں میں متعارف کیا تھا، اس نے اُسکی خوبصورتی میں چار چاند لگائے تھے۔ سادھنا نے اپنا رول اس خوبی سے ادا کیا تھا کہ فلمی شائقین اُسکی اداکاری دیکھ کر عش عش کر اُٹھے۔ دوسری فلم ''آرزو'' تھی جو کہ کشمیر کے پس منظر میں فلمائی گئی ایک صدا بہار لو اسٹوری تھی جسمیں اُسکے مدمقابل راجندر کمار اور فیروز خان تھے۔ اس فلم کو شنکر جے کشن نے اپنی دلکش اور روح پرور دھنوں سے آراستہ کیا تھا۔ سادھنا اس فلم میں اپنے روایتی پوشاک چوڑی دار پاجامہ اور کرتے کیساتھ اسکرین پر غضب ڈھا رہی تھی۔ اس فلم نے بزنس کے ساری اگلے پچھلے ریکارڈ توڑ ڈالے تھے۔ یہ فلم بھی 1965 میں ریلیز ہوئی۔

1966 میں راج کھوسلہ کی ہدایت میں بنی فلم ''میرا سایہ'' ریلیز ہوئی۔ اسمیں سادھنا کا ڈبل رول تھا۔ اس فلم میں سادھنا کا ہیرو سنیل دت تھا۔ اس فلم میں سادھنا نے دونوں رول اس خوبی اور نفاست سے ادا کئے تھے کہ ناظرین اُسکی اداکاری دیکھ کر عش عش کر اُٹھے تھے۔ اس فلم نے بھی باکس آفس پر تہلکہ مچا دیا۔ اس فلم کا مشہور گانا ''جھمکا گرا رے'' آج تک کانوں میں گونج رہا ہے۔ اس میں سادھنا کی دمدار اداکاری دیدنی تھی۔ سادھنا لاکھوں دلوں کی دھڑکن بن چکی تھی۔ وہ اُسکی ایک جھلک دیکھنے کے لئے لوگ بے تاب رہتے تھے۔ سادھنا تو کسی اور کے پیار میں گرفتار ہو چکی تھی۔ اُسکے دل میں پیار کا شگوفہ فلم ''لوان شملہ'' کی فلمبندی کے دوراں ہی کھلا تھا۔ وہ اپنے ڈائرکٹر رام کشن نیر کے پیار میں گرفتار ہو چکی تھی۔ وہ اُس سے شادی کرنا چاہتی تھی مگر گھر والوں نے اسے اس بات کی اجازت نہیں دی کیونکہ وہ تب کم سن تھی۔ 1966 میں اُسنے آر۔کے۔نیر کے ساتھ سات پھیرے لئے اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُسکی ہوگئی۔

شادی کے فوراً بعد اُسے پتا چلا کہ وہ تھائی راڈ کے مرض میں مبتلا ہو چکی ہے۔ وہ اس کا علاج کرانے کے لئے امریکہ چلی گئی جہاں بوسٹن میں اُس نے اس بیماری کا علاج کروایا۔ وہاں دو سال تک زیر علاج رہنے سے آر۔کے۔نیر دیوالیہ ہو کر رہ گیا۔ صحت یاب ہو کر جب وہ وطن لوٹی تو اُسکے شوہر نے اُسے فلمیں سائن کرنے کے لئے دباؤ ڈال دیا۔ اُسنے دو فلمیں سائن کیں جن کا نام ''انتقام'' اور ''ایک پھول دو مالی'' تھا۔ ''انتقام'' میں اُسکے ساتھی اداکار سنجے خان اور اشوک کمار تھے اور اسکے ہدایت کار سادھنا کے شوہر آر۔کے۔نیر تھے جب کہ ''ایک پھول دو مالی'' میں وہ سنجے خان اور بلراج ساہنی کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ دونوں فلمیں 1969 میں ریلیز ہوئیں اور بیحد کامیاب رہیں۔ اسکے بعد موہن کمار کی

ہدایت میں بننے والی ہٹ فلم ''آپ آئے بہار آئی'' 1971 میں ریلیز ہوئی۔اس فلم میں اُسکے ہیرو راجندر کمار تھے۔ 1972 میں اُسکی ایک اور فلم ریلیز ہوئی جس کا نام ''دل دولت اور دنیا'' تھا جسمیں اُسکے ساتھی اداکار راجیش کھنہ اور اشوک کمار تھے۔ایکٹنگ میں دولت،عزت اور شہرت حاصل کرنے کے بعد اُسنے ڈائرکشن کرنے کا فیصلہ کیا۔اس فلم کو پرڈیوس بھی انہوں نے ہی کیا۔پرڈیوسر سادھنا کے شوہر آر۔کے۔نیر تھے۔اس فلم کا نام ''گیتا میرا نام'' تھا۔اس فلم کے مرکزی کردار سنیل دت اور فیروز خان تھے اور اُنکے مدمقابل وہ خود تھی۔یہ فلم 1972 میں ریلیز ہوئی۔1974 میں شمی کپور کے ساتھ اُسکی فلم ''چھوٹے سرکار'' ریلیز ہوئی جو بیحد کامیاب رہی۔اس فلم کو شنکر جے کشن نے اپنی سحر انگیز دھنوں سے آراستہ کیا تھا۔اس فلم کے بعد منوج کمار اور بلراج ساہنی کے ساتھ سادھنا کی فلم ''امانت'' 1977 میں ریلیز ہوئی۔''محفل'' اور ''اُلفت کی نئی منزلیں'' ایسی دو فلمیں ہیں جو آج تک ریلیز نہیں ہوسکیں۔موخرالزکر فلم جانے مانے صحافی کے کے رازداں کی فلم تھی جو اس فلم کی تکمیل کی جدوجہد میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اُسنے اپنے شوہر کے ساتھ مل کر ایک پروڈکشن کمپنی بنائی جس کے تحت اُنہوں نے فلم ''پتی ورتا'' بنانے کا فیصلہ کیا۔اس فلم کے خاص اداکاروں میں ڈمپل کپاڈیہ، نئے کلاکار شیکھر سمن اور سدھا چندرن تھے۔اسکے ہدایت کار مدن جوشی تھے۔اس فلم کی ناکامی کے ساتھ ہی سادھنا نے فلمی دنیا سے سنیاس لینے کا فیصلہ کیا۔اسی بیچ اُسکی آنکھیں خراب ہوئیں جس وجہ سے وہ کیمرہ سے دور ہوگئی۔وہ کسی فلمی تقریب میں شامل نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی وہ کسی سے ملتی تھی سوائے اپنی چند فلمی سہیلیوں کے جن میں آشا پاریکھ وحیدہ رحمان، نندہ اور ہیلن شامل تھیں۔اپنی تایا زاد بہن ببیتا کے ساتھ اُسکا ملنا جلنا نا ہونے کے برابر تھا۔وہ کسی بھی فوٹو گرافر کو اپنا فوٹو لینے نہیں دیتی تھی۔کسی ٹی وی چینیل کو انٹرویو نہیں دیتی تھی۔وہ اپنے چاہنے والوں کی اُس شبیہ کو توڑنا نہیں چاہتی تھی جو اُنہوں نے برسوں سے اپنے دل میں بسا کے رکھی تھی۔

اُنکی شادی شدہ زندگی تیس سال پر محیط رہی۔ان تیس سالوں میں اُنہوں نے کافی اُتار چڑھاو دیکھے۔پہلے اُسکی بیماری پھر بچے کا زائل ہونا۔یہ دوہرے غم تھے جس نے سادھنا کو کرچی کرچی کرکے رکھ دیا۔اس حادثے کے بعد اُنکی کوئی اولاد نہ ہوئی۔مرے پر سو درے۔سادھنا ابھی اپنے پچھلے غموں سے اُبھرنے نہ پائی تھی کہ 1995 میں سادھنا کا شوہر اس دنیا سے چل بسا۔وہ اکیلی رہ گئی۔اُسنے اپنے آپ کو گھر کی چار دیواری میں قید کرکے رکھ دیا۔جسکے چاہنے والے لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں تھے وہ اکیلی اور تنہا زندگی گزار رہی تھی۔وہ جس بنگلے میں پچاس سال سے رہ رہی تھی اس بنگلے کا نام ''سنگیتا بنگلہ'' تھا۔یہ دو منزلہ بنگلہ مشہور گلوکارہ آشا بھونسلے کی ملکیت تھی جو اُسنے کرایے پر دے رکھا تھا۔نچلی منزل میں سادھنا اپنی بھانجی اور اپنے نوکروں کے ساتھ رہ رہی تھی جب کہ پہلی منزل پر بے بی ناز رہا کرتی تھی۔جب بے بی ناز کا انتقال ہوا تو اُسکے شوہر سوبی راج نے دوسری منزل پر رہنے والے ایک بدنام شخص سے بھاری رقم وصول کرکے پہلی منزل اُسکی تفویض میں دیدی وہ بدنام شخص جو کہ ایک بلڈر بھی تھا اس بنگلے کو ہڑپنا چاہتا تھا اسلئے اُس نے سادھنا سے بنگلہ خالی کرنے کے لئے کہا۔13 اگست 2012 کو پہلی بار سادھنا کو گھر سے نکل کر پولیس اسٹیشن تک جانا پڑا اور وہاں پر اُسنے بلڈر کے خلاف یہ شکایت درج کرائی کہ اُسنے اُسے مار ڈالنے کی دھمکی دی ہے۔بلڈر کو فوراً گرفتار کیا گیا۔ایکطرف وہ بیماری سے جوجھ رہی تھی اور دوسری طرف یہ نئی نئی مشکلیں۔شوہر کے چلے جانے کے بعد اُسے ایک پل کا بھی سکون نہ ملا۔بلڈر جب ضمانت پر چھوٹ گیا تو اُسنے اُسکے خلاف ہتک عزت کا کیس دائر کر دیا۔کہانی یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ایکطرف وہ بلڈر تھا تو دوسری طرف آشا بھونسلے نے اُس پر پولیس کیس کر دیا کہ اُسنے اُسکے بنگلے کے باغیچہ میں کچھ پھیر بدل کیا ہے۔وہ اکیلی تین تین کیس لڑ رہی تھی۔اُسنے کئی بار اپنے وکیل سے یہ شکایت کی کہ کیا اس عمر میں اُسے کورٹ کچہری کے چکر لگانے پڑیں گے۔یہ غم اُسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔پرانے زمانے کی اداکارہ اور سادھنا کی سہیلی تبسم نے اپنے ایک مضمون میں اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ سادھنا نے فلم والوں سے کئی بار اپیل کی کہ وہ اُسکی مالی اعانت کریں مگر کسی نے اُسکی مدد نہ کی۔اُن لوگوں نے بھی نہیں جنہوں نے سادھنا کو لے کر اپنی تجوریاں بھر لی تھیں۔اُسنے اپنے پرستاروں سے بھی ایک دردمندانہ اپیل کی تھی کہ وہ اُسکی مالی مدد کریں۔کسی نے اُسکی اپیل کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ایک زمانے میں کروڑوں کمانے والی سادھنا پیسے پیسے کی محتاج ہو کر رہ گئی تھی۔نہ کوئی ہمدم نہ کوئی دمساز ،نہ کوئی رفیق نہ غمگسار۔اُسکی تایا زاد بہن ببیتا بھی اُسکے رابطے میں نہیں تھی کیونکہ کچھ سال پہلے دونوں گھرانوں کے بیچ کچھ ان بن ہوگئی تھی جس کے سبب انکی آپس میں بول چال بھی بند ہوگئی تھی۔سادھنا چنیدہ لوگوں سے ہی ملتی تھی۔اُسکے ملنے جلنے والوں میں اُسکی وہی گنی چنی سہیلیاں تھیں جو گاہے گاہے اُس سے ملنے اُسکے گھر پر آیا جایا کرتی تھیں۔

جب 2014 کو نندہ کا انتقال ہوا تو وہ اندر سے دہل کر رہ گئی۔اُسنے اس خول سے باہر آنے کا فیصلہ کیا جس میں اُسنے اپنے آپ کو کئی سالوں تک چھپا کے رکھا تھا۔اُسنے اپنے دور کے رشتہ دار ایکٹر رنبیر کپور سے کہا کہ وہ فیشن شو میں حصہ لینا چاہتی ہے بشرطیکہ وہ اُسکے ساتھ چلے۔رنبیر اُسے اپنے ساتھ شو میں لے آیا اور اسطرح وہ برسوں بعد لوگوں کی نظر میں آگئی۔اُسے شو میں بہ نفس نفیس دیکھ کر لوگ خوشی سے پھولے نہیں سمائے۔وہ کافی شگفتہ اور مطمئن نظر آرہی تھی۔یہ اُسکے آخری دیدار تھے۔اُسکے بعد وہ پھر سے لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

سادھنا نے فلم انڈسٹری کے ہر بڑے اداکار کے ساتھ کام کیا۔وہ چاہے جائے مکھرجی ہو یا کشور کمار، راجندر کمار ہو یا شمی کپور، دیو آنند ہو یا راج کپور، بلراج ساہنی ہو یا فیروز خان، منوج کمار ہو یا سنجے خان۔سادھنا کو اُسکے چاہنے والوں نے بھر پور پیار دیا۔بیوگی کے بعد وقت اُس پر بڑا نا مہربان رہا۔ایک طرف اپنی گرتی صحت، دوسری طرف عدالتوں کے رگڑے، اوپر سے تنگ دستی۔یہ ساری چیزیں اُسے اندر ہی اندر کھا گئیں اور 25 دسمبر 2015 کو اُسنے زندگی کی آخر سانس لی اور اپنے پیچھے بے شمار سوال چھوڑ گئی۔

# ''وطن کے دست و بازو''

(۲۳؍مارچ کے حوالے سے)

ڈاکٹر ریاض احمد

(پشاور)

ہمارا دیس ہماری شان ہماری جان ہے ہمدم
بہادر قم کا مَسکن یہی پہچان ہے ہمدم
فضا آزاد ہے اپنی وطن آزاد ہے جب سے
آزادی ہی حقیقت میں ہماری آن ہے ہمدم
ہمارا دین ہماری قوم گردش میں رہے برسوں
ہزاروں گھر ہزاروں جاں ہوئیں قربان اے ہمدم
فرنگی قوم نے دھوکے سے لُوٹا ہند والوں کو
وہ تاجر بن کے یاں آئے تھے انگلستان سے ہمدم

ہماری غیرت ملی غلامی نے سُلا دی تھی
غلاموں سے نہیں بدتر کوئی بھی جان اے ہمدم
غلامی میں ہوئے پیدا تھے جعفر اور صادق بھی
غداروں کا نہیں ہوتا کوئی ایمان اے ہمدم
رہے پابند اسیری میں بہت سے رہنما قومی
نمایاں جو رہا قائد عظیم انسان تھا ہمدم
ہمارا فلسفی رہبر وہ تھا اک شاعرِ مشرق
جگا دی اُس نے سوئی قوم جو بے جان تھی ہمدم

عقابی روح جب جاگی تو منزل ہو گئی آسان
چلی تحریکِ آزادی تو پھر کی شان تھی ہمدم
ہمارے رہنماؤں نے دکھا دی قوم کو منزل
یہ منزل سب کا مَسکن آج پاکستان ہے ہمدم
وطن میں چار موسم ہیں حسیں باغات و دریا ہیں
سبز شاداب میداں اور چولستان ہے ہمدم
ہمالہ بھی یہیں پر ہے، پہاڑی سلسلے بھی ہیں
ہزاروں گام اُونچی جھیل ہے ناران ہے ہمدم
حسیں تر ہیں یہاں ہر سُو مناظر ساری دنیا کے
سکردو، جنتِ کشمیر و بلتستان کے ہمدم

آزادی کے ہیں متوالے جہاں ہے سندھ اور پنجاب
وطن کے جانثاروں کا بلوچستان ہے ہمدم
وطن کی غیرتِ ملّی پہ مر مٹنے کو ہیں تیار
جو خیبر اور پختون خواہ کے سب پٹھان ہیں ہمدم
ہماری سرحدوں پر ہیں وطن کے پاسباں چوکس
محافظ رب ہمارا، پھر جرّی افواج ہیں ہمدم
یہ ملت ایک ہے ساری وطن بھی ایک ہے سب کا
وطن کے دست و بازو بن گئیں قومیتیں ہمدم

ریاضؔ ہم سیکھ لیں رہنا خلوص و امن و محنت سے
تو مستقبل ہمارا یاں عظیم الشان ہے ہمدم

○

# رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

**وجیہہ الوقار** (راولپنڈی)

گرامی قدر گلزار جاوید بھائی،
سلامتی، محبتیں!

تازہ چہارسو ملا گویا زندگی کی نوید مل گئی۔ جینے کی خواہش اور امنگ پہلے سے کہیں بہتر اور تازہ ہوگئی ہے۔ آپ نے اس خاکسار کو اٹھا کر کہاں، کس کارنس پہ سجا دیا ہے کہ اپنے آپ کو حیران آنکھ سے دیکھتا ہوں۔ میری اور جن لوگوں کی کوئی پارٹی یا گروہ نہیں ہوتا انہیں آپ کی طرح چن لینا اور سجا دینا یہ آپ کا ایثار ہے جسے آپ مدتوں سے نبھا رہے ہیں، محض دعاؤں کے بدلے میں۔

ہمارے وطن میں کیسا کیسا بدصورت منظر دیکھنے کو ملتا رہتا ہے ان سب کی تاریکی ہزار گنا بڑھ ہی جائے مگر جب تک آپ ایسے سورج رب قدیر طلوع رکھے گا۔۔۔ ہمارا، ہم۔۔۔۔ میرا، میں۔۔۔ اور آپ کی محبت سے ہم ایسوں کا مان قائم رہے گا۔ اور یہ معاشرہ زیادہ قابل رہائش اور خوبصورت ہوتا جائے گا۔

**یونس جاوید** (لاہور)

برادرم گلزار جاوید صاحب، دعائے صحت و عافیت و خرمی۔

پہلے چہارسو کے جنوری فروری ۲۰۱۶ء کے شمارے کے حوالے سے کچھ بات ہو جائے۔ ڈاکٹر یونس جاوید کے ادبی کام کا آپ نے اچھا انتخاب پیش کیا ہے۔ کچھ سے روشناس ہوا اور متاثر، مزید کو پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

اپنے مرحوم دوست محمد صفدر میر کا یونس صاحب پر مضمون پڑھ کر خوشی ہوئی۔ ’’سوا نیزے پہ سورج‘‘ ایسا افسانہ ہے کہ بہت سوں کو یاد رہے گا۔ سعید نقوی صاحب کے خط سے میرے لیے اپنائیت عیاں ہے، جب پاکستان آنا ہو۔۔۔ اور یقیناً حیدرآباد روانہ ہونے سے پہلے ان کے قدم اس خطۂ زمین پر پڑیں گے جسے کراچی کہا جاتا ہے۔ تو میرے ساتھ تھوڑا وقت گزارنے آجائیں تو ممنون ہونگا۔

عبداللہ جاوید صاحب کی آٹھ نو لائین میرے لیے اطمینان بخش ہیں کہ وہ ’’ناشکرے‘‘ کی تہہ تک گئے ورنہ زیادہ تر نے اُسے سفرنامہ اور وہ بھی میرا سمجھا، یا یہ کہ بعض عجیب و غریب طور پر طریقہ ہائے زندگی کا بیان ہے اور دلچسپ۔ یعنی نہ اس کا موجودہ دور سے کوئی تعلق ہے نہ ہم سے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہونگا۔ انور سدید صاحب کے مضمون میں جامعیت ہے اور عبداللہ جاوید صاحب کی غزل کیا خوب ہے۔

**حسن منظر** (کراچی)

عزیز گرامی گلزار جاوید، سلام۔

چہارسو میں آپ نے میری غزل کے اشعار کو جگہ دی۔ شکریہ۔
افسوس! میری اپنی غلطی سے مندرجہ ذیل شعر بھی درج ہو گیا جس کو میں نے قلم زد کر رکھا تھا۔

مومنوں میں ہم مومن، کافروں میں ہم کافر
ہم کو دین اور دنیا ساتھ ساتھ رکھنی ہے

میں چاہتا ہوں کہ اس شعر کی سوچ سے دست برداری آن ریکارڈ آجائے۔ اسلام آباد یونائیٹڈ کرکٹ پی ایس ایل کا ٹورنامنٹ جیتا۔ آپ کو اور آپ کے پیاروں کو مبارک ہو۔

چہارسو کے بارے میں ایک دعویٰ وثوق کے ساتھ کیا جا سکتا ہے کہ بیک وقت پاکستان، بھارت، اور بیرونِ پاک و ہند کے لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کی نمائندگی میں شاید ہی کوئی اور مجلّہ اس کے مقابل ہو سکے۔ یہی چہارسو کا منفرد امتیاز ہے اور شناخت بھی۔

زیرِ نظر شمارے کو ہی دیکھ لیجیے، اسلام آباد، لاہور، کراچی، پنڈی، کوئٹہ، میرپور خاص، جھنگ، اٹک، انبالہ، جموں، لکھنؤ کشمیر، دہلی، لدھیانہ، سرونج، کولکتہ، بمبئی، لکھنؤ، کینیڈا، امریکا، نیویارک، برمنگھم، برلن وغیرہ۔ کتنے سارے شہروں اور ملکوں کے لکھاریوں اور قاریوں کی نمائندگی ہو رہی ہے۔ کسی جریدے سے اور کیا مانگا جا سکتا ہے۔

**عبداللہ جاوید** (کینیڈا)

میرے گلزار، سالِ نو مبارک۔

خدا کرے ۲۰۱۶ء ہم سب بلکہ پوری دنیا کے لیے خوشیوں کا پیغام لے کر آئے اور ظلم و ستم اور ہر طرح کی ناانصافی کا خاتمہ ہو۔

میری ڈکشنری یا حافظے میں جس قدر بھی تعریفی، توصیفی اور تحسینی الفاظ محفوظ تھے وہ سب میں تمہارے لیے بجا طور پر ضابطہ تحریر میں لا چکا ہوں۔ اب یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اردو ادب کے اربابِ ہنر نجانے کس جہاں میں کھوئے ہوئے ہیں کہ اُنہیں چہارسو جیسا روشن ستارہ دکھائی کیوں نہیں دے رہا۔ اگر صورت حال یہی رہی تو مجھے اردو ادب کے مستقبل سے مایوس ہونے کے سوا قطعاً کوئی چارہ دکھائی نہیں دیتا۔

ہم ماضی کو نہ بھی دہرائیں تو ڈاکٹر یونس جاوید سے منسوب چہارسو بالخصوص ڈاکٹر صاحب سے تمہارا مکالمہ اس امر کی گواہی دے رہا ہے کہ اردو ادب کے دیئے میں ابھی اس قدر تیل باقی ہے کہ وہ اُس کی لَو کو روشن کر سکے۔ ڈاکٹر یونس جاوید بجائے خود اس قدر محنتی اور دُھن کے پکّے انسان ہیں کہ اُن کے فنی اعتراف میں چہارسو کی طرز کا جس قدر بھی کام کیا جائے وہ کم ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا تحریر کردہ احمد بشیر کا خاکہ ’’جوگی‘‘ ایک طرح سے منہ بولتی تصویر ہے اور افسانہ ’’سوا نیزے پر سورج‘‘ ہمارے دور کا ایسا تلخ منظرنامہ ہے کہ جسے پڑھ کر خود پر قابو رکھنا مشکل ہو

گیا۔ میری طرف سے یونس جاوید کے لیے دلی دعائیں اور مبارکباد پہنچا دیجیے۔

شمارے کے دیگر مشمولات میں ڈاکٹر فیروز عالم کا ترجمہ نہایت سلیس اور شستہ ہونے کے ساتھ رواں بھی ہے۔ محترمہ پروین شیر سے درخواست ہے کہ وہ جلد کسی نئے جہان کے سفر پر نکل جائیں تاکہ ہمیں چند سیپیاں سمندروں سے جیسی خوبصورت تحریر پھر پڑھنے کو مل سکے۔ ڈاکٹر ریاض احمد اور مہندر پرتاپ چاند کے ساتھ جناب اختر شاہجہاں پوری، جناب نوید سروش اور جناب عبداللہ جاوید کی تخلیقات قابلِ داد ہیں۔ جمیلہ آپا کی تحقیق و جستجو بھی بہت لطف دے رہی ہے۔ میری طرف سے سب دوستوں کو مبارکباد پہنچا دیجیے۔

**یوگیندر بہل تشنہ** (یو۔ایس۔اے)

مدیرِ محترم، سلام و محبت۔

''سالِ نَو'' کا چہارسو نظر نواز نہیں ہوا تاہم غنیمت ہے کہ سافٹ کاپی سے کچھ جستہ جستہ مستفید ہو لیے تھے۔ آپ نے ڈاکٹر یونس جاوید صاحب کا قرطاس اعزاز جس تہذیبی رکھ رکھاؤ، علمی سلجھاؤ اور ادبی برتاؤ کے ساتھ خوش اسلوبی سے سمیٹا، پھیلایا اور قارئین تک پہنچایا ہے اس کے لیے بخدا اسے جتنا سراہا جائے وہ کم ہے۔

''براہِ راست'' کی سحر کاری، اثر آفرینی اور دلپذیری کے ساتھ مختلف طبقہ ہائے فکر کے تجزیاتی و تنقیدی مطالعے بھی زیرِ اعزاز شخصیت کو محیط کیے ہوئے ہیں۔ ''اندھیرا اُجالا'' اُن ٹی۔وی سیریلز میں شمار ہوتی ہے جنہیں بے پناہ شہرت و مقبولیت اُن کی دیگر تخلیقات کی طرح حاصل ہوئی اور مکالمے زبانِ زدِ خاص و عام رہے۔ دیگر سلسلے جو کسی حد تک پڑھے و دیکھے گئے معلومات سے معمور و دلچسپ تسلسل رکھتے ہیں۔

الختصر! چہارسو حرف حرف جوت جلے کا خوبصورت سلسلہ۔۔۔

**شگفتہ نازلی** (لاہور)

گلزار جاوید صاحب،
السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا شمارہ جنوری، فروری ۲۰۱۶ء مشہور ادبی شخصیت ڈاکٹر یونس جاوید کے نام منسوب کرنے پر آپ دلی مبارک کے مستحق ہیں کیونکہ اس طرح آپ نے سچ مچ ایک ''بوتل کے جن'' کی اس طرح رونمائی کردی ہے جس کے وہ اپنی لاتعداد خدمات کی بنا پر جائز طور پر حقدار تھے جن پر انہیں حکومتِ پاکستان کے علاوہ دیگر قومی اور بین الاقوامی اداروں کی طرف سے ''تمغۂ حسنِ کارکردگی برائے ادب'' کے علاوہ اٹھارہ (۱۸) انعامات و اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ ٹی وی کے ناظرین کے لیے ان کا نام لمبے عرصہ سے بہت مانوس ہے کیونکہ وہ ایک طویل عرصہ سے اُن کے ڈرامے، طویل دورانیے کے کھیل، ٹیلی فلم وغیرہ سے محظوظ ہوتے رہے ہیں۔

اس طرح انہوں نے ناول، افسانے، خاکے اور شاعری وغیرہ کے حوالے سے بیس سے زائد کتب بھی تحریر کی ہیں جس میں تصوف کے حوالے سے ''بہاؤالدین زکریا'' بھی شامل ہے۔ ان کے ادبی کام پر ایم اے اور ایم فل سطح کی تحقیق اور مقالہ جات لکھے گئے ہیں جو ایک مزید اعزاز ہے۔ ''براہِ راست'' میں آپ کے دلچسپ سوالات اور ڈاکٹر یونس جاوید صاحب کے معلومات افزا جوابات پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی شمارے میں اعلیٰ معیار کے افسانے، غزلیں اور نظمیں وغیرہ بھی شامل کی گئی ہیں جس کی وجہ سے ''چہارسو'' بہت دلچسپ لگا۔ مثلاً یونس جاوید صاحب کا ''سوا نیزے پہ سورج'' جذبات کی انتہا کے بعد اچانک اینٹی کلائمکس سے دل بہت اداس ہو جاتا ہے۔ شہناز خانم عابدی کا افسانہ ''نگہدارئ ناموس'' میں بھی کچھ ایسی ہی کیفیت ہے۔ بلراج بخشی کا ''فیصلہ'' بھی بہت دلچسپ ہے جو ایک جج کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ جمیل عثمان کا ''آخری چارہ'' معاشرے کے ایک تلخ پہلو کی تصویر کشی ہے۔ آپا جمیلہ شبنم کا ''مکالمہ'' موجودہ قومی حالات کی ایک طنزیہ اور مزاحیہ تحریر ہے۔ عذرا اصغر نے الطاف فاطمہ صاحبہ اور یعقوب نظامی نے صائمہ کامران کے درج شدہ اشعار بہت خوب ہیں۔

ڈاکٹر نعمانہ نجم رضوی نے ڈاکٹر فیروز عالم کی کتاب ''ہوا کے دوش پر'' کے حوالے ''صرف داستانِ حیات'' کے عنوان سے جو لکھا ہے بالکل حقیقت ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کے ''حالی کے مخالفین'' میں دہلی اور لکھنؤ کے کچھ شعراء کا پانی پت کے حالی سے جس مخاصمانہ رویہ کا ذکر کیا ہے وہ تو دوسرے مشہور شعراء کے ساتھ بھی ہوتا آیا ہے لیکن حالی کے ردِعمل کے بارے میں پڑھ کر اُن کا قد مزید بلند ہو جاتا ہے اور یہ قابلِ تقلید ہے۔

بہت سی خوبصورت نظمیں، غزلیں وغیرہ بھی شامل کی گئی ہیں جن میں مامون ایمن، زہیر کنجاہی، غالب عرفان، آصف ثاقب، مہندر پرتاپ چاند، نسیم سحر، شہزاد نیئر، شگفتہ نازلی، پروین شیر کا کلام لائق توجہ ہے۔

**ڈاکٹر ریاض احمد** (پشاور)

بھائی گلزار جاوید، السلام علیکم۔

ڈاکٹر یونس جاوید پر قرطاسِ اعزاز یقیناً اس سے پہلے کے تمام خصوصی شماروں پر بازی لے گیا۔ یوں تو چہارسو کا ہر قرطاس اعزاز اپنی جگہ اہم رہتا ہے لیکن اس نابغۂ روزگار شخصیت پر شائع کیا گیا ''چہارسو'' اپنی مثال آپ ہے جسے میں نے صفحہ ۹ سے صفحہ ۵۹ تک لفظ بہ لفظ پڑھا اور لطف اندوز ہوا۔ اب تفصیل میں جاؤں تو کس کس کا ذکر کروں اور کسے صرفِ نظر کروں ویسے خاکہ ''جوگی'' اور افسانہ ''سوا نیزے پہ سورج'' جیسی تحریریں ہی یونس جاوید کی شناخت ہیں تو پی۔ٹی۔وی کی ڈرامہ سیریل ''اندھیرا اُجالا'' کو کہاں رکھوں! بہرحال اس قیمتی گوشے کی اشاعت پر آپ قابلِ صد مبارکباد ہیں۔

عارف نقوی کا افسانہ ''خودکشی'' شروع سے آخر تک اپنی گرفت میں لئے رہا جس میں افسانہ نگار نے خوبصورتی کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ اپنی جان ضائع کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ کسی جاندار کی جان بچائی جائے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کی تحریر ''حالی کے مخالفین'' کافی معلومات افزا تھی۔ دیپک کنول نے اس مرتبہ

چاکلیٹی ہیرو''دیوآنند'' پرلکھااورخوب لکھاہےلیکن میں یہاں یہ بتاتاچلوں کہ اُن کی فلموں کی مقبولیت میں زیادہ تر اُن پرفلمائے گئے گانوں کا ہاتھ ہےجو اس زمانے میں ساحرلدھیانوی کی شاعری اورایس ڈی برمن پر مشتمل ہوا کرتے تھے۔بدقسمتی سےاداکاری کےلحاظ سےانہیں کوئی بھی قابلِ ذکرایوارڈ نہ مل سکا۔

**غالب عرفان** (کراچی)

باغ وبہارِ چہارسو،السلام علیکم۔

درمیان کھنڈت پڑگئی تھی۔اب چہارسو نے سلسلہ باندھا تو اطمینان نصیب ہوا۔تازہ ''چہارسو'' میں پروفیسر زہیر کنجاہی کا کلام دیکھا تو جی بھر آیا۔زہیر کنجاہی ہم سے منہ موڑ گئے ہیں۔حق مغفرت کرے وہ بیٹھے بٹھائے اُٹھ کر چلے گئے۔ان کی وفات سے دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہے۔وہ تو گئے ہم بھی تیار بیٹھے ہیں۔(بقول انشاءاللہ خاں انشا) ہوش وحواس مختل ہیں۔اپنی باری کا انتظار ہے۔داغ نے کیا خوب کہا ہے۔

ہوش وحواس تاب وتواں جا چکے ہیں
داغ
ہم بھی تو جانے والے ہیں سامان تو گیا

قرطاسِ اعزاز۔۔۔ڈاکٹر یونس جاوید نے سماں باندھ دیا۔میں اُن کا پُرانا ''دلدادہ'' ہوں۔ان کو پڑھا اور خوب پڑھا۔ان کو دیکھا (ڈراما) اور خوب دیکھا اردو ادب میں اُن کے ڈنکے بجتے رہیں گے۔ڈاکٹر صاحب کی اچھے اچھوں سے یاداللہ تھی دوستوں اور نقد نگاروں نے انہیں جی جان سے سراہا۔بوتل کا جن اور دورِ معراج تحریروں سے ان کی قدر وقیمت واضح ہے۔شوکت صدیقی ایک منجھے ہوئے افسانہ اور ناول نگار تھے۔انہیں ''بوتل کا جن'' کہہ کر تحسین آشنا کرتے ہیں۔دورِ معراج احمد ندیم قاسمی کا صفت نمائی کا خوبصورت انداز ہے۔احمد ندیم قاسمی نے یونس جاوید کواپنایا اوراپنا بنائے رکھا۔ندیم کا کہنا ہے:

''یونس جاوید ایک سچا،جری،حقیقت پسند اور صداقت نگار ادیب ہے۔'' صنعت صداقت نگار بالکل نوطرز اشاریت ہے جو ڈاکٹر یونس جاوید پر بالکل درست بیٹھتی ہے۔اسی طرح اور مشاہیر کا کہا سنا بھی لائقِ صد توجہ ہے۔میں نے ڈاکٹر صاحب کو تخلیق از اظہر جاوید مرحوم میں دل لگا کر پڑھا اور ٹی وی سے آنکھ بھر کر دیکھا۔یعنی اتنا پڑھا،اتنا دیکھا کہ کیا کہوں بس یہی کہوں کہ میں ان کا سرتا پا مداح ہوں۔دعا ہے کہ خدا انہیں سلامت رکھے۔صائمہ کامران کی کتاب ''پانچواں موسم'' سے متعلق یعقوب نظامی کا مضمون پڑھنے کو ملا۔مضمون خاطر جمعی سے تحریر ہوا ہے۔مضمون اپنے سٹائل میں پسندیدہ ٹھہرے گا۔ضمناً اتنا ضرور کہوں گا کہ ۲۰۱۲ء میں ہمارے ہمزادے کے ایک مشہور شاعر ریاض ساغر کا مجموعہ کلام بھی اسی نام ''پانچواں موسم'' سے شائع ہوا تھا۔جسے بڑے بڑوں کی جانب سے پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔ریاض ساغر کے اشعار:

چیخ کر شاخ سے اُڑ جائیں پرندے سارے
اور پیڑوں پہ سرِ شام دھواں رہ جائے
آؤ دو چار گھڑی بیٹھ کے دکھ سکھ بانٹیں
جانے اس بھیڑ میں کون کہاں رہ جائے

دیپک کنول نے دیوآنند کےفن اور تشخص پر اپنے مخصوص پیرائے میں بات کی ہے۔ان کے پاس الفاظ کے ذخیرے کا ایک ''اختصاص'' ہے جسے وہ حسبِ توقع برتتے رہتے ہیں۔بات تو نئی لگتی ہے مگر انداز جانا پہچانا سا محسوس ہوتا ہے۔میری ناقص رائے میں ''مکرّر ارشاد'' اور تواتر سے ایسا ہوتا ہے۔بہر طور دیوآنند جیسے بڑے اداکار پر کھُل کر بات ہوئی ہے۔دیوآنند مقبول ترین اداکار تھے۔نوید سروش اپنے خط میں میرا ذکر محبت سے کرتے مجھے بھی ان کا یہ شعر پسند آیا ہے:

خدا کا شکر ہے ہم ایک چھت کے نیچے رہتے ہیں
محبت ہے، کرامت ہے، یہی تو ماں کے رشتے کی

**آصف ثاقب** (بوئی،ہزارہ)

گلزار جاوید صاحب،السلام علیکم۔

اس بار قرطاسِ اعزاز افسانہ و ناول نگار،منفرد و کامیاب ڈراما نگار،محقق،نقاد،مرتب،خاکہ نگار،شاعر،مدیر اور صاحبِ مطالعہ دانش ور ڈاکٹر یونس جاوید کے نام کر کے آپ نے ایک اور ادبی کارنامہ انجام دیا۔مبارک ہو۔

''براہِ راست'' میں ڈاکٹر یونس جاوید نے آپ کے اہم سوالات کے جوابات اپنے مکمل علمی،سماجی اور مذہبی پس منظر کے ساتھ سچائی سے دیئے ہیں۔بچپن ہی سے اُن کے مطالعے اور غور کرنے کی عادت نے انہیں ایک باصلاحیت تخلیق کار اور غیر جانب دار نقاد و محقق بنا دیا ہے۔انہوں نے نثر کی اہم اصناف پر مستند کام کیا ہے آج بھی اُن کی یادداشت کمال کی ہے پرانے ڈراموں کی تاریخ نشر اور دورانیہ ازبر ہے اور اس نے تو خوب لطف دیا۔

''ایک سو چھپن کباب اور پچپن ٹکے نہ تھے صرف چھپن کباب اور پچپیس ٹکے تھے اور صرف تین عدد نان۔'' (ص۱۹)

''نوائے طرب'' کی فہرست دیکھ کر سانس پھولنے لگتا ہے۔ڈاکٹر یونس جاوید نے ''جوگی'' میں احمد بشیر کو جیتا جاگتا اور متحرک شخصیت کے طور پر پیش کیا ہے کہ احمد بشیر نے اپنے ڈھنگ سے کامیاب زندگی گزاری۔ڈاکٹر یونس جاوید کی عوامی مقبولیت کا آغاز ''کانچ کا پُل''،''رگوں میں اندھیرا'' اور ''اندھیرا اُجالا'' سے ہوا۔اُس وقت پرائیویٹ چینلز نہیں تھے مگر ''اندھیرا اُجالا'' جب نشر ہوتا تھا سڑکوں پر سناٹا اور چائے خانے آباد ہو جاتے تھے۔میں نے کہیں پڑھا ہے یا ڈاکٹر صاحب کی کسی گفتگو میں سنا ہے کہ جب یہ ڈراما نشر ہو رہا تھا تو میں اپنے ملنے اور چاہنے والوں سے چھپ کر قبرستان آجاتا تھا اور وہاں بیٹھ کر قسط لکھتا تھا۔محکمہ پولیس اور جرائم پر اُس کے بعد اُس سے اچھے ڈرامے سامنے نہیں آئے۔

ڈاکٹر فیروز عالم کا ترجمہ کردہ سمرسٹ کا افسانہ ''پی اینڈ او'' ایک

آسیبی ماحول کی دلچسپ رومانی کہانی ہے۔ مسز ہیملین، گیلیگر کے کردار اور ملاین عورت کی محبت کی مضبوطی اور کشش کی طاقت لاجواب ہے اس کہانی میں اپنائیت کے ساتھ ساتھ بے حسی بھی نظر آتی ہے۔

''مجھے خدشہ ہے کہ گیلیگر کرسمس کے دن ہی نہ مرجائے اگر ایسا ہوا تو ہم اپنے ڈانس سے محروم رہ جائیں گے۔'' (ص۔۸۵)

ڈاکٹر فیروز عالم کے مرغوب موضوعات نفسیات، آسیبی ماحول، ماضی اور انسانی عجیب وغریب بیماریاں اور اُن کا حل اور علاج وغیرہ ہیں۔ پروین شیر ''چند سیپیاں سمندروں سے'' اپنا رنگ جمائے ہوئے ہیں ڈسٹرکٹ 6 کی تباہی کے بعد بوڑھے آدمی کا یہ جملہ بے حسی اور محبت کی کیفیت سے بھرا ہوا ہے۔

''میں بہت خوش ہوں کہ میری بیوی یہ سب دیکھنے کو اب زندہ نہیں جو آج یہاں ہو رہا ہے۔'' (ص۔۸۷)

مظفر حنفی، عبداللہ جاوید، شہزاد نیئر، پروفیسر زہیر کنجاہی، نسیم سحر کی غزلوں کے اشعار فنی نزاکتوں سے مزّین ہیں۔ کرامت بخاری، عارف شفیق، وشال کھلّر، تصورّ اقبال اور ابراہیم عدیل کی غزلوں کے کچھ اشعار جدید فکر کی تازگی لیے ہوئے ہیں۔ اشرف جاوید کی پوری غزل متاثر کرتی ہے۔ آصف ثاقب نے خوب رنگ جمایا اور غزل میں احساسات اور فطری مناظر کو پیش کیا۔ اعتبار ساجد نے سماجی رویوں کو اپنی غزل میں جگہ دی ہے۔ غالب عرفان کی نظم ''میرے خوابوں کی رخشندہ دہلیز'' شگفتہ نازلی کی ''منو'' سہیلہ انعام کی نظم اور یوگیندر بہل تشنہ کی نظم ''آئی مس یو'' اپنے متنوع اسلوب اور موضوع کی وجہ سے متاثر کرتی ہیں۔ آپا جمیلہ شبنم کی نظم مکالمہ (روحِ اقبال سے) نظم کیا ہے نوحہ ہے قومی المیہ ہے۔

دیپک کنول نے رومانی ہیرو دیوآنند کو اپنی تحریر میں زندہ کر دیا ہے۔

محترمہ عذرا اصغر نے الطاف فاطمہ صاحبہ پر مختصر مگر دلچسپی سے لکھا ہے۔ آپا الطاف فاطمہ سے میری بھی ۱۹۹۱ء سے ملاقاتیں ہیں بڑی یادگار اور خوب صورت ملاقاتیں۔ اللہ صحت کے ساتھ سلامت رکھے۔ جمیل عثمان کی تحریر کردہ کہانی ''آخری چارہ'' میں بیک وقت دو کہانیاں سفر کر رہی ہیں دونوں میں تجسس ہے اختتام بھی چونکا دینے والا ہے۔ شہناز خانم عابدی کا افسانہ ''نگہداریٔ ناموس'' اپنی بنت اور پیش کش کے لحاظ سے اچھا افسانہ ہے۔

**نوید سروش (میرپورخاص)**

جناب گلزار جاوید، آداب۔

یہ شمارہ ادیب و پروفیسر ڈاکٹر یونس جاوید کے بلند پایہ ادب، مختلف الجہات شخصیت وفن پر مبنی ہے۔ اس شمارے میں ان سے متعلق تمام مضامین اعلیٰ و معیاری ثابت ہوتے ہیں۔ خاصہ طویل خاکہ 'جوگی' تو جاندار و شاندار تخلیق ہے ہی، دیگر تصانیف اور ناقدوں کی تنقیدیں بھی بلند پایہ واقع ہوئی ہیں۔ ان کے منتخب افسانے 'سوا نیزہ پہ سورج' میں روشن موسومہ ہیروئن کے طویل خط سے افسانے کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ برسوں سے اپنے محبوب سونُو، جو اسکا خاوند بھی ہو سکتا ہے، کی آمد کا اس کی گزشتہ تلخ و شیریں یادوں کے ساتھ بڑی بے صبری کے ساتھ انتظار کر رہی ہے۔ وہ جرمنی میں جدید ٹیکنولوجی حاصل کر کے اپنے ہی ملک کے استفادہ کرنے کے عظیم مقصد سے گیا ہوا ہے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب وہ اپنے ملک کراچی بازگشت کرتا ہے، تب اس کا خیر مقدم ایک گمنام گولی کرتی ہے اور سارا کھیل ہی تمام ہو جاتا ہے۔ ہندی فلم 'حقیقت' کے ایک مکالمے کے بموجب 'آخر وہ گولی آ گئی جس پر میرا نام لکھا تھا۔'' مقامی بے حس لوگ تو اس سونُو کے بیش قیمت سامان کا باہم بٹوارہ کرنے میں مصروف تھے۔ جب کہ اس کے دوست کے ہاتھ فقط اس کی بیوی روشن کا ایک خط ہی لگ پاتا ہے۔ اسی خط کی سطور سے یہ افسانہ 'فلیش بیک' کی ہیئت میں رقم کیا گیا ہے۔ واقعات اتنے کربناک انداز میں تحریر کیئے گئے ہیں کہ قاری ان کے بیان کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ کیا روشن کو اس کی تمام تر دعاؤں کا یہی ثمر ملنا اسکے نصیب میں لکھا تھا؟ خدا پرستی پر اسی طرح سے سوالیہ نشان لگتے رہے ہیں۔ بقول عقیل نعمانی کے شعر کے۔ ''میں مانتا نہیں کہ خدا ظالموں کا ہے / حالانکہ بے شمار دلایل ہیں سامنے۔''

کینیڈا کی بلند پایہ و مایۂ ناز ادیبہ شہناز خانم عابدی کے افسانے 'نگہداریٔ ناموس' اپنے موضوع کے حوالے سے ایک عمدہ افسانہ گردانا جانا چاہیے۔

عارف نقوی صاحب کے افسانے زیرِ عنوان 'خودکشی' میں یہی ثابت کرنا مقصود رہا ہے کہ عشق کبھی کسی مذہب، ملت، نسل وغیرہ تک محدود نہیں ہوتا ہے، اس افسانے میں مستعمل لفظ 'گروین' (صفحہ 65,66) کی بجائے 'اس کا املا 'گروی' ہی درکار تھا۔ ہندی لفظ 'کھنڈر' کی جمع اردو کے قوایٔد کے بموجب 'کھنڈرات' بنانا تو صدفی صد واجب قایٔدۂ زبان ہے، لیکن اس کا املا 'کھنڈرات' ہونا چاہیئے، نہ کہ 'کھنڈھرات'۔

بلراج بخشی کا افسانہ 'فیصلہ' بھی ایک عمدہ تخلیق ہے۔ برسوں بعد ایسا فنی اعتبار سے مکمل اور لایق مدح افسانہ زیرِ مطالعہ ہوا ہے۔ اس میں قاری کی ہمدردی کا ملاّ جنگلی مرغ کے ساتھ ہی رہتی ہے نہ کہ اسے گرفت میں لینے کے لیے کوشاں اشخاص کی جانب۔ ایسا لگتا ہے گویا جج مظفر علی رانا صاحب نے کسی یکسر بے قصور مجرم کو، تمام گواہیوں کے برعکس ہونے کے باوصف، اسے رہا کر کے چین کی سانس لی ہو۔ پلیٹو کی زبان میں اسے 'پوئٹک جسٹس' (Poetic Justice) کا بھی نام دیا جا سکتا ہے، گویا یہ ان کا ذاتی نہیں، بلکہ گویا کوئی الٰہی بموجب عنوان 'فیصلہ' ہی ہوا ہو!۔

جمیل عثمان کے جاندار افسانے 'آخری چارہ' میں شائد خدا کے پاس بھی تمام مسائل کا یہی 'آخری چارہ' رہ گیا تھا۔ یوں یہ انجام فلمی انداز کا ہونے پر بھی روح فرسا نہ ہو کر تسلی و سکون بخش ہی ثابت ہوتا ہے۔ یہی نصب العین اس افسانے کی شریانوں میں سے ہو کر اخذ ہوتا ہے اور فنی اعتبار سے عمدہ کہا جا سکتا ہے۔

**کرشن بھاؤک (پٹیالہ، بھارت)**

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''چہارسو'' باقاعدگی سے مل رہا ہے اس عنایت کے لیے نہایت ممنون ہوں۔ آپ جن شخصیات پر ''نمبر'' شائع کرتے ہیں وہ سبھی ادبی شخصیات باکمال ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا شائع کردہ نمبر ہی صحیح معنوں میں ''نمبر'' ہوتا ہے کیونکہ ہمارے اِدھر تو زیادہ تر ادبی رسائل موٹی رقم لے کر ہی گوشے یا نمبر شائع کرتے ہیں۔ رقم جتنی زیادہ ہوگی اُسی حساب سے گوشہ یا نمبر شائع کیا جائیگا۔ ادبی دنیا میں آپ کا قد کتنا ہے یہ چیز کوئی خاص معنی نہیں رکھتی۔ اس لیے میں آپ کے شائع کردہ نمبرز کو صحیح معنوں میں ''ادبی نمبر'' سمجھتا ہوں اور آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ ادبی دنیا کی مستحق شخصیات پر ایماندارانہ طریقے سے نہایت جانفشانی کے ساتھ نمبر شائع کرتے ہیں۔

میں چہارسو کی قریب قریب سبھی تخلیقات پڑھتا ہوں۔ محترمہ شائستہ فاخری، محترم مرزا مرتضیٰ بیگ برلاس، محترم سلام بن رزاق پر نمبر خوب رہے۔ سبھی نمبر دستاویزی حیثیت کے حامل ہیں۔

موجودہ شمارہ میں محترم سید سعید نقوی پر نمبر بھی بہت خوب ہے۔ ان کا افسانہ ''پتلی تماشا'' نے نہایت متاثر کیا۔ مصنف کا اندازِ بیاں متاثر کن ہے۔ اس شمارے میں شامل ڈاکٹر رینو بہل کا افسانہ ''قیدی نمبر ۲۳۴'' بہت پسند آیا۔ کافی محنت سے لکھا گیا ہے۔ آپ کی تخلیق ''تیسرا محلّہ'' بھی ذہن کو جھنجھوڑتی ہے۔ زمانے پہ گہرا طنز ہے۔ ''ناشکرے''، ''فرار''، ''جلتی ہریائی''، ''اداس رنگوں کی بارش'' اچھے افسانے ہیں۔ ''چند سیپیاں سمندروں سے'' محترمہ پروین شیر کا سفر نامہ بہت خوب ہے۔ جنوبی افریقہ کے متعلق کافی جانکاری ملتی ہے۔ جناب یوگیندر بہل تشنہ کی نظمیں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ اُن کا شعری مجموعہ بھی پڑھنے کا موقع ملا۔ ''ایک صدی کا قصّہ'' کے تحت محترم دیپک کنول متعلقہ فنکار کے بارے میں مفصل جانکاری فراہم کرتے ہیں۔ میں اُن کی تمام تحریریں نہایت ذوق وشوق سے پڑھتا ہوں۔ اللہ کرے آپ اسی طرح ادب کی بے لوث خدمت کرتے رہیں۔ آمین

**ایم انوار انجم** (مالیر کوٹلہ، بھارت)

برادرم گلزار جاوید جی، سلام مسنون۔

چہارسُو کا تازہ شمارہ بمشکل اب اپنی بے ڈھنگی مصروفیات سے کچھ فارغ ہو کر پڑھا تو جی چاہا ہے کہ جناب یونس جاوید پر (جنہیں اگر ڈاکٹر لکھوں تو ان کی اوریجنل شخصیت میرے خیال میں ڈاکٹری کے رعب کے پیچھے چھپ جاتی ہے!) جس عمدہ انداز میں قرطاسِ اعزاز ترتیب دی گئی ہے اس کی داد تو دے ہی دوں۔ اتنی بڑی شخصیت پر، جسے کثیر الابعاد یا کثیر الجہات جیسی ثقیل تراکیبِ لفظی میں بھی قید نہیں کیا جا سکتا، آپ نے جو مضامین اور تحریریں جمع کی ہیں وہ تو خیر لاجواب ہیں ہی، مگر داد دیتا ہوں آپ کے اس انٹرویو کی جس میں آپ نے بڑے ٹیڑھے سوال بھی کئے اور جناب یونس جاوید نے ان کا جواب بھی انتہائی خندہ پیشانی سے دیا۔ آپ کا یہ انٹرویو مجھے دو افسانہ نگاروں کے درمیان مکالمہ محسوس ہوا جسے پڑھ کر مجھے بہت کچھ حاصل ہوا، کہ ''دیکھیں اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا''۔ اُن کی شخصیت وفن پر دیگر بہت سی تحریریں بھی میں نے دلچسپی سے پڑھیں کہ جو مصنف اور ڈرامہ نگار میرا پسندیدہ ہے اس پر اتنی اچھی اچھی تحریریں یکجا ہو کر پہلی مرتبہ میرے سامنے آئی تھیں۔

ایک اور بہت اچھے افسانے کی تعریف کرنا مجھ پر فرض ٹھہرا، جناب جمیل عثمان نے ''آخری چارہ'' کے عنوان سے ایک حیرت انگیز افسانہ لکھا ہے۔ کسی حد تک ڈرامائی انداز کا یہ افسانہ ان کے پہلے لکھے ہوئے افسانوں سے یکسر مختلف محسوس ہوا۔ جمیل عثمان کئی سال تک سعودی عرب میں رہے اور مجھے یاد آیا کہ ان کے افسانوں کے مجموعے ''جلا وطن کہانیاں'' کی تقریبِ رونمائی بھی ہماری ادبی تنظیم نے کرائی تھی اور اس پر مَیں نے بھی ایک مضمون لکھا تھا۔

چند بہت اچھے شعر پچھلے شمارے کے دہرائے بغیر خط ختم کرنا ناانصافی ہوگا۔

دھند حائل ہو گئی پہچان میں
جب اجالا تیرگی میں حل ہوا

غالب عرفان

کہیں دم لینے کو ٹھہروں تو کسی سے پوچھوں
میرے ہی قدموں سے لپٹی ہوئی گردش کیوں ہے

عارف منصور

تم ملو گے تو بتا دیں گے تمہیں رازِ بہار
دس برس بعد بھی ہم ویسے کے ویسے کیوں ہیں

اعتبار ساجد

سفر شب کا ہوا ہے خوف والا
کھڑی ہے خالی خالی ہرسوزوکی

آصف ثاقب

افسوس کہ اس شمارے میں شامل دو بہت اچھے ادیب اور دوست جناب عارف منصور اور زہیر کنجاہی اب اِس دنیا میں نہیں۔ زہیر کنجاہی سے ملاقاتیں بہت کم ہوتی تھیں مگر تقریباً ہر ادبی جریدے میں ان سے کسی نہ کسی حوالے سے رابطہ رہتا تھا۔ جناب عارف منصور ابھی چند ماہ قبل لاہور سے راولپنڈی تشریف لائے تو اسی دن میرے نعتیہ مجموعے ''نعت نگینے'' کی تقریبِ رونمائی منعقد ہو رہی تھی جس میں مَیں نے انہیں مدعو کیا اور وہ تشریف لائے تو انہیں اس محفل کا مہمانِ خصوصی بنایا گیا تھا۔ کسے خبر تھی کہ ان سے ہماری یہ آخری ملاقات ہے! اللہ ان دونوں مرحومین کو جوارِ رحمت میں مقام عطا فرمائے۔

**نسیم سحر** (راولپنڈی)

☆

## ......غالب عرفان اور تخلیقی وجدان ......

نہ جانے یہ کس مفکر کا قول ہے کہ یہ دنیا محض اتفاقات سے وجود میں آئی اور اس کے اختتام تک محض اتفاقات پر ہی اس کا سفر جاری رہے گا، کوئی اتفاق اگر حسنِ اتفاق میں بدل جائے تو آدمی ذرّے سے آفتاب بھی بن جاتا ہے۔ بطور مسلمان اگر چہ میں اس دلیل کو نہیں مانتا لیکن اس حسنِ اتفاق کو کیا نام دوں جب مجھ سے محبت کرنے والے میرے نادیدہ ہمدم و دمساز محترم سید مسعود اعجاز بخاری سے شناسائی میرے ایک اور نادیدہ دوست مشہور افسانہ نگار محمد الیاس کے ذریعے صرف میری جواں سال بیٹی کی جواں مرگی کے سبب ایک بہانہ بن گئی۔ ۲۰۔اگست ۱۹۹۳ء کو ثمینہ غالب مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی تو مرحوم شبنم رومانی نے سہہ ماہی ''اقدار'' (کراچی) میں دعائے مغفرت کی صورت یہ خبر شائع کی۔ خبر محمد الیاس (جو اُن دنوں میر پور آزاد کشمیر میں مقیم تھے) تک پہنچی تو ان کے ذریعے بخاری صاحب نے سنی اور مجھ کو ہمدردی اور غم گساری کا خط لکھتے ہوئے یہ بھی اطلاع دی کہ وہ میری شاعری کے ذریعے مجھے پہلے سے جانتے ہیں بس وہ دن اور آج کا دن ان کی نگاہِ باریک بیں نے میری شاعری کے ذریعے مجھے پہچانا۔ ان بیس برسوں کے دوران، پہلے مراسلت اور پھر موبائل کے ذریعے شناسائی دوستی میں تبدیل ہوئی پھر ایک انسان میں چھپے ہوئے جوہر کو بخاری صاحب نے ایک کتاب کا روپ دیا جو آج آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

......غالب عرفان

اشاعت: ۲۰۱۵ء، قیمت: ۴۰۰ روپے، دستیابی: الحمد پبلی کیشنز، کراچی۔

## ...... آدم اور خدا ......

امین الدین کے افسانوں کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ بیانیے پر یقین رکھنے کے باوجود نرے سادہ بیانیے سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی بھی کہانی جب ان کے بطون میں راہ پاتی ہے تو فوراً کاغذ پر منتقل نہیں ہو جاتی، بلکہ پہلے وہ اپنے تخلیقی اپچ سے کسی بھی واقعے کے گرد ایک دائرہ بنا کر اس کی حد بندی کرتے ہیں، اپنی فن کاری سے کردار میں رنگ بھرتے ہیں، پیش منظر اور پس منظر کی مدد سے واقعے میں کشمکش پیدا کرتے ہوئے اسے قدرے پیچیدہ بناتے ہیں اور پھر زبان کے استعاراتی نظام کے سہارے سماج میں بکھرے ہزاروں واقعات میں سے چنے ہوئے اس واقع پر اپنے رنگ برنگی پینٹ کی ہوئی شکلوں کے نقوش اُبھارتے ہیں۔ یعنی امین الدین افسانے کو کیمرے سے کھینچی ہوئی تصویر سے زیادہ مصور کی بنائی ہوئی پینٹنگ کے درجے پر لے جاتے ہیں۔

......سلمان صدیقی

اشاعت: ۲۰۱۵ء، قیمت: ۲۰۰ روپے، دستیابی: دراک (ادبی نشست) کراچی۔

## ...... سیماب ......

دنیا میں ظہور پذیر ہونے والے کارہائے نمایاں کبھی بھی بلند قامتی کے محتاج نہیں رہے جس کی ایک مثال اس وقت ہمارے روبرو قریب پانچ سو صفحات پر مشتمل گورنمنٹ ڈگری کالج بوائز، میر پور آزاد کشمیر کا سالانہ مجلّہ ''سیماب'' پیشِ نظر ہے۔ دیدہ زیب طباعت، نفیس کاغذ اور قیمتی جلد کے ساتھ پیشکش کا معیار بھی انتہائی اعلیٰ ہے۔ ہر چند اس طرح کے مجلّے ادارے کے طلبہ کی قلمی صلاحیتوں کے اجاگر کرنے کے لیے اشاعت پذیر ہوتے ہیں مگر کالج کے پرنسپل اور سیماب کے مدیرِ اعلیٰ پروفیسر غازی علم الدین صاحب نے اردو اور انگریزی ادب کے ہر فکر، مزاج اور معیار کی تخلیقات کو شاملِ اشاعت کر کے ''سیماب'' کی اس خاص اشاعت کو اُس بلند مقام پر پہنچا دیا ہے جسے دیکھ کر آپ کی طبیعت باغ باغ ہو جائے گی۔

......صاعقہ انعام

اشاعت: ۲۰۱۵ء، قیمت: ؟؟؟، دستیابی: گورنمنٹ ڈگری کالج (بوائز)، میر پور آزاد کشمیر۔

Photography: Labib
Presentation: Col Abdul Kabir